زیر نظر

اُستاد محقّق آیت اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۴

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حُسین نجفی رح

زیر سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمٰی الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ



فہرست مضامین















۷۱۔ يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ اَوِانْفِرُوا جَمِيعًا ○

ترجمہ

۷۱۔ اے ایمان والو (دشمن کے مقابلے میں) اپنی آمادگی کی حفاظت کرو اور متعدد دستوں میں یا اجتماعی دستہ کی صورت میں (موجود حالات کے مطابق) دشمن کی طرف پیش قدمی کرو۔

تفسیر

"حذر" بروزن "خضر" بیداری تیار رہنے اور خطرے کے مقابلے میں چوکس اور مستعد رہنے کے معنی میں ہے۔ بعض اوقات یہ لفظ اس وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں بھی آتا ہے جس کی مدد سے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔ "ثبات" "ثبہ (بروزن گنہ) کی جمع ہے۔ غیر منظم اور منتشر دستوں کے معنی میں آیا ہے۔ قرآن مجید مندرجہ بالا آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھیں اپنے اجتماع اور وجود کے تحفظ کے لیے دو احکام و ہدایات دیتا ہے۔ پہلے کہتا ہے اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، بڑی باریک بینی سے دشمنوں اور ان کے جاسوسوں پر نظر رکھے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی طرف سے غافل ہو کر کسی خطرے سے دوچار ہو جاؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا خذوا حذرکم) اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے مختلف طریقوں اور تکنیکوں (TECHNIQUES) سے استفادہ کرو اور متعدد دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر دشمن کو زیر کرنے نکل پڑو (فانفروا ثبات او انفروا جمیعًا) جہاں مختلف دستوں اور بکھری ہوئی ٹولیوں کی صورت میں حرکت کرنا ضروری ہو وہاں اسی طریقے سے آگے بڑھو اور جہاں یہ امر لازمی ہو کہ سب ایک متحد لشکر کی صورت میں دشمن کے مقابلے پر نکلیں، وہاں اجتماعیت سے غفلت نہ برتو ـــــــ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں "حذر" کی تفسیر صرف اسلحہ کے معنی میں کی ہے حالانکہ حذر کے وسیع معنی ہیں اور اس کا مفہوم اسلحہ تک محدود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں خود اسی سورہ کی آیہ ۱۰۲ میں واضح دلیل موجود ہے جہاں حذر اسلحہ سے مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں خدا فرماتا ہے

ان تضعوا اسلحتکم وخذوا حذرکم

کوئی حرج نہیں کہ ضرورت کے وقت نماز کے موقع پر میدان جنگ میں اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دو۔ لیکن حذر یعنی نگرانی اور آمادگی پر مستعد رہو۔

یہ آیت جامع ہے اور اپنے اندر تمام پہلو لیے ہوئے ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے اس میں ہر عہد اور ہر دور کے مطابق حکم موجود ہے



کہ اپنی امنیت کی حفاظت اور اپنی سرحدوں کے دفاع کے لیے ہمیشہ مستعد رہو۔ اور ایک قسم کی مادی و معنوی آمادگی ہمیشہ تمھاری جمعیت پر غالب وحاکم رہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ "حذر" کا معنی اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کے مادی روحانی اور معنوی وسیلہ اور ذریعہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہر وقت اور ہر زمانے میں دشمن کی حیثیت، اس کے ہتھیاروں کی نوعیت اور جنگی طور طریقوں سے باخبر ہوں اور اپنی تیاری کے معیار کے ساتھ ساتھ دشمن کے اسلحہ کی تعداد اور کارکردگی کو جانتے ہوں۔ کیونکہ یہ تمام مذکورہ باتیں دشمن کی طرف سے خطرہ کی پیش بندی اور "حذر" کے مفہوم کو سمجھنے میں مؤثر ہیں۔

دوسری طرف اپنے دفاع کے لیے ہر طرح کی مادی و روحانی تیاری ناگزیر ہے۔ یہ تیاری تعلیمی، اقتصادی اور افرادی قوت کی فراہمی کے حوالے سے بھی مکمل ہونا چاہیے۔ اسی طرح جدید اسلحہ کی فراہمی اور اس کے استعمال کے طور طریقوں سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ مسلمانوں نے اگر صرف اسی ایک آیت کو اپنی زندگی پر منطبق کرلیا ہوتا تو اپنی تمام تاریخ میں کبھی شکست اور ناکامی کا منہ نہ دیکھتے۔ جیسا کہ اوپر والی آیت میں اشارہ ہے کہ جنگ کے مختلف طور طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے کبھی جمود اور دقیانوسیت کا شکار نہ ہونا، بلکہ وقت اور مقام کے تقاضوں اور دشمن کی حیثیت دیکھتے ہوئے قدم اٹھانا چاہیے۔ جہاں دشمن کی حالت اس قسم کی ہے کہ وہاں مختلف دستوں کی صورت میں اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے تو اس طریقے سے استفادہ کرو اور دشمن کے مقابلہ میں ہر دستہ کی مخصوص حکمت عملی ہو اور جہاں ضرورت ہو کر سب منظم ہو کر ایک حکمت عملی کے مطابق حملہ کریں تو وہاں ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بعض افراد جو اصرار کرتے ہیں کہ اپنی اجتماعی جنگوں میں سب مسلمان ایک ہی طریقہ کو اپنائیں اور ان کی تکنیکوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہیے، ان کا موقف درست نہیں، ویسے بھی یہ بات منطق اور تجربے کے خلاف ہے اور اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے اور شاید اوپر والی آیت اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتی ہو۔ حقیقی مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے یہ ایک اہم کلیہ ہے۔

ضمنی طور پر "جمیعًا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے تمام مسلمان بغیر کسی استثناء کے شرکت کریں اور یہ حکم کسی معین دستے سے مخصوص نہیں ہے۔

۷۲۔ وَاِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ‌ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا ○

۷۳۔ وَلَـئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ تَكُنۡۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيۡتَنِىۡ كُنۡتُ مَعَهُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ○



ترجمہ

۷۲۔ تمھارے درمیان کچھ (منافق) لوگ ہیں کہ وہ خود بھی کاہل ہیں اور دوسروں کو بھی سست بناتے ہیں اگر کوئی مصیبت آ پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم پر احسان کیا کہ ہم مجاہدین کے ساتھ نہیں تھے کہ ہم (اس مصیبت) کو دیکھتے۔

۷۳۔ اگر کوئی مالِ غنیمت تمھیں مل جائے تو ٹھیک، حالانکہ تم میں اور ان میں کوئی مودت و دوستی نہیں، پھر بھی وہ بالکل اس طرح سے کہتے ہیں، کاش! ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے اور نجات اور عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔

تفسیر

دشمن کے مقابلہ میں جہاد اور تیاری کے عمومی حکم کے بعد کہ جو گذشتہ آیت میں بیان ہوا ہے اس آیت میں منافقین کی ایک جماعت کی حالت بتاتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: یہ دو چہروں والے افراد جو تمھارے درمیان ہیں پوری کوشش کرتے ہیں کہ حق کی راہ میں لڑنے والوں کی صفوں میں شریک ہونے سے بچ جائیں۔

(وان منکم[1] لمن لیبطئن[2])

لیکن جب مجاہدین میدان جنگ سے واپس آتے ہیں یا میدان جنگ کی خبریں انھیں ملتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کو شکست یا شہادت نصیب ہوئی ہو تو وہ مسرت وانبساط سے کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں کتنی بڑی نعمت دی ہے، ہم یہ دلخراش منظر دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ نہیں تھے۔

فان اصابتکم مصیبۃ قال قد انعم اللہ علی اذ لم اکن معھم شھیداً۔

لیکن اگر انھیں یہ خبر ملے کہ حقیقی مومنین کامیاب ہو گئے ہیں اور نتیجے میں مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا ہے تو یہ پکے بیگانوں کی طرح حسرت و یاس سے کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی مجاہدین کے ساتھ ہوتے اور ہمیں بھی بڑا حصہ (مال غنیمت کا) ملتا۔ جیسے مومنین سے تو ان کا کوئی ربط ہی نہ ہو۔

---

[1] یہ بات توجہ طلب ہے کہ اوپر والی آیت میں خطاب مومنین سے ہے لیکن بات منافقین سے کہی جا رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ "منکم" کی تعبیر کے ساتھ انھیں مومنین کا جزو شمار کیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ منافقین ہمیشہ مومنین کے درمیان ہی رہتے تھے اور ظاہرا انھی میں شمار ہوتے تھے۔

[2] لیبطئن مادہ بطئو (بروزن قطب) چلنے میں کاھلی اور سستی کے معنی میں ہے اور اہل لغت اور مفسرین کی ایک جماعت کے بقول لازم اور متعدی دونوں معنی رکھتا ہے یعنی چلنے میں بھی کاہل اور سست ہیں اور دوسروں کو بھی اس کام میں شریک کرتے ہیں شاید اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ باب تفصیل میں ہے لہذا صرف متعدی والا معنی رکھتا ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی اپنے آپ کو اور کبھی دوسروں کو کاہلی اور سستی پر ابھارتا ہے۔



ولئن اصابکم فضل من اللہ لیقولن کان لم تکن بینکم وبینہ مودۃ
یالیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں مالِ غنیمت کا ذکر نہیں ہوا، لیکن واضح ہے کہ جو راہ خدا میں شہادت کو ایک بلا اور مصیبت تصور کرتا ہے اور شہادت کا شعور نہ رکھنے کو خدا کی نعمت تصور کرتا ہے، اس کے نزدیک صرف مادی اور جنگی غنائم کا حصول عظیم کامیابی اور فتح ہے۔ یہ دو رخے افراد جن کے متعلق افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہر معاشرے میں تھے اور ہیں، وہ حقیقی مومنین کی کامیابیوں اور شکستوں سے اپنے قیافے فوراً بدل لیتے ہیں۔ غم و آلام میں کبھی ان کا ساتھ نہیں دیتے مصیبت اور مشکل میں ان کے ہم قدم نہیں ہوتے لیکن اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی صورت میں انھیں (مال غنیمت) جیسے اور حقیقی مومنین جیسے امتیازات انھیں حاصل ہوں۔

۷۴۔ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۷۴۔ وہ لوگ جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچ دی ہے انھیں چاہیے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص راہ خدا میں جنگ کرے اور قتل ہو جائے یا غالب آجائے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔

تفسیر

مومنین کو جہاد کے لیے آمادہ کرنا

گذشتہ آیات میں منافقین کو مومنین کی صفوں سے جدا کر کے دکھایا گیا ہے اس آیت میں اور اس کے بعد آنے والی چند آیات میں صاحب ایمان افراد کو اثر انگیز دلائل کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ یہ آیات ایک ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہیں جب طرح طرح کے اندرونی اور بیرونی دشمن اہل اسلام کو ڈرا دھمکا رہے تھے ایسے میں ان آیات کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جن میں مسلمانوں کی روحِ جہاد کو ابھارا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں خدا فرماتا ہے: راہِ خدا میں وہ افراد جنگ کریں جو دنیا کی پست مادی زندگی کا دوسرے جہان کی ابدی اور جاوداں زندگی سے تبادلہ کرنے کو تیار ہیں۔

(فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشرون الحیوۃ الدنیا بالآخرۃ)

یعنی صرف وہ لوگ حقیقی مجاہدین کہلا سکتے ہیں جو اس بات کے لیے آمادہ ہوں اور انھوں نے بجا طور پر یہ جان لیا ہو کہ مادی دنیا کی



زندگی جیسا کہ لفظ دنیا (یعنی پست تر) سے ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لیے باعزت موت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن جو لوگ مادی زندگی کو گراں بہا اور خدائی و انسانی مقدس اہداف و مقاصد سے بالاتر سمجھتے ہیں وہ کبھی اچھے مجاہد نہیں ہوسکتے۔ اس کے بعد آیت کے ذیل میں فرماتا ہے: "ایسے مجاہدین کا انجام واضح ہے کیونکہ وہ شہید ہوجائیں گے یا دشمن کو تباہ کر دینگے اور ان پر غالب آجائیں گے اور دونوں صورتوں میں ہم انھیں اجرِ عظیم دیں گے"۔

(ومن یقاتل فی سبیل اللّٰہ فیقتل او یغلب فسوف نؤتیہ اجرًا عظیمًا)

یہ مسلّم ہے کہ ایسے جانبازوں کی لغت میں شکست کا وجود نہیں ہے وہ دونوں صورتوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں یہی ایک جذبہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ دشمن ان کے لیے کامیابی کے وسائل فراہم کرے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے دشمنوں پر بھی سے غلبہ حاصل ہوا جو تعداد، سازوسامان اور جنگی تیاریوں کے لحاظ سے ان کے مقابلے میں کئی گنا بالادستی رکھتے تھے۔ اس کا محرک یہی ناقابلِ شکست جذبہ تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلم علماء جنھوں نے رسول اللہؐ کے زمانے اور آپؐ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی تیز رفتار کامیابیوں پر بحث کی ہے انھوں نے بھی اس جذبے کو ان کی پیش رفت کا محرک قرار دیا ہے۔

مغرب کا ایک مشہور مورخ رقمطراز ہے[1]

"نئے مذہب کی برکت اور جن انعامات کا آخرت میں وعدہ کیا گیا تھا، ان کی وجہ سے وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے اور دوسرے جہان کو دیکھ کر اس زندگی کی ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی، لہٰذا وہ اِس زندگی سے محبت کرنے سے اجتناب کرتے تھے"۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح اس جہاد کو مقدس قرار دیا گیا ہے جو "فی سبیل اللہ" یعنی خدا کی راہ میں ہو، بندگانِ خدا کی نجات کا ذریعہ ہو، اصولِ حق و انصاف کی خاطر ہو اور پاکیزگی و تقویٰ کے لیے ہو، نہ کہ وہ جنگیں جو توسیع پسندی، تعصب اور استعماری و سامراجی مقاصد کے لیے لڑی جائیں۔

۷۵۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَ
النِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ
الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ
نَصِيرًا ۝

ترجمہ

۷۵۔ کیوں تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے کہ (جو ستمگروں کے ہاتھوں) کمزور کر دیے گئے

[1] تاریخ تمدن اسلام و عرب ——— گوستاولبون صفحہ ۱۵۵



ہیں جنگ نہیں کرتے وہ (ستم زدہ) افراد جو کہتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس شہر (مکہ) سے نکال لے جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے ایک سرپرست بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی یاور و مددگار بھیج۔

تفسیر

انسانی جذبوں کو مظلوموں کی مدد کے لیے ابھارا گیا ہے

گذشتہ آیت میں مومنین کو جہاد کی دعوت دی گئی ہے لیکن خدا و قیامت پر ایمان اور سود و زیاں کے استدلال کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس آیت میں انسانی جذبات و احساسات کی بنیاد پر جہاد کی طرف دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے: کیوں تم راہِ خدا میں اور مظلوم و بیکس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جو ستم گروں کے چنگل میں گرفتار ہیں جنگ نہیں کرتے کیا تمھارے انسانی جذبات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ خاموش بیٹھے رہو اور ان رقت انگیز مناظر کو دیکھتے رہو۔

(ومالكم لا تقاتلون فى سبيل الله و المستضعفين[1] من الرجال و النساء و الولدان)

اس کے بعد مومنین کے احساسات کو ولولہ انگیز بنانے کے لیے کہتا ہے: یہ مستضعفین وہی لوگ ہیں جو گھٹے ہوئے ماحول میں گرفتار ہو چکے ہیں اور ہر جگہ سے ناامید ہو گئے ہیں لہٰذا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ظلم و ستم کے ماحول سے انھیں نجات دے۔

(الذين يقولون ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم اهلها)

نیز اپنے خدا سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ ایک ولی و سرپرست ان کی حمایت کے لیے بھیج دے (واجعل لنا من لدنك وليا) اور کہتے ہیں: ہمارے لیے کوئی یاور و مددگار بھیج (واجعل لنا من لدنك نصيرا)

حقیقت میں اوپر والی آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا ہے اور اس عظیم انسانی پیغامِ رسالت کو تمھارے ذمہ قرار دیا ہے اور تم خدا کی طرف سے "ولی و نصیر" ہو جو ان کی حمایت اور نجات کے لیے معین کیے گئے ہو۔ لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس اس موقع اور اعلیٰ حیثیت کو اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھو۔

چند اہم نکات

۱۔ اسلامی جہاد کے دو ہدف

جہاد اسلامی جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے، مال و متال، مقام و مرتبہ، طبعی وسائل اور دوسرے ممالک کے خام مال پر قبضہ کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی منڈیاں تلاش کرنے یا عقیدہ اور سیاست ٹھونسنے کے لیے ہے بلکہ صرف اصولِ فضیلت و ایمان کی نشر و اشاعت اور محکوم، ستم رسیدہ مردوں، عورتوں اور محروم و مظلوم بچوں کے دفاع کے لیے ہے۔ اس طرح جہاد کے دو جامع ہدف

---

[1] مستضعف اور ضعیف میں واضح فرق ہے ضعیف وہ ہے جو ناتمام ہو اور مستضعف وہ ہے جو دوسروں کے ظلم و ستم کے باعث کمزور ہو گیا ہو چاہے یہ کمزوری فکری اور ثقافتی اعتبار سے ہو یا اخلاقی نقطہ نظر سے یا اقتصادی حوالے سے اور یا سیاسی اور اجتماعی نقطہ نظر سے اس طرح یہ ایک جامع تعبیر ہے کہ جو ہر طرح کے استعمار زدہ اور ستم رسیدہ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔



اور مقاصد ہیں جن کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے ایک "خدائی ہدف" اور دوسرا "انسانی ہدف" اور یہ دونوں حقیقت میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور ان کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۲۔ معاشرے میں آزادیٔ فکر و نظر

اسلام کی نگاہ میں وہ معاشرہ اور ماحول زندگی بسر کرنے کے قابل ہے جس میں آزادانہ اپنے صحیح عقیدے کے مطابق عمل کیا جا سکے۔ باقی رہا وہ ماحول یا معاشرہ جس میں گلا گھونٹ دیا جائے اور یہاں تک کہ انسان اتنا آزاد بھی نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکے، اس میں زندگی نہیں گذاری جا سکتی۔ جہاں صاحبِ ایمان افراد یہ آرزو کرتے ہوں کہ وہ ایسے ماحول سے باہر چلے جائیں کیونکہ ایسے ماحول میں صرف ستمگروں کی بالادستی ہوتی ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ "مکہ" نہایت مقدس شہر اور مہاجرین کا اصل وطن تھا اس کے باوجود اس کی پر آشوب اور گھٹن زدہ کیفیت اس بات کا سبب بنی کہ وہ خدا سے درخواست کریں کہ وہ وہاں سے باہر نکل جائیں۔

۳۔ یاور سے پہلے رہبر

مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ وہ مسلمان جو دشمن کے چنگل میں گرفتار تھے انھوں نے پہلے تو اپنی نجات کے لیے خدا کی طرف سے ولی بھیجے جانے کا تقاضا کیا اور پھر ظالموں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نصیر اور مددگار کی آرزو کی۔ کیونکہ ہر چیز سے پہلے قابل اور دردمند "رہبر" اور سرپرست کا وجود ضروری ہے اور اس کے بعد یاور و مددگار کی اور کافی تعداد میں افراد کی ضرورت ہے لہٰذا یہ یاور و مددگار جتنے بھی ہوں ایک صحیح رہبر کے بغیر بے سود ہیں۔

۴۔ بارگاہِ الٰہی میں دستِ نیاز

صاحبِ ایمان افراد ہر چیز خدا سے چاہتے ہیں اور وہ دستِ نیاز اس کے علاوہ کسی کے آگے دراز نہیں کرتے، یہاں تک کہ اگر وہ ولی و مددگار کا تقاضا کریں تب بھی اسی سے (مدد) چاہتے ہیں۔

۷۶۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

ترجمہ

۷۶۔ جو صاحبِ ایمان ہیں وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت (اور فسادی لوگوں) کی راہ میں



لڑتے ہیں لہٰذا تم ان شیطان کے دوستوں سے جنگ کرو (اور ان سے ڈرو نہیں) کیونکہ شیطان کا مکر و فریب (اس کی طاقت کی طرح) ضعیف و کمزور ہے۔

تفسیر

پھر اس آیت میں مجاہدین کو شجاعت پر ابھارا گیا ہے اور انھیں دشمن کے ساتھ مبارزہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔
اس کے علاوہ مجاہدین کی صفوں اور اہداف و مقاصد کو مشخص و ممتاز کرنے کے لیے اس طرح فرماتا ہے:

صاحب ایمان افراد خدا کی راہ میں اور اس کے لیے جو خدا کے بندوں کے لیے سودمند ہے جنگ کرتے ہیں لیکن بے ایمان افراد طاغوت یعنی تباہ کرنے والی طاقتوں کی راہ میں (جنگ کرتے ہیں)

(الذین اٰمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ و الذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت)

یعنی بہر حال ان کی زندگی کے دن مبارزہ اور مقابلہ سے خالی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گروہ حق کی راہ میں اور دوسرا باطل اور شیطان کی راہ میں برسرِ پیکار ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے: شیطان کے ساتھیوں سے جنگ کرو اور ان سے ڈرو نہیں (فقاتلوا اولیاء الشیطٰن)۔

طاغوت، فسادی قوتیں اور ظالم طاقتیں ظاہرا جتنی بھی بڑی اور قوی نظر آئیں لیکن باطن میں زبوں حال اور ناتواں ہیں۔ ان کے ظاہری سازوسامان، تیاری اور آراستہ و پیراستہ ہونے سے نہ ڈرو کیونکہ ان کا باطن کھوکھلا ہے اور ان کے منصوبے اور سازشیں ان کی طاقت اور توانائی کی طرح ناقص و کمزور ہیں۔ کیونکہ خدائے لایزال کی قدرت پر ان کا تکیہ نہیں ہے بلکہ وہ شیطانی طاقتوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں (ان کید الشیطٰن کان ضعیفا) اس کمزوری اور ناتوانی کی دلیل واضح ہے کیونکہ ایک طرف صاحب ایمان افراد اہداف اور حقائق کی راہ میں قدم آگے بڑھاتے ہیں کہ جو قانونِ آفرینش سے ہم آہنگ اور ہم صدا ہیں اور ابدی و جاودانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں وہ انسانوں کو آزاد کرنے اور ظلم و ستم کے مظاہر کو ختم کرنے کے لیے برسرِ پیکار ہیں جبکہ طاغوت کے طرفدار استعماری اور لوٹ مار کرنے والی قوتیں ناپائیدار شہوات کی راہ میں چلنے والے جن کا اثر معاشرے کی تباہی اور قانونِ آفرینش کے برخلاف ہے سعی و کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف سے صاحب ایمان افراد روحانی قوتوں پر بھروسہ کرکے مطمئن ہیں کہ وہ ان کی کامیابی کے ضامن ہیں اور وہ انھیں قوت بخشیں گے۔ جبکہ بے ایمان لوگوں کا کوئی مستحکم سہارا نہیں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں طاغوت کا شیطان سے مکمل ربط بیان ہوا ہے کہ کس طرح طاغوت شیطان صفت مختلف طاقتوں سے مدد حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ خدا کہتا ہے کہ طاغوت کے ساتھی وہی شیطان کے دوست ہیں۔ سورۂ اعراف آیہ ۲۷ میں بھی یہی مضمون آیا ہے:

انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون

ہم نے شیاطین کو بے ایمان افراد کا سرپرست بنا دیا ہے۔



۷۷۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ
اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ
قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ○

ترجمہ

۷۷۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں (مکہ میں) کہا گیا کہ (وقتی طور پر) جہاد سے دستبردار ہو جاؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰة ادا کرو (مگر وہ اس حکم سے رنجیدہ اور غیر مطمئن تھے) لیکن جس وقت (مدینہ میں) انھیں جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرتا تھا جس طرح خدا سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہنے لگے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا ہے کیوں یہ حکم دینے میں تاخیر نہیں کی۔ ان سے کہہ دو زندگانیٔ دنیا کا سرمایہ ناچیز اور کم تر ہے اور جو پرہیزگار ہو اس کی آخرت بہتر ہے اور تم پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً عظیم مفسر طوسی مؤلف "تبیان" اور مؤلفین "تفسیر قرطبی" اور "المنار" ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جب مکہ میں مقیم تھی اور مشرکین کی طرف سے ان پر ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے اس جماعت کے افراد پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم قبولِ اسلام سے پہلے محترم اور معزز تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد ہماری حالت دگرگوں ہو گئی ہے اور ہم وہ عزت اور احترام کھو بیٹھے ہیں ہمیں دشمن نے اذیت اور مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم دشمنوں سے جنگ کریں تاکہ اپنا وقار اور مرتبہ دوبارہ بحال کر سکیں۔ اس روز پیغمبرؐ نے فرمایا ابھی مجھے جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن جب مسلمان مدینہ میں جا بسے اور مقابلے کے لیے زمین ہموار ہو گئی، جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان میں سے بعض جو پہلے لڑنے کے لیے تُلے بیٹھے تھے اب میدان جہاد میں جانے سے کترانے لگے اور اس دن کا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں میں جذبۂ شجاعت بیدار کرنے کیلئے اور جہاد سے گریز کرنے والے افراد کو ملامت کرتے ہوئے حقائق بیان کیے۔



تفسیر

وُہ جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں

قرآن یہاں کہتا ہے، اس گروہ کی حالت واقعاً تعجب خیز ہے جو ایک نامناسب موقع پر بڑی گرم جوشی اور شور وغوغا سے تقاضا کرتا تھا کہ انھیں جہاد کی اجازت دی جائے انھیں حکم دیا گیا کہ ابھی اپنی حفاظت اور تعمیر کا کام کریں، نماز پڑھیں اپنی تعداد بڑھائیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں لیکن جب ہر لحاظ سے فضا ہموار ہوگئی اور جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان پر خوف وہراس طاری ہوگیا اور وہ اس حکم کے سامنے زبانِ اعتراض دراز کرنے لگے۔

(الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ)

وہ اپنے اعتراض میں صراحت کے ساتھ کہتے تھے خدایا تو نے اتنا جلدی جہاد کا حکم نازل کر دیا کیا اچھا ہوتا اگر تو اس حکم کو تاخیر میں ڈال دیتا یا یہ پیغامِ رسالت آئندہ کی نسلوں کے ذمہ ڈال دیا جاتا[1]

(و قالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب)

قرآن اس قسم کے افراد کو دو طرح کے جواب دیتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ جو یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ کی عبارت کے دوران دیا جا چکا ہے۔ یعنی وہ لوگ بجائے اس کے کہ خدائے قادر و قاہر سے ڈریں کمزور اور ناتواں انسانوں سے خوف زدہ ہیں بلکہ وہ ان نحیف و ناتواں لوگوں سے خدا کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں دوسرا یہ کہ ایسے افراد سے کہا جائے کہ فرض کرو چند دن جہاد نہ کرنے کی وجہ سے آرام و سکون حاصل کر لوگے، پھر بھی یہ زندگی فانی اور بے قیمت ہے لیکن ابدی اور دائمی جہان تو پرہیزگار لوگوں کے لیے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ خصوصاً جب انھیں مکمل طور پر عوض اور اجر مل جائے گا اور معمولی سے معمولی ظلم بھی ان پر نہیں ہوگا.............

(قل متاع الدنیا قلیل و الاخرۃ خیر لمن اتقی و لا تظلمون فتیلا[2])

---

[1] بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت مہدیؑ کے قیام کے بارے میں کچھ باتیں سُن رکھی تھیں۔ لہٰذا ان میں سے بعض اس انتظار میں تھے کہ جہاد کا معاملہ قیام مہدیؑ کے زمانے سے مخصوص ہو جائے۔
(نور الثقلین جلد اول ص ۵۱۸)

[2] فتیل ایک باریک دھاگہ ہے جو کھجور کے دانے کے درمیان شگاف میں ہوتا ہے جس طرح کہ اس کی تفصیل تیسری جلد میں گزر چکی ہے۔



چند اہم نکات

۱۔ صرف نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ کیوں؟

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام احکامِ اسلام میں سے صرف نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیوں ہوا ہے حالانکہ احکامِ اسلامی انھی دو میں تو منحصر نہیں ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نماز خدا سے وابستہ ہونے اور زکوٰۃ مخلوقِ خدا سے رشتہ استوار کرنے کی رمز ہے۔ لہٰذا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا جائے کہ خدا سے محکم وابستگی اور بندگانِ خدا سے مضبوط رشتہ استوار کر کے اپنے جسم و جان اور اجتماع و معاشرے کو جہاد کے لیے آمادہ کریں۔ اصطلاح کے مطابق اپنی تربیت کریں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ کسی قسم کا جہاد افراد کی روحانی اور جسمانی آمادگی اور اجتماعی مستحکم رشتوں کے بغیر شکست سے ہمکنار ہو جائے گا۔ مسلمان نماز اور عبادت خدا کے سایے میں اپنے ایمان کو محکم اور اپنے روحانی جذبے کی پرورش کرتا ہے اور ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعے اجتماعی فاصلوں کو مٹاتا ہے۔ زکوٰۃ ہی کے ذریعے آزمودہ کار افراد اور جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کے لیے ایک اقتصادی معاونت کرتا ہے اور حکمِ جہاد کے صادر ہونے پر دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار ہو جاتا ہے۔

۲۔ مکّہ میں حکمِ زکوٰۃ

ہم جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کا قانون مدینہ میں نازل ہوا اور مکہ میں مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود یہ کیسے ممکن ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں مکّہ کے مسلمانوں کی حالت وکیفیت بیان کی جا رہی ہو۔ شیخ طوسی مرحوم نے اس سوال کا جواب تفسیر "تبیان" میں دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں زکوٰۃ سے مراد مستحب زکوٰۃ تھی۔ جو کہ مکّہ میں نافذ تھی۔ یعنی قرآن مسلمانوں کو (حتیٰ کہ مکّہ میں بھی) حاجت مندوں کی مالی امداد اور نو مسلم افراد کے لیے ضروریات مہیا کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔

۳۔ مکّہ اور مدینہ میں مختلف لائحہ عمل

مندرجہ بالا آیت ضمنی طور پر ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مکہ میں تو مسلمانوں کا ایک لائحہ عمل تھا اور مدینہ میں دوسرا۔ مکہ کا تیرہ سالہ قیام مسلمانوں کے لیے انسان سازی کا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے شب و روز مسلسل کوشش کی کہ انھیں بُت پرستی اور زمانہ جاہلیت کے بیہودہ عناصر سے نجات دلا کر اس قسم کے انسان بنائیں جو زندگی کے بڑے حادثات کا مقابلہ کرتے ہوئے استقامت، پامردی اور ایثار کا مظاہرہ کریں اگر مکہ کے قیام کے زمانے میں یہ چیز موجود نہ ہوتی تو مدینہ کے مسلمانوں کو اتنی حیران کن اور پے در پے کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں۔ مکّہ کے قیام کا دور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور تجربہ حاصل کرنے کا



دور ہے۔ اس بنیاد پر قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے تقریباً نوّے سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں سے زیادہ تر سورتیں عقیدہ، مکتب اور نظریات کا منبع تھیں لیکن مدینہ کا زمانہ تشکیل حکومت اور ایک مکمل معاشرے کی بنیادیں استوار کرنے کا دور تھا۔ اسی لیے نہ تو مکہ میں جہاد واجب تھا اور نہ ہی زکوٰۃ۔ کیونکہ جہاد اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے جیسا کہ بیت المال کی تشکیل بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

۷۸۔ اَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ
تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُولُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُولُوْا
هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ
يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ○

۷۹۔ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ
نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○

ترجمہ

۷۸۔ تم جہاں کہیں بھی رہو، موت تمھیں پالے گی اگرچہ محکم برجوں میں جا رہو اور اگر انھیں (منافقین کو) حسنہ (اور کامیابی) حاصل ہو تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور سیئہ (اور شکست) سے دوچار ہوں تو کہتے ہیں یہ تمھاری طرف سے ہے کہہ دو کہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ پس یہ گروہ کیوں تیار نہیں ہوتا کہ حقائق کا ادراک کرے۔

۷۹۔ جو نیکیاں تجھ پر پہنچتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائی تجھے پہنچتی ہے وہ خود تیری طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس بارے میں خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ اور بعد کی آیات پر غور کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات بھی منافقین سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں رہتے تھے جیسا کہ گذشتہ آیات میں ہے کہ وہ میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے اور جب جہاد کا حکم صادر ہوا



تو انھیں تکلیف ہوئی۔ قرآن ان کے اس طرز فکر کا دو طرح سے جواب دے رہا ہے پہلا جواب تو وہی تھا جو گذشتہ آیت کے آخر میں گزر چکا ہے۔

قل متاع الدنیا قلیل و الاخرۃ خیر لمن اتقی

کہہ دو کہ دنیاوی زندگی بہت کم ہے لیکن پرہیزگاروں کے لیے دوسرے جہان میں اس کا صلہ موجود ہے۔"

دوسرا جواب جو زیر بحث ہے کہ موت سے فرار اختیار کرنا تمھارے لیے مفید نہیں" حالانکہ تم جہاں کہیں بھی ہو موت سے تم کو مفر نہیں آخر ایک دن تمھیں اس کا نوالہ بننا ہے یہاں تک کہ تم مضبوط گنبدوں میں کیوں نہ چھپ جاؤ" پس وہ موت جسے ضرور آنا ہے اور جس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے کیوں نہ اسے اصلاح اور سچائی کے لیے قبول کیا جائے جیسے جہاد کی صورت میں، بجائے اس کے کہ بے کار اور لاحاصل موت قبول کی جائے۔

(اینما تکونوا یدرککم الموت و لو کنتم فی بروج مشیدۃ)

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات مثلاً سورہ حجر کی آیہ ۹۹ اور مدثر کی آیت ۴۷ میں موت کو "یقین" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہر قوم اور گروہ جو بھی عقیدہ رکھتا ہو وہ ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے مگر اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ زندگی ایک دن ختم ہونے والی ہے وہ افراد جو زندگی سے عشق کرتے ہیں اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ موت ہمیشہ کیلئے نیست و نابود ہونے کا نام ہے اور اس کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں یہ آیات انھیں تنبیہ کرتی ہیں اور زیر بحث آیت میں یدرککم کے مفہوم سے انھیں متوجہ کیا گیا ہے کہ عالم ہستی کی اس حقیقت سے فرار اختیار کرنا ایک نامناسب فعل ہے کیونکہ "یدرککم" کے مادہ کا معنی یہ ہے کہ کوئی کسی چیز سے فرار حاصل کرے اور وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ سورہ جمعہ کی آیت ۸ میں بھی یہ حقیقت زیادہ کھل کر بیان کی گئی ہے:

قل ان الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم (کہہ دو موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہارے سامنے آئے گی)

جب یہ حقیقت مدنظر ہو تو کیا یہ عقل مندی ہے کہ انسان میدان جہاد میں جائے اور قابل فخر مرتبے پر فائز ہونے کی بجائے اس سے کنارہ کش ہو کر گھر میں آرام کرتا رہے فرض کر لیں کہ جہاد سے کنارہ کش ہو کر وہ زندگی کے چند روز اور گزار لے اور وہی کام دہراتا رہے جو پہلا کرتا رہا ہے۔

راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کے اجر و ثواب سے بے بہرہ ہو جائے تو کیا یہ عقل اور منطق کے مطابق صحیح ہے اصولی طور پر موت ایک عظیم حقیقت ہے اور موت کے استقبال کے لیے افتخار کے ساتھ آمادہ ہونا چاہیے۔

دوسرا نکتہ جس پر توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ درج بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کوئی چیز یہاں تک کہ محکم برج (بروج مشیدہ[1]) بھی موت سے

---

[1] مشیدہ۔ در اصل مادہ شید (بروزن شیر) سے ہے اور گچ اور دوسرے محکم مواد کے معنی میں ہے کہ جنھیں کسی بنیاد کے استحکام کے لیے استعمال کرتے ہیں چونکہ اس زمانہ میں عام طور پر مضبوط بنیاد کے لیے محکم ترین مادہ گچ اور چونا تھا لہٰذا زیادہ تر اس مفہوم میں بولا جاتا تھا۔ لہٰذا بروج مشیدہ محکم قلعوں کے معنی میں ہے اور دیکھنے میں مشیدہ مرتفع اور بلند کے معنی میں آتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ چونا سے استفادہ کیے بغیر کسی طرح بھی بلند و بالا عمارت کی بنیادیں استوار نہیں ہو سکتیں۔



چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا اور اس کی وجہ واضح ہے اور وہ یہ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ موت وجود انسانی سے باہر نفوذ کرتی ہے۔ عملی طور پر موت کا سرچشمہ انسان کے اندر ہے، کیونکہ بدن کے مختلف کل پرزوں (اعضاء) کی استعداد یقیناً محدود ہے ایک دن وہ ختم ہوجاتے ہیں۔ البتہ غیر طبعی موت انسان کی تلاش میں باہر سے آتی ہے لیکن طبعی موت اس کے اندر سے آتی ہے۔ مضبوط گنبد اور بھاری قلعے بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔

یہ بجا ہے کہ مضبوط قلعے بعض اوقات غیر طبعی موت سے بچا لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی موت سے مکمل نجات نہیں دلا سکتے اور چند دنوں بعد طبعی موت انسان کو آلیتی ہے۔

کامرانیوں اور شکستوں کا سرچشمہ

قرآن اس آیت کے ذیل میں منافقین کی کچھ اور بے بنیاد باتوں اور باطل خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:
وہ جب بھی کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور نیکیاں اور حسنات ان کے ہاتھ آتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی ہم اس قابل تھے کہ خدا نے ہمیں یہ شفقتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں۔

(و ان تصبھم حسنة یقولوا ھذہ من عند اللہ)

لیکن جب انھیں شکست کا سامنا ہو یا میدان جنگ میں کوئی مشکل لاحق ہو تو کہتے ہیں کہ یہ پیغمبرؐ کی غلط تدبیر اور ان کی جنگی حکمت عملی کے خام ہونے کی وجہ سے تھا اس ضمن میں وہ جنگ احد کی شکست کا حوالہ دیتے ہیں۔

(و ان تصبھم سیئة یقولوا ھذہ من عندك)

بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ درج بالا آیت یہودیوں کے بارے میں ہے اور "حسنة" اور "سیئة" سے مراد سارے اچھے اور بُرے حوادث و واقعات ہیں کیونکہ یہودی پیغمبرؐ کے ظہور کے وقت اپنی زندگی کے اچھے حوادث کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے اور برے حوادث کو پیغمبرؐ سے منسوب کر دیتے تھے لیکن اس آیت کا ربط پہلے اور بعد کی ان آیات سے ہے جو منافقین کے بارے میں نشاندہی کرتی ہیں یہ آیت بھی زیادہ تر انھی سے مربوط ہے بہرحال قرآن انھیں جواب دیتا ہے کہ ایک موحد اور بالغ نظر خدا پرست کی نگاہ میں یہ تمام حوادث، کامیابیاں اور شکستیں خدا کی طرف سے ہیں جو لوگوں کی قابلیت اور اہلیت کے مطابق انھیں دی جاتی ہے۔

(قل کل من عند اللہ)

اور آیت کے آخر میں اعتراض کے طور پر ان منافقین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ فکر اور غور نہیں کرتے "پس کیوں یہ لوگ حقائق کا ادراک کرنے کو تیار نہیں ہوتے"۔

(فمال ھؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثاً)

اس کے بعد اگلی آیت میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ تمام نیکیاں، کامیابیاں اور حسنات جو تمھیں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو برائیاں اور شکستیں تمھیں درپیش ہوتی ہیں اور وہ خود تمھاری طرف سے ہیں۔

(ما اصابك من حسنة فمن اللہ وما اصابك من سیئة فمن نفسك)



اور آیت کے آخر میں ان لوگوں کو جو اپنی شکستوں اور ناکامیوں کی نسبت پیغمبرؐ سے دیتے ہیں اور اصطلاحاً پیغمبرؐ کی وجہ سے سمجھتے تھے انھیں جواب دیا گیا۔ پیغمبرؐ سے ارشاد ہوتا ہے: "اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے اپنا پیامبر قرار دیا ہے اور خدا اس پر گواہ ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔"

توکیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا لوگوں کی شکست، ناکامی اور برائی کا سبب ہو؟

(وارسلنٰک للناس رسولا وکفیٰ باللہ شہیداً)

ایک اہم سوال کا جواب

ان دو آیات کا مطالعہ کہ جو قرآن میں آگے پیچھے مربوط ہیں ذہن میں ایک سوال پیدا کرتا ہے کہ کیوں پہلی آیت میں تمام نیکیوں اور برائیوں (حسنات وسیئات) کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں صرف نیکیوں کو خدا کی طرف اور برائیوں اور سیئات کو لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یقیناً یہاں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ دو آیات جو کہ یکے بعد دیگرے آئی ہیں ان میں ایسا واضح اختلاف ہے ان دونوں آیات پر غور و فکر کرنے سے چند نکات واضح ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس سوال کا علیحدہ جواب بن سکتا ہے۔

۱۔ اگر سیئات اور برائیوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دو پہلو رکھتی ہیں۔ ایک مثبت پہلو اور ایک منفی پہلو۔ یہی منفی پہلو ہے جو انھیں برائی کی شکل وصورت دیتا ہے اور انھیں نسبتی زبان یا متقابلاً نقصان کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

جو شخص گرم یا سرد ہتھیار کے ذریعہ کسی مسلمان کو قتل کر دے مسلّم ہے کہ وہ ایک برائی کا مرتکب ہوا ہے اب ہم اس بُرے کام کے عوامل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان عوامل میں انسان کی طاقت، اس کی فکر، سرد یا گرم ہتھیار کی طاقت، صحیح نشانہ، مناسب وقت سے استفادہ کرنا اور گولی کی تاثیر اور طاقت وغیرہ نظر آتے ہیں جو تمام واقعہ کے مثبت پہلو ہیں۔ کیونکہ یہ سب مفید اور سودمند ہو سکتے ہیں اور اگر انھیں برمحل استعمال کیا جائے تو بڑی بڑی مشکلات کے موقع پر کام آتے ہیں صرف ایک منفی پہلو اس واقعہ کا یہ ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں اور توانائیاں بے محل استعمال ہوئی ہیں مثلاً بجائے اس کے کہ ان کے ذریعے ایک خطرناک درندے کو مارا جاتا یا ایک جفاکار اور ظالم قاتل پر انھیں استعمال کیا جاتا، ایک بے گناہ انسان کو نشانہ بنایا گیا بس یہی منفی پہلو ہے کہ ان صلاحیتوں کو برائی کے طور پر کام لایا گیا۔ ورنہ نہ تو اچھے نشانے کی صلاحیت انسان کے لیے بُری چیز ہے اور نہ ہی گولی اور بارود کا استعمال بُرا ہے، یہ سب صلاحیت کو استعمال کرنے کے ذرائع ہیں اور اپنی جگہ بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں تمام حسنات اور سیئات کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کے تمام ذرائع، یہاں تک کہ وہ صلاحیتیں کہ جن سے غلط فوائد حاصل کیے گئے، خدا کی طرف سے ہیں اور اصلاحی اور مثبت اجزاء کا سرچشمہ وہی ہیں اور اگر دوسری آیت میں سیئات کی نسبت لوگوں کی طرف دی گئی ہے تو واقعہ کے انھی منفی پہلوؤں اور خدا کی عنایات اور صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی طرف اشارہ ہے یہ بالکل اسی مثال کی طرح ہے کہ ایک شخص اپنے بیٹے کو ایک اچھا گھر بنانے کے لیے سرمایہ دے لیکن وہ اسے منشیات، فساد، تباہ کاری میں صرف کرے اس میں شک نہیں ہے کہ سرمایہ کے لیے وہ اپنے باپ کا مقروض ہے لیکن



سرمایے کے غلط استعمال کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ آیت مبارکہ "الامر بین الامرین" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہو جس کی طرف جبر اور تفویض کی بحث میں اشارہ ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام حوادث دنیا، یہاں تک ہمارے اعمال و افعال چاہے اچھے ہوں یا بُرے، نیک ہوں یا بد ایک طرح سے خدا سے مربوط ہیں کیونکہ وہی ہے جس نے ہمیں طاقت دی ہے اور اختیار و ارادہ کی آزادی ہمیں بخشی ہے لہذا ہم جو کچھ اختیار کرتے ہیں اور ارادہ کی آزادی کے ساتھ انتخاب کرتے ہیں وہ مشیت الٰہی کے برخلاف نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے اعمال ہم سے نسبت رکھتے ہیں اور ان کا سرچشمہ ہمارا وجود ہے کیونکہ عمل کے تعین کرنے کا عامل و سبب ہمارا ارادہ و اختیار ہے اور اسی بنا پر ہم اپنے اعمال کے بارے میں جوابدہ ہیں اور خدا کی طرف ہمارے اعمال کی اسناد و نسبت، جیسا کہ اشارہ ہوا ہے ہماری ذمہ داری اور جوابدہی کو سلب نہیں کرتی اور عقیدہ جبر کا موجب اور سبب نہیں بنتی۔ لہذا خدا جہاں فرماتا ہے کہ "حسنات و سیئات" میری طرف سے ہیں تو وہاں اشارہ کرتا ہے کہ تمام چیزوں کی نسبت خدا کی اس فاعلیت (اختیار) کی طرف ہے اور جہاں فرماتا ہے سیئات تمھاری طرف سے ہیں تو وہاں ہماری فاعلیت اور ہمارے ارادہ و اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ اور حقیقت میں ان دو آیات کا مجموعہ "امر بین الامرین" کے مسئلہ کو ثابت کرتا ہے (یہ نکتہ غور طلب ہے)۔

۳۔ ایک اور تفسیر جوان دو آیات کے لیے موجود ہے اور اہلِ بیتؑ کی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ "سیئات" سے مراد اعمال کی سزا و مجازات اور گناہوں کے عقوبات و نتائج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سزائیں خدا کی طرف سے ہیں لیکن چونکہ یہ بندوں کے اعمال و افعال کا نتیجہ ہیں۔ اس بنا پر بعض اوقات ان کی نسبت بندوں کی طرف دی جاتی ہے اور بعض اوقات خدا کی طرف، اور دونوں صحیح ہیں۔ مثلاً یہ دونوں طرح سے صحیح و درست ہے کہ کہا جائے کہ قاضی چور کا ہاتھ کاٹتا ہے یا یہ کہ چور خود اپنے ہاتھ کو کاٹتا ہے۔

۸۰۔ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَ مَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ○
۸۱۔ وَ یَقُوۡلُوۡنَ طَاعَۃٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِکَ بَیَّتَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ غَیۡرَ الَّذِیۡ تَقُوۡلُ ؕ
وَ اللّٰہُ یَکۡتُبُ مَا یُبَیِّتُوۡنَ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ○

ترجمہ

۸۰۔ جس شخص نے پیغمبر کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جو روگردانی کرے تو تم اس کے جواب دِہ نہیں ہو۔

۸۱۔ وہ تیرے سامنے کہتے ہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں لیکن جب وہ تمھاری بزم سے باہر جاتے ہیں تو ان میں ایک گروہ تمھاری گفتگو کے برخلاف رات کو خفیہ میٹنگیں تشکیل دیتا ہے جو کچھ وہ ان میٹنگوں میں کہتے ہیں خُدا اسے لکھتا ہے



ان کی پرواہ نہ کرو (اور ان کے منصوبوں اور سازشوں سے نہ ڈرو) اور خدا پر توکل کرو اور کافی ہے کہ وہ تمہارا مددگار اور حفاظت کرنے والا ہو۔

تفسیر

اس آیت میں لوگوں اور ان کے "حسنات" اور "سیئات" کے مقابلہ میں رسولؐ کی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ خدا پہلے فرماتا ہے کہ جو شخص پیغمبر کی اطاعت کرے اس نے خدا کی اطاعت کی۔

(من یطع الرسول فقد اطاع اللہ)

لہٰذا خدا کی اطاعت پیغمبر کی اطاعت سے جدا نہیں ہوسکتی کیونکہ پیغمبر کوئی قدم خدا کی مشیت کے خلاف نہیں اٹھاتا اس کی گفتار، کردار، اعمال سب خدا کے فرمان کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے: اگر کچھ لوگ اعراض اور روگردانی کرتے ہیں اور وہ تمہارے احکام کے خلاف کھڑے ہوجاتے ہیں تو تم ان کے اعمال کے جواب دہ نہیں ہو اور تمہارا کام نہیں کہ ان سے تکرار کرو یا نافرمانی کرنے سے انھیں جبراً روکو۔ تمہارا فرض تبلیغ رسالت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور گمراہ و بے خبر لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے (ومن تولی فما ارسلناک علیہم حفیظا) غور کرنا چاہیے کہ لفظ "حفیظ" اس لحاظ سے کہ صفت مشبہ ہے اور ثبات و دوام کے معنی دیتا ہے "حافظ" سے مختلف ہے جو کہ اسم فاعل ہے اس لیے حفیظ کا معنی وہ شخص ہے کہ جو ہمیشہ کسی چیز کی نگرانی پر مامور ہو۔ لہٰذا آیت کا معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ پیغمبر کی ذمہ داری رہبری کرنا، ہدایت کرنا، دعوت حق دینا، فتنہ اور مفاسد کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اگر کچھ لوگ مخالفت پر کمربستہ ہوں تو پیغمبر ان کی کج روی کے لیے جوابدہ نہیں ہیں کہ ہر جگہ موجود ہوں اور ہر گناہ و معصیت کا طاقت اور جبر سے مقابلہ کریں اور مروج طریقوں سے بھی وہ اس طرح کی قدرت نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر اُحد جیسی جنگ کے حوادث بھی شاید آیت کے پیش نظر ہوں کہ پیغمبر کا فرض تھا کہ فنونِ حرب کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ گہرائی اور غور و خوض سے جنگی حکمت عملی تیار کرتا اور دشمن کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھتا۔ اور یہ بات مسلّم ہے کہ ان احکام و ضوابط میں پیغمبر کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگوں نے پیغمبر کے احکام کی حکم عدولی کی اور اس سبب سے وہ شکست سے دوچار ہوئے تو اس کی جواب دہی ان سے منسوب ہوگی نہ کہ پیغمبر سے۔ غور کرنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن کی واضح ترین آیات میں سے ہے جو سنتِ پیغمبر کے حجت ہونے اور آپ کی احادیث کو قبول کرنے کے لیے دلیل ہے، لہٰذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو قبول کرتا ہوں لیکن پیغمبر کی حدیث اور سنت کو قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ درج بالا آیت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ پیغمبر کی حدیث اور سنت کی اطاعت فرمانِ خدا کی اطاعت ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے حدیث ثقلین کے مطابق جو کہ مشہور مآخذ اور کتب اسلامی میں مذکور ہے چاہے وہ کتب شیعہ ہوں یا کتب اہل سنت، صراحت کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کو سند اور حجت قرار دیا ہے اس سے ہمیں معلوم ہوتا



ہے کہ اہل بیتؑ کے فرمان کی اطاعت بھی فرمانِ خدا کی اطاعت سے الگ نہیں ہے اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قرآن کو تو قبول کرتا ہوں لیکن اہلِ بیتؑ کے فرامین کو نہیں مانتا کیونکہ یہ بات درج بالا آیت اور اس کی مشابہ آیات کے برخلاف ہے۔

اسی لیے بہت سی روایات جو تفسیر برہان میں اس آیت کے ضمن میں آئی ہیں میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا نے درجِ بالا آیت کے مطابق امر ونہی کا حق اپنے پیغمبرؐ کو دیا ہے اور پیغمبرؐ نے یہ حق حضرت علیؑ اور ائمہ اہل بیتؑ کو دیا ہے لہٰذا لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کے امرونہی سے روگردانی نہ کریں کیونکہ ان کا امرونہی ہمیشہ خدا کی طرف سے ہے نہ کہ خود ان کی طرف سے[1]۔ اس کے ساتھ دوسری آیت میں منافقین کے ایک گروہ یا کمزور ایمان والے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے" وہ لوگ جس وقت مسلمانوں کی صفوں میں پیغمبرؐ کے پاس کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے یا کسی ضرر سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے دوسروں کے ہم آواز ہوتے اور فرمانِ پیغمبرؐ کی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم جان و دل سے پیغمبرؐ کی پیروی کرنے کو تیار ہیں (ویقولون طاعۃ)۔

لیکن جب لوگ بزمِ رسالت سے نکلتے ہیں تو وہ منافقین اور کمزور ایمان والے افراد اپنے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور خفیہ اجتماعات میں پیغمبرؐ کے ارشادات کے خلاف پروگرام بناتے ہیں (فاذا برزوا من عندك بیت طائفۃ منھم غیر الذی تقول)۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پیغمبرؐ کے زمانہ میں نچلے نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ وہ رات کو خفیہ اجتماعات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کے لائحہ عمل میں رخنہ اندازیاں کرتے تھے، لیکن خدا اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان سے منہ پھیر لیں اور ان کی سازشوں سے گھبرائیں نہیں اور اپنے لائحہ عمل کے لیے ان پر انحصار نہ کریں۔ بلکہ فقط خدا پر بھروسہ رکھیں خدا جو سب سے زیادہ مدد اور حفاظت کرنے والا ہے (فاعرض عنھم وتوکل علی اللہ وکفیٰ باللہ وکیلا)۔

۸۲۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

ترجمہ

۸۲۔ کیا قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بہت سے اختلافات پاتے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۹۶



تفسیر

اعجازِ قرآن کی زندہ مثال

ان سرزنشوں کے بعد جو گزشتہ آیات میں منافقین کو کی گئی تھیں یہاں انھیں اور دوسرے تمام ان لوگوں کی طرف جو قرآن کی حقانیت میں شک و تردد کرتے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا یہ لوگ قرآن کی مخصوص وضع و کیفیت پر غور و فکر نہیں کرتے اور اس کے نتائج کو نہیں دیکھتے، قرآن اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے نازل ہوتا تو یقیناً اس میں انھیں بہت سے تفاوت اور اختلافات ملتے اب جب کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے تو انھیں جان لینا چاہیے کہ وہ خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے (افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافاً کثیراً)۔

"تدبر" اصل میں مادہ دبر (بروزن ابر) پشت سر اور کسی چیز کی عاقبت و انجام کے معنی میں ہے اس بنا پر تدبیر سے مراد نتائج، عواقب اور کسی چیز کے آگے پیچھے دیکھنا ہے۔ تفکر سے اس کا فرق یہ ہے کہ تفکر کا ربط کسی موجود کے علل اور خصوصیات کے مطالعہ سے ہے لیکن "تدبر" اس کے عواقب و نتائج کے مطالعے اور جائزے سے مربوط ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصولِ دین اور ایسے مسائل مثلاً پیغمبر کے دعوے کی سچائی اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کریں اور اندھی تقلید اور بغیر سوچے سمجھے فیصلوں سے اجتناب کریں۔

۲۔ بعض لوگوں کے خیال کے برعکس قرآن سب لوگوں کے لیے قابل فہم و ادراک ہے کیونکہ اگر وہ قابل فہم و ادراک نہ ہوتا تو اس میں تدبر اور غور و فکر کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

۳۔ قرآن کی حقانیت کی ایک اور دلیل اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے یہ ہے کہ سارے قرآن میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے حسبِ ذیل وضاحت کی طرف توجہ کریں۔

"ہر شخص کی کیفیات اور نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں بعض استثنائی حالتیں چھوڑ کر عام حالات میں قانون تکامل و ارتقاء انسان اور اس کے افکار و نظریات پر بھی موثر و حاوی ہے ہمیشہ دن مہینے اور سال بدلنے سے لوگوں کی زبان، فکر اور گفتار بھی بدلتی رہتی ہے اگر غور سے دیکھیں تو ایک لکھنے والے شخص کی تحریریں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی کتاب کی ابتدا اور انتہا میں فرق ہوتا ہے خصوصاً اگر کوئی شخص عظیم حوادث سے گزرے اور حوادث بھی ایسے جو ایک فکری، اجتماعی، نظریاتی، مقاصدی انقلاب کی بنیاد بن جائیں تو وہ جتنا بھی کوشش کرے کہ اپنی گفتار کو ایک جیسا اور ایک طرز پر



رکھے اور اسے اپنی گذشتہ باتوں سے مربوط کرلے وہ ایسا نہیں کرسکتا خصوصاً اگر وہ ان پڑھ اور پس ماندہ ماحول میں پروان چڑھا ہو۔

"لیکن قرآن جو ۲۳ سال کی مُدّت میں لوگوں کے تربیتی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق بالکل مختلف حالات اور مواقع پر نازل ہوا، ایسی کتاب ہے جو مکمل طور پر مختلف موضوعات کو چھیڑتی ہے اور عام کتب کی طرح اس میں صرف ایک اجتماعی، سیاسی، فلسفیانہ، حقوقِ انسانی یا تاریخی موضوع سے بحث نہیں ہے بلکہ قرآن کبھی توحید اور اسرارِ آفرینش کے بارے میں اور کبھی احکام و قوانین اور آداب و سنن کے متعلق اور کسی وقت گذشتہ عبادت اور بندوں کے خدا سے رابطے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ ڈاکٹر گوستاولبون کے بقول قرآن جو کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب ہے صرف تعلیمات اور احکام مذہبی پر منحصر نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی احکام بھی بیان کرتی ہے ایسی خصوصیات کی حامل کتاب کے لیے عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ تضاد، تناقض اور تضاد بیانی سے مبرا ہو۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام جہات کے باوجود اس کی تمام آیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ہر قسم کے تضاد، اختلافات، ناموزونیت سے خالی ہے تو ہم بہت بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب افکار انسانی کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔ بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن خود اس حقیقت کو درج بالا آیت میں بیان کرتا ہے[1]۔"

۸۳۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

ترجمہ

۸۳۔ اور جب کامیابی یا شکست کی خبر انھیں ملے تو وہ (تحقیق کیے بغیر) اسے مشہور کر دیتے ہیں لیکن اگر وہ پیغمبر اور صاحبان امر کی طرف (جو تشخیص کی کافی اہلیت و قدرت رکھتے ہیں) پلٹا دیں تو وہ مسائل کی تہہ سے آگاہ ہوجائیں اور خدا کا فضل اور رحمت شامل حال ہوتی تو سوائے قلیل گروہ کے سب کے سب شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔

تفسیر

افواہیں پھیلانا

اس آیت میں منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے ایک اور منفی عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انھیں مسلمانوں کی فتح یا شکست کے متعلق خبریں پہنچتی ہیں تو وہ تحقیق کیے بغیر انھیں لوگوں میں پھیلاتے ہیں

---

[1] کتاب قرآن و آخرین پیغمبرؐ ص ۳۰۹ تالیف ناصر مکارم



جب کہ بیشتر یہ خبریں بے بنیاد ہوتی ہیں اور دشمنوں کی جانب سے خاص مقاصد کے لیے گھڑی جاتی ہیں، ان کا شہرت پانا مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے (و اذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ) حالانکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس قسم کی خبریں سب سے پہلے اپنے رہبروں اور پیشواؤں کے سامنے رکھیں اور ان کی وسیع اطلاعات اور گہری فکر سے استفادہ کریں اور بلاوجہ نہ تو مسلمانوں کو اچھے نتائج کے غرور میں مبتلا کریں جو خیالی کامیابیوں سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ شکست کی جھوٹی خبروں سے ان کی ہمتوں کو پست کریں (ولو ردوہ الی الرسول و الی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم)

"یستنبطونہ" اصل میں نبط (بروزن فقط) کے مادہ سے ہے اس سے مراد وہ پہلا پانی ہے جو کنوئیں سے نکالتے اور زمین کی تہہ سے حاصل کرتے ہیں اسی بنا پر ہر حقیقت کے مختلف دلائل و شواہد سے استفادہ کرنے اور موجود مدارک سے استخراج کرنے کو "استنباط" کہا جاتا ہے چاہے یہ کام فقہی مسائل میں ہو یا فلسفیانہ، سیاسی اور علمی مسائل میں جو شخص کی قدرت رکھتے ہوں، اور مختلف مسائل پر کافی دسترس رکھتے ہوں اور جو حقائق کو بے بنیاد افواہوں سے اور صحیح مطالب کو غلط امور سے الگ کر کے لوگوں تک پہنچائیں، اس طرح کے لوگوں میں بلاوجہ پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے جانشین آئمہ اہل بیتؑ کا ہے اور دوسرے درجے میں ایسے علماء ہیں جو ان مسائل میں صاحبِ نظر ہیں جیسا کہ تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ضمن میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

"ھم الائمہ" یعنی اس آیت سے مراد آئمہ اہل بیت ہیں۔

اور اس مضمون کی دوسری روایات بھی نقل ہوئی ہیں ممکن ہے اس طرح کی روایات پر لوگ اعتراض کریں کہ رسول اللہؐ تو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے لیکن آئمہ اہل بیتؑ کو منصبِ امامت نہیں ملا تھا اس اعتراض کا جواب واضح ہے کیونکہ یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ کے ساتھ تو مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ آیت تو ایک مکمل قانون، تمام ادوار اور زمانوں کے لیے ہے جو دشمنوں اور نادان مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کے درمیان غلط خبروں کی اشاعت کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

غلط خبریں اور افواہیں پھیلانے کے نقصانات

مختلف معاشروں کو جو بڑے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور جو معاشروں سے اجتماعی فکر، افہام و تفہیم اور ہم آہنگی کو ختم کر دیتے ہیں ان کا سبب جھوٹی خبریں گھڑنا اور ان کی نشر و اشاعت ہے اس طرح سے کہ بعض اوقات ایک منافق ایک غلط خبر گھڑ لیتا ہے وہ چند افراد تک پہنچاتا ہے اور وہ بلا تحقیق اس کی نشر و اشاعت کرنے لگتے ہیں اور شاید کچھ اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کافی حد تک لوگوں کی فکری توانائی ضائع کر دیتے ہیں اور لوگوں کو اس طرف مشغول کر کے انھیں اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کی خبریں لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتی ہیں اور معاشرے کو اہم فرائض کی انجام دہی سے سست رو اور متردد کر دیتی ہیں۔ اگرچہ وہ گروہ اور معاشرے جن میں جبر ہے اور ان کے گلے گھونٹ دیئے گئے ہیں ان میں بھی جھوٹی خبریں گھڑنا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ایک قسم کے مقابلے یا انتقام جوئی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن صحیح معاشروں میں غلط خبروں کی نشر و اشاعت بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ اگر اس قسم کی خبریں قابل مثبت



اور مفید افراد کے متعلق ہوں تو وہ انھیں خدمات اور کارنامے انجام دینے کے معاملے میں دل سرد اور سُست کر دیتی ہیں اور بعض اوقات ان کی برس ہا برس کی حیثیت کو برباد کر دیتی ہیں۔ لوگوں کو ان کے وجود کے فوائد سے محروم کر دیتی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام صراحت کے ساتھ جھوٹی خبریں گھڑنے کے عمل سے جنگ کرتا ہے اور جعلسازی، جھوٹ اور تہمت گوئی اور اس کی نشر و اشاعت بھی ممنوع قرار دیتا ہے۔ درج بالا آیت اس کا ایک نمونہ ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر فضل و رحمت تمھارے شامل حال نہ ہوتی اور پروردگار کے مقرر شدہ رہنماؤں کے ذریعے تم اس قسم کی جھوٹی خبروں اور ان کے بُرے نتائج سے چھٹکارہ حاصل نہ کرتے تو تم میں سے بہت سے لوگ شیطانی راستوں پر چل پڑتے اور قلیل افراد ایسے رہ جاتے جو شیطان کی پیروی سے اجتناب کرتے (ولو لا فضل الله علیکم ورحمته لاتبعتم الشیطان) یعنی پیغمبرؐ اور صاحب نظر و اہل بصیرت علماء ہی ہیں جو غلط مشتہر ہونیوالی خبروں کے وسوسوں سے بچ سکتے ہیں لیکن معاشرے کی اکثریت اگر صحیح رہبری سے محروم رہ جائے تو من گھڑت خبروں اور ان کے ضرررساں اثرات سے نہیں بچ سکتی۔[1]

۸۴۔ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ○

ترجمہ

۸۴۔ راہ خدا میں جنگ کرو۔ تم صرف اپنی ذمہ داری کے جواب دہ ہو اور مومنین کو (اس کام کا) شوق دلاؤ۔ امید ہے کہ خدا کافروں کی قوت کو روک دے (چاہے تم اکیلے ہی میدان میں چلے جاؤ) خدا کی قدرت بہت زیادہ ہے اور اس کی سزا دردناک ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان، قرطبی اور روح المعانی میں اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں اس طرح منقول ہے:

---

[1] جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "الا قلیلا" "اتبعتم" کی ضمیر سے مستثنیٰ ہے اور آیت میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہیں ہے (غور کیجیے گا)۔



جس وقت ابوسفیان اور قریش کا لشکر فتح و کامیابی کے ساتھ میدانِ اُحد سے پلٹا تو ابوسفیان نے پیغمبرؐ سے معاہدہ کیا کہ بدر صغریٰ کے موقع پر (یعنی ماہِ ذی القعدہ میں جو بازار بدر کی زمین پر لگتا تھا) دوبارہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ جب مقررہ وقت آیا تو پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو مذکورہ مقام کی طرف جانے کی دعوت دی لیکن مسلمانوں کی ایک جماعت جو جنگ اُحد کی شکست کی تلخی کو ابھی تک نہیں بھولی تھی اس نے شدت کے ساتھ جانے کی مخالفت کی اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو دوبارہ چلنے کی دعوت دی تو اس موقع پر صرف ستر آدمی پیغمبرؐ کے ہم رکاب ہو کر اس مقام پر پہنچے۔ لیکن ابوسفیان (جو مسلمانوں کا سامنا کرنے سے خوف زدہ تھا) مقابلہ کرنے نہ آیا اور پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب کے ساتھ صحیح و سلامت مدینہ لوٹ آئے۔

تفسیر

ہر شخص اپنے فرائض کا جوابدہ ہے

جہاد سے متعلق آیات کے بعد اس آیت میں ایک بہت بڑا حکم پیغمبرؐ کو دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اکیلے دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں۔ چاہے ایک شخص بھی میدان میں ان کا ہم قدم نہ ہو۔ کیونکہ وہ صرف اپنی ذمہ داری کے لیے جوابدہ ہیں اور وہ دوسرے لوگوں کے بارے میں شوق دلانے اور دعوتِ جہاد دینے کے علاوہ ان کی کوئی مسئولیت نہیں ہے (فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک وحرض المؤمنین) حقیقت میں یہ آیت ایک اہم اجتماعی حکم خصوصاً رہبروں کے متعلق اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ انھیں اپنے کام میں اس قدر پختہ عزم، ثابت قدم اور اٹل ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص بھی ان کی دعوت پر "لبیک" نہ کہے تب بھی وہ اپنے مقدس مقصد اور منزل کے حصول کی جدوجہد سے دستبردار نہ ہوں۔ دوسروں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کی دعوت دینے کے باوجود اپنے لائحہ عمل کو دوسروں کی مرضی پر نہ چھوڑیں۔ کوئی رہبر بھی جب تک ایسے عزم صمیم کا حامل نہ ہو وہ رہبری کے اہل نہیں اور نہ ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خصوصاً خدا کے مقرر شدہ رہبر و رہنما بلند عزم و حوصلہ اور کردار کے مالک ہوتے ہیں کیونکہ انھیں خدا کی ذات پر تکیہ ہوتا ہے وہ خدا کہ جو تمام توانائیوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔

لہٰذا اس حکم کے بعد خدا فرماتا ہے: امید ہے کہ خدا تیری سعی و کوشش کے ذریعہ دشمنوں کی قدرت و طاقت کو ختم کر دے گا چاہے ان کے مدمقابل تو اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کی قدرت تمام قدرتوں سے مافوق اور اس کی سزا تمام عذابوں سے بڑھ کر ہے (عسی اللہ ان یکف بأس الذین کفروا و اللہ اشد بأسا و اشد تنکیلا)[1]

---

[1] بأس کے معنی لغت میں قوت، استحکام اور شجاعت ہے اور تنکیل مادہ نکول سے خوف کے مارے رک جانے کے معنی میں ہے اور اصل میں نکل (بروزن اکل) کو جانور کی لگام کے معنی میں لیا گیا ہے اسی بنا پر تنکیل جو کہ باب تفعیل کا مصدر ہے ایسے کام کی انجام دہی کے مقصد میں آتا ہے کہ مقابل کی طرف جسے مشاہدہ کرنے کے ساتھ خلاف ورزی سے لوٹ آئے اور یہ دہی سزا و عذاب ہے کہ جو ستم گروں سے دوسرے لوگوں کی عبرت کا باعث بنتا ہے۔



کلامِ خدا میں "عسیٰ" اور "لعل" کے معنی

لفظ "عسیٰ" عربی لغت میں شائد کے معنی میں تردد کا مفہوم بھی دیتا ہے اور "لعل" پر امید ہونے، انتظار اور ایسے امور کی توقع کے معنی میں آتا ہے آئندہ جن کے وجود کا یقین نہ ہو بلکہ احتمال ہو۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے الفاظ انسانوں کی گفتگو میں آنا تو فطری اور عین طبعی ہے کیونکہ انسان تمام مسائل سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کی صلاحیت و قدرت بھی محدود ہے اور وہ جو کچھ کرے اس کے انجام کو اپنی مرضی کے تابع نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ خدا جو ماضی، حال اور مستقبل سے مکمل طور پر باخبر ہے اور جو کرنا چاہے اس کا اختیار رکھتا ہے اس کے لیے "جہالت" یا "بے اختیار" ہونے کے الفاظ استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اس لیے بہت سے علماء یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ جو اس کے کلام میں استعمال ہوں وہ اپنے اصل معنی میں استعمال نہیں ہوتے بلکہ ان کے کچھ اور معنی نکلتے ہیں مثلاً "عسیٰ" وعدہ کے معنی اور "لعل" طلب کے معنی میں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ کلام خدا میں بھی اپنے وہی اصلی معانی رکھتے ہیں اور ان کا لازمہ جہالت اور عدم اختیار نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ ایسے مواقع پر استعمال ہوتے ہیں کہ جہاں مقصد تک پہنچنے کے لیے کئی ایک مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے تو جس وقت ان میں سے ایک یا کئی ایک مقدمات حاصل ہو جائیں تو پھر بھی اس مقصد کے موجود ہونے کا قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ چاہیے کہ اسے احتمالی حکم کے طور پر بیان کیا جائے۔

مثلاً قرآن کہتا ہے:۔

و اذا قریٔ القراٰن فاستمعوا له و انصتوا لعلکم ترحمون

جب قرآن پڑھا جائے تو کان دھر کے سنو اور خاموش رہو، اُمید ہے کہ خدا کی رحمت تمھارے شامل حال ہو۔ (اعراف: ۲۰۴)

واضح ہے کہ صرف قرآن کی آیات کو کان دھر کے سننے سے خدا کی رحمت انسان کے شامل حال نہیں ہوتی بلکہ یہ تو ایک مقدمہ ہے اس کے علاوہ بھی دیگر لوازم ہیں جن میں ان آیات کا فہم و ادراک اور اس کے بعد ان احکام پر عمل درآمد جو ان آیات میں موجود ہیں بھی شامل ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے مواقع پر ایک مقدمہ کے موجود ہونے سے نتیجہ کے حصول کا قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اسے ایک احتمالی حکم کے طور پر بیان کرنا ہوگا دوسرے لفظوں میں کلام خدا میں اس قسم کی تعبیرات تو بیدار کرنے اور سننے والے کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے ہیں کہ اس کام کے علاوہ کچھ اور شرائط و مقدمات بھی مقصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں مثلاً اسی مثال میں خدا کی رحمت کا شعور حاصل کرنے کے لیے قرآن کو غور سے سننے کے ساتھ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

زیر بحث آیت پر بھی یہ گفتگو مکمل طور پر صادق آتی ہے کیونکہ کفار کی طاقت صرف مومنین کو دعوت جہاد دینے اور انھیں شوقِ جہاد دینے سے ختم نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ جہاد کے باقی لائحہ عمل پر عملدرآمد بھی ضروری ہے تاکہ اصل مقصد حاصل ہو سکے اس بنا پر ضروری نہیں کہ یہ الفاظ جب خدا کے کلام میں آئیں تو ان کے حقیقی معنی سے صرف نظر کر لیا جائے [1]

---

[1] راغب نے کتاب مفردات میں اس قسم کے الفاظ (عسیٰ وغیرہ) کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی بیان کیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)



۸۵۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝

ترجمہ

۸۵۔ جو شخص نیک کام کی تحریک دے اس میں سے اس کا حصّہ ہوگا اور جو بُرے کام کے لیے اُبھارے گا تو اس میں سے (بھی) اسے حصّہ ملے گا۔ اور خدا ہر چیز کا حساب کرتا اور اسے محفوظ رکھتا ہے۔

تفسیر

اچھے یا بُرے کام کی تحریک دلانے کا نتیجہ

جیسا کہ گذشتہ آیت کی تفسیر میں اشارہ ہو چکا ہے قرآن کہتا ہے کہ ہر شخص پہلے مرحلہ میں اپنے کام کا جوابدہ ہے نہ کہ دوسروں کا۔ لیکن اس بنا پر کہ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اس آیت میں کہتا ہے: یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنے فعل کا جوابدہ ہے لیکن جو شخص دوسرے کو نیک کام پر ابھارے تو اس کا حصہ ملے گا اور جو شخص دوسرے کو کسی بُرے کام پر اکسائے تو اس کا حِصّہ (بھی) اس میں ہوگا (من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها و من یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها) اس بنا پر ہر شخص کا اپنے اعمال کا جواب دہ ہونے کے معنی یہ نہیں کہ وہ دوسروں کو دعوتِ حق دینے اور فساد کا مقابلہ کرنے سے آنکھیں بند کرلے اور اسلام کی روحِ اجتماعیت کو مجروح کرتے ہوئے تجرد و انفرادیت کے ذریعے معاشرے سے بیگانگی کا راستہ اختیار کرے۔ شفاعت اصل میں مادہ شَفع (بروزن نَفع) سے جفت کے معنی میں ہے اس بنا پر ایک چیز کا دوسری میں منضم و مدغم ہو جانا شفاعت کہلاتا ہے البتہ کبھی کبھار یہ راہنمائی اور ارشاد و ہدایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (جس طرح درج بالا آیت میں ہے) تو اس وقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا معنی دیتا ہے (اور شفاعت سیئہ اس کے برعکس یعنی امر بالمنکر و نہی عن المعروف ہے) لیکن اگر گنہ گاروں کو ان کے انجام سے نجات دینے کا موقع ہو تو پھر یہ ایسے گنہ گار افراد کی مدد کرنے کے معنی میں آتا ہے جو شفاعت کے لیے اہلیت اور لیاقت رکھتے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں شفاعت کبھی تو عمل کی انجام دہی سے پہلے ہوتی ہے جو رہنمائی کے معنی میں ہے اور کبھی عمل کی انجام دہی کے بعد ہوتی ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اور وہ یہ کہ ان سے مخاطب اور سننے والے کو امید دلانا مقصود ہے۔ نہ کہ کہنے والے کی امید بیان کرنا اور واضح تر الفاظ میں جب خدا کہتا ہے "عسی ولعل" تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ میں امید رکھتا ہوں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اُمید رکھو۔



جہاں عمل کے نتائج سے نجات دینے کے معنی میں ہے بہرحال دونوں طرح سے ایک چیز دوسری کے لیے ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ آیت اگرچہ ایک کُلّی مفہوم کی حامل ہے، نیک اور بد ہر طرح کی دعوت کا مفہوم اس میں شامل ہے لیکن چونکہ یہ جہاد کی آیات کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے لہٰذا شفاعت حسنہ سے پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے تشویق جہاد مراد ہے اور شفاعتِ سیئہ سے منافقین کی طرف شوق جہاد نہ دلانا مراد ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے کام کا نتیجہ بھگتے گا یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ لفظ شفاعت کی تعبیر اس موقع پر جہاں (نیکیوں اور برائیوں کی طرف) رہبری کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ رہبر کی گفتگو (چاہے خیر کا راستہ بتانے والا رہبر ہو یا شر کا سبق دینے والا) دوسروں پر اسی صورت میں اثر کرے گی جب وہ اپنے لیے دوسروں کی طرح امتیاز نہ برتے بلکہ اپنے آپ کو دوسروں کا ہم دوش اور ساتھی قرار دے۔ یہ ایسا طریقہ ہے، جو اجتماعی اور معاشرتی مقاصد میں بڑا مؤثر ہوتا ہے۔ اگر قرآن میں بعض مواقع پر مثلاً سورۂ شعراء، اعراف، ہود، نمل اور عنکبوت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے انبیاء و مرسلین کو جو امتوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے بھیجے گئے ہیں "اخوہم" یا "اخاہم" یعنی ان کا بھائی کہا ہے، تو وہ بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن شفاعت حسنہ یعنی اچھے کام کی طرف راغب کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ترغیب دینے والوں کو "نصیب" ملے گا۔ جب کہ "شفاعت سیئہ" کے ضمن میں کہتا ہے کہ اسے "کفل" میسر آئے گا۔ یہ تعبیر کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ "نصیب" کے معنی ہیں مفید اور زیادہ سود مند اور "کفل" کے معنی ہیں پست اور بُری چیز[1]

یہ آیت اسلام کے بنیادی اجتماعی مسائل کی ایک منطق کو واضح کرتی ہے۔ آیت صراحت سے کہتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے اعمال کے معاملے میں ترغیب دینے اور رہنمائی کے عمل میں شریک ہیں اس بنا پر جب بھی کوئی بات یا عمل بلکہ انسان کی خاموشی بھی اگر کسی گروہ کے نیک یا بُرے عمل کی ترغیب کا باعث بنے تو ترغیب دینے والا اس کام کے نتائج کے قابل ذکر حصہ کا ذمہ دار ہو گا۔ لیکن اس سے اصل کام کرنے والے کا حصہ کم نہیں ہو جائے گا۔

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من امر بمعروف او نهى عن منكر او دل على خير او اشار به فهو شريك ومن امر بسوء او دل عليه او اشار به فهو شريك .

جو شخص کسی اچھے کام کا حکم دے یا بُرے کام سے روکے یا لوگوں کے لیے عمل خیر کی رہنمائی کرے یا ترغیب دلانے کے لیے کوئی ایسے اسباب فراہم کرے وہ اس عمل میں شریک اور حصہ دار ہے اور اسی طرح جو شخص کسی بُرے کام کی دعوت دے یا اس کی رہنمائی کرے اور ترغیب دے وہ بھی اس کام میں شریک ہو گا۔

اس حدیث میں تین مرحلوں میں لوگوں کو نیک یا بد کام کی دعوت دینے کا ذکر ہوا ہے۔

---

[1] کفل (بروزن طفل) اصل میں جانور کی پشت کا عقبی اور آخری حصہ ہے جس پر سوار ہونا تکلیف اور سختی کا باعث ہے اس لیے ہر قسم کے گناہ اور بُرے حصہ کو کفل کہتے ہیں اور ایسے کام کو بھی جس میں بوجھ اور زحمت ہو، کفالت کہتے ہیں۔



۱۔ مرحلہ حکم

۲۔ مرحلہ دلالت

۳۔ مرحلہ اشارہ

یہ تینوں ترتیب وار قوی، متوسط اور کمزور مرحلے ہیں اس طرح ہر قسم کی دخل اندازی کسی نیک یا برے کام پر ابھارنے کا سبب بنتی ہے اور دخل اندازی کرنے والا اسی نسبت سے اس کے نتائج اور فوائد میں شریک ہوگا۔

اس اسلامی منطق کے مطابق صرف گناہ کرنے والے ہی گنہگار نہیں ہیں بلکہ وہ اشخاص جو کسی کام کی تبلیغ کے مختلف ذرائع استعمال کرکے حالات پیدا کریں۔ یہاں تک کہ ذرا سی ترغیب دلانے والے کا ایک لفظ بھی اسے گناہ کرنے والوں میں شامل کر لیتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو خیرات اور نیکی اور نیکیوں کے راستے میں اس قسم کا کام کرتے ہیں وہ بھی اس کا اجر حاصل کرتے ہیں۔

چند ایک روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شفاعت حسنہ یا سیئہ کے معنی میں سے ایک کسی کے حق میں اچھی یا بری دعا کرنا بھی ہے جو کہ بارگاہِ خداوندی میں ایک قسم کی شفاعت ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:۔

من دعا لاخیه المسلم بظهر الغیب استجیب له و قال له الملك فلك مثلاه فذلك النصیب۔

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کے پس پشت دعا کرے تو وہ قبول ہوگی اور خدا کا فرشتہ اس سے کہے گا اس سے دوگنا تمہارے لیے بھی ہے اور آیت میں نصیب سے مراد یہی ہے۔[1]

یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی بلکہ شفاعت کے معنی میں وسعت سے یعنی جو مسلمان کسی دوسرے کی کسی طرح کی مدد کرے وہ چاہے نیکی کی ترغیب کی صورت میں ہو یا بارگاہِ خداوندی میں دعا کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح سے اس کے نتیجہ میں شریک ہوگا۔ یہ بات اسلامی پروگراموں کی روحِ اجتماعیت کو اجاگر کرتی ہے اور مسلمانوں کو شخصی اور فقط ذاتی حیثیت سے زندگی گزارنے سے منع کرتی ہے۔

یہ امر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ انسان دوسروں کی طرف توجہ اور ان کی بہتری کی کوششوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا اور اس سے اس کا ذاتی مفاد خطرے میں نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ اس کے نتائج میں شریک ہوتا ہے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خدا توانا اور صاحبِ قدرت ہے اور تمہارے اعمال کی حفاظت کرتا اور حساب رکھتا ہے اور حسنات و سیئات کے نتیجے میں مناسب جزا و سزا دے گا (وکان اللہ علیٰ کل شیء مقیتًا) خیال رہے کہ "مقیت" اصل میں "قوت" کے مادہ سے ہے جس کے معنی اس غذا کے ہیں جو انسان کی جان کی حفاظت کرتی ہے اس بنا پر "مقیت" جو باب افعال کا

---

[1] تفسیر صافی آیہ مذکور کے ذیل میں۔



اسم فاعل ہے اس شخص کے معنی میں ہے جو دوسروں کو روزی دیتا ہے، چونکہ ایسا شخص اس کی زندگی کا محافظ ہوتا ہے اس لیے لفظ "مقیت" محافظ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز وہ شخص جو روزی دیتا ہو یقیناً اس پر قدرت اور طاقت بھی رکھتا ہے اسی بناء پر یہ لفظ مقتدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ایسا شخص یقیناً اپنے زیر کفالت لوگوں کا حساب بھی رکھتا ہے اسی وجہ سے یہ لفظ حسیب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اوپر والی آیت میں ممکن ہے کہ لفظ "مقیت" سے یہ تمام مفاہیم مراد لیے گئے ہوں۔

۸۶۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا ○

ترجمہ

۸۶۔ جس وقت کوئی شخص تمھیں تحیہ (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم از کم) اسی طرح کا جواب دو، خدا ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔

تفسیر

احترامِ محبت

اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات کی مباحث جہاد سے متعلق تھیں اور اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر دشمن دوستی اور مصالحت چاہیں تو تم بھی مناسب جواب دو لیکن واضح ہے کہ یہ تعلق اس سے مانع نہیں کہ ایک کلی اور عمومی حکم تمام تحیات اور نوازشات کے اظہار سے تعلق ہو جو مختلف افراد کی طرف سے ہو۔ آیت کی ابتدا میں آیا ہے جب کوئی شخص تمھیں تحیہ کہے تو اس کا جواب بہتر طریقہ سے دو یا کم از کم اس کے مساوی جواب دو۔ (واذا حييتم بتحية فحيوا باحسن منها او ردوها) تحیت لغت میں حیات کے مادہ سے دوسرے کے لیے حیات وزندگی کی دعا کرنے کے معنی میں ہے چاہے یہ دعا "سلام علیک" کی صورت میں ہو (خدا تجھے سلامت رکھے) یا حیاک اللہ (خدا تجھے زندہ رکھے) یا اس قسم کے اور الفاظ سے ہو لیکن عام طور پر یہ ہر قسم کے اظہار محبت کے لیے ہے جو لوگ الفاظ کے ذریعہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں جس کا واضح ترین اظہار سلام کرنا ہے لیکن کچھ روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ عملی اظہار محبت بھی مفہوم تحیت میں شامل ہے۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ سے منقول ہے:

المراد بالتحية فی الاية السلام وغيره من البر

آیت میں محبت سے مراد سلام اور ہر قسم کی نیکی کرنا ہے۔

کتاب مناقب کی ایک روایت میں ہے:



ایک کنیز نے پھول کی ایک شاخ امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی تو اس کے جواب میں امامؑ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب آپؑ سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ خدا نے ہمیں یہی حسن سلوک سکھاتے ہوئے فرمایا ہے و اذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا۔

اس کے بعد مزید فرمایا: بہتر تحیہ وہی اس کا آزاد کرنا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت ایک کلی حکم اور ہر قسم کے اظہار محبت کا جواب دینے کے سلسلہ میں ہے چاہے وہ زبانی ہو یا عملی۔ آیت کے آخر میں اس لیے کہ لوگ جان لیں کہ تحیات ان کے جوابات اور ان کی برتری و مساوات، جس قدر اور جیسے ہوں، خدا سے پوشیدہ پنہاں نہیں ہیں۔ فرماتا ہے: خدا تمام چیزوں کے حساب سے آگاہ ہے (ان اللہ کان علی کل شیء حسیبًا)

سلام عظیم اسلامی تحیہ ہے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کی تمام ملل و اقوام کے افراد جب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو ایکدوسرے سے اظہارِ محبت کے لیے کچھ تحیہ پیش کرتے ہیں جو بعض اوقات لفظی ہوتا ہے اور کبھی عملی بھی۔ عمل عموماً تحیت کی علامت ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی "سلام" ایک واضح ترین تحیت ہے اور اوپر والی آیت جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے تحیہ اگرچہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے تاہم اس کا ایک واضح اظہار سلام کرنا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے مطابق تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ سلام کا عالی تر یا کم از کم مساوی جواب دیں۔

آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام تحیت کی ایک قسم ہے سورۂ نور کی آیہ ۶۱ میں ہے:

فاذا دخلتم بیوتاً فسلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ

جب تم کہیں داخل ہو تو ایک دوسرے پر تحیتِ الٰہی بھیجو، وہ تحیہ جو مبارک اور پاکیزہ ہے۔

اس آیت میں سلام کو مبارک اور پاکیزہ خدائی تحیہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور ضمنی طور پر اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سلام علیکم کا معنی اصل میں سلام اللہ علیکم ہے "یعنی پروردگار کا تم پر سلام ہو" یا خدا تمھیں سلامت رکھے۔ اسی سبب سے سلام کرنا ایک قسم کا دوستی، صلح اور جنگ نہ کرنے کا اعلان ہے۔ قرآن کی کچھ آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بہشت کا تحیہ بھی سلام ہے۔

اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا ویلقون فیہا تحیۃ وسلامًا

"اہل بہشت اپنی استقامت اور صبر کی وجہ سے بہشت کے انعامات اور بلند مقامات سے بہرہ یاب ہوں گے اور انھیں تحیہ و سلام سے نوازا جائے گا۔"

(فرقان - ۷۵)

سورہ ابراہیم کی آیۃ ۲۳ اور سورۂ یونس کی آیہ ۱۰ میں بھی اہلِ بہشت کے بارے میں ہے:



تحیتھم فیھا سلام

"اُن کا تحیہ بہشت میں سلام ہے۔"

آیاتِ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحیت بمعنی سلام (یا اس کے مفہوم کا کچھ متبادل) گزشتہ اقوام میں بھی مروج تھا جیسا کہ سورۂ ذاریات کی آیہ ۲۵ میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے کہ جب قوم لوطؑ کو سزا و عذاب دینے والے فرشتے بھیس بدل کر ابراہیمؑ کے پاس آئے تو آپؑ پر سلام کہا اور آپؑ نے بھی ان کے سلام کا جواب دیا۔

اذ دخلوا علیه فقالوا سلامًا قال سلام قوم منکرون

زمانہ جاہلیت کے عربی اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحیت سلام کے ذریعہ اس زمانہ میں بھی تھی [۱]

جب ہم غیر جانبدارانہ طور پر اس اسلامی تحیت کا مختلف اقوام کی تحیت کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت ہم پر زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اسلامی تحیت خدا کی طرف توجہ بھی ہے مخاطب کے لیے سلامتی کی دعا بھی اور صلح و امن کا اعلان بھی ہے۔ اسلامی روایات میں سلام کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من بدء بالکلام قبل السلام فلا تجیبوہ

جو شخص سلام سے پہلے گفتگو شروع کر دے اس کا جواب نہ دو [۲]

امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ خدا فرماتا ہے:

البخیل من بخیل بالسلام

بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے۔ [۳]

دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

ان اللہ عزوجل یحب افشاء السلام

افشاء سلام — سلام عام کرنے والے کو خدا دوست رکھتا ہے۔ [۴]

افشاء سلام سے مراد مختلف افراد کو سلام کرنا ہے۔ احادیث میں سلام کے بارے میں بہت سے آداب بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ سلام کے بارے میں بہت سے آداب بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ سلام صرف ان افراد سے مخصوص نہیں ہے جن سے انسان خصوصی شناسائی رکھتا ہو جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال ہوا:

"کون سا عمل بہتر ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا:

"تطعم الطعام وتقرء السلام علی من عرفت ومن لم تعرف"

کھانا کھلاؤ اور سلام کرو اس شخص کو جسے تم جانتے ہو یا نہیں جانتے۔ [۵]

---

[۱] ولو ان لیلی الاخیلیة سلمت علی ودونی جندل وصفائح ؛ لسلمت تسلیم البشاشة او زقا الیها صدی من جانب القبر صائح
یہ شعر زمانہ جاہلیت کے توبہ نامی شاعر کے ہیں۔ [۲] اصول کافی جلد ۲ باب تسلیم [۳]، [۴] اصول کافی۔ جلد ۲۔ باب تسلیم
[۵] تفسیر فی ظلال ذیل آیہ مذکورہ۔



احادیث میں بھی آیا ہے کہ سوار پیادہ کو اور بیش قیمت سواری والا کم قیمت سواری والوں کو سلام کریں گویا یہ حکم ایسے تکبر کا مقابلہ کرنے کے لیے ہے جو دولت، ثروت اور مخصوص مادی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات آج کل دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ آداب وسلام کو نچلے طبقہ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور انھوں نے اسے استعمار، استبداد اور بت پرستی کی شکل دے رکھی ہے اگر ہم پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ تمام لوگوں کو یہاں تک کہ بچوں کو بھی سلام کرتے تھے۔ البتہ یہ بحث اس حکم سے اختلاف نہیں رکھتی جو بعض روایات میں آیا ہے کہ بچے جو عمر کے لحاظ سے چھوٹے ہوتے ہیں وہ اپنے سے بڑوں کو سلام کریں کیونکہ ادب اور احترام کا تقاضا یہی ہے اس بات کا طبقاتی تفاوت اور مادی حیثیت کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔

چند روایات میں حکم دیا گیا ہے کہ سود خور، فاسق، گبرو اور منحرف وغیرہ پر سلام نہ کرو۔ یہ بھی فساد اور برائی کے خلاف ایک طرح کا اقدام ہے ہاں البتہ ایسے لوگوں سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے یا رابطے کے لیے تاکہ انھیں خدائی نافرمانی سے بچنے کی دعوت دی جاسکے سلام کرنے کی اجازت ہے "تحیت باحسن" سے مراد یہ ہے کہ سلام کی دوسری عبارات مثلاً ورحمۃ اللہ یا ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کو ساتھ ملانا۔

تفسیر در المنثور میں ہے:

> ایک شخص نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا "السلام علیک"۔ تو آپؐ نے فرمایا "وعلیک السلام ورحمۃ اللہ" دوسرے نے عرض کیا "السلام علیک ورحمۃ اللہ" تو آپؐ نے فرمایا "وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ تیسرے شخص نے کہا "السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ تو پیغمبرؐ نے فرمایا "وعلیک" جب اس نے سوال کیا کہ آپؐ نے مجھے مختصر جواب کیوں دیا ہے تو فرمایا۔ قرآن کہتا ہے تحیہ کا جواب زیادہ بہتر طریقہ سے دو لیکن تو نے کوئی چیز باقی نہیں رکھی۔[1]

حقیقت میں پیغمبرؐ نے پہلے اور دوسرے شخص کے جواب میں احسن طریقہ پر تحیہ کیا ہے لیکن تیسرے شخص کے بارے میں مساوی طریقہ اختیار کیا ہے کیونکہ "وعلیک" کا مفہوم ہے کہ جو کچھ تو نے کہا وہ تیرے لیے بھی ہو۔

۸۷۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيۡثًا ۠

ترجمہ

۸۷۔ وہ خدا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تم سب کو یقینی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک نہیں

---

[1] در المنثور جلد ۲ صفحہ ۸



جمع کرے گا اور کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

درج بالا آیت گذشتہ آیات کی تکمیل اور بعد میں آنے والی آیات کا مقدمہ ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں "تحیت" کے حکم کے بعد فرمایا ہے کہ خدا تمھارے اعمال کا حساب رکھتا ہے اس آیت میں مسئلہ قیامت اور روز قیامت ہونے والی عام عدالت کا ذکر ہے اور اسے مسئلہ توحید اور خدا کی یکتائی کے مسئلہ کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے جو کہ ایمان کا ایک اور رکن ہے۔ فرماتا ہے، کوئی معبود اس کے علاوہ نہیں ہے اور لازمی طور پر تمھیں قیامت کے دن اکٹھا مبعوث کرے گا وہی قیامت کا دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے (اللہ لا الٰہ الا ھو لیجمعنکم الی یوم القیٰمۃ لا ریب فیہ) "یجمعنکم" کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام افراد کے لیے روز محشر ایک ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کے آخر میں آیہ ۹۳ سے لے کر ۹۵ تک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ خدا کے تمام بندے چاہے وہ اہل زمیں ہوں یا دوسرے کرات کے رہنے والے، سب ایک ہی دن مبعوث ہوں گے۔

لَا رَیْبَ فِیْہِ (اس میں کوئی شک و شبہ نہیں) قیامت کے آنے کے بارے میں اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں یہ تعبیر ان قطعی اور مسلم دلائل کی طرف اشارہ ہے جو اس دن قیامت کی خبر دیتے ہیں مثلاً قانون تکامل، تخلیق کا حکمت و فلسفہ اور قانون عدالت پروردگار معاد کی بحث میں ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے آخر میں اس مطلب کی تاکید کے لیے فرماتا ہے کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہے (و من اصدق من اللہ حدیثا)

لہٰذا وہ جس قسم کا وعدہ روز قیامت یا اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں کرتا ہے اس پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ جھوٹ کا سرچشمہ جہالت ہے یا کمزوری اور ضرورت مندی ہے لیکن وہ خدا جو سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور سب سے بے نیاز ہے، وہ سب سے زیادہ سچا ہے اور اصولی طور پر جھوٹ اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

۸۸۔ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ
اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝

ترجمہ

۸۸۔ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ کیوں ہو گئے ہو، کچھ ان سے جنگ کرنے کو ممنوع اور کچھ جائز سمجھتے ہو حالانکہ خدا نے ان کے اعمال کی بنا پر ان کے افکار پلٹ کر رکھ دیئے ہیں کیا تم چاہتے ہو ایسے اشخاص کو جنھیں خدا نے



(ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے) گمراہ رکھا ہے ہدایت کرو، حالانکہ جسے خدا گمراہ رکھے اس کے لیے تمھیں کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ابنِ عباس سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقت میں منافقین کی صف میں سے تھے اسی لیے وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنا نہیں چاہتے تھے اور عملی طور پر بُت پرستوں کے خیر خواہ اور مددگار تھے، لیکن آخرکار مکہ کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے (تاکہ وہ مدینہ کے قریب آجائیں اور شاید اپنی خصوصی حیثیت کی وجہ سے جاسوسی کے مقصد کے لیے انھوں نے ہجرت کی ہو) اور وہ خوش تھے کہ انھیں مسلمان اپنے میں سے سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا خیال تھا کہ مدینہ میں داخل ہونا ان کے لیے قدرتی طور پر کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کو اس بات کا پتہ چل گیا لیکن بہت جلد منافقین سے سلوک کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ ان کو دھتکار دیا جائے کیونکہ حقیقت میں یہ دشمنانِ اسلام کے مددگار ہیں لیکن کچھ مسلمان ظاہر بین اور سادہ لوح تھے وہ اس کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ ہم کس طرح ایسے لوگوں سے محاذ آرائی کریں جو توحید اور رسالت کی گواہی دیتے ہیں اور صرف ہجرت نہ کرنے کے جرم میں اُن کے خون کو مباح اور حلال قرار دیں۔ اس پر درج بالا آیت نازل ہوئی جس میں دوسرے گروہ کو اس غلط فہمی پر ملامت کی گئی اور پھر ان کی رہنمائی بھی کی گئی۔[1]

تفسیر

مندرجہ بالا شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت اور بعد والی آیت کا منافقین سے متعلق گذشتہ آیات سے ربط مکمل طور پر واضح ہوتا ہے آیت کی ابتدا میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: منافقین کے بارے میں کیوں بٹ گئے ہو اور تم میں سے ہر ایک جدا فیصلہ کرتا ہے (فما لکم فی المنافقین فئتین)۔[2]

یعنی یہ افراد جو ہجرت نہ کرنے اور مشرکین کے شریک کار رہنے اور مجاہدینِ اسلام کی صف میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے اپنے نفاق کو ظاہر کر چکے ہیں ان کے اعمال اور انجام کے بارے میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ یہ لوگ اوّل درجہ کے منافقین ہیں تو پھر بعض لوگ کیوں ان کے اظہار توحید اور خدا پر ایمان لانے کے دعویٰ سے دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی شفاعت و سفارش کرتے ہیں جبکہ گذشتہ آیات میں بتایا جا چکا ہے کہ من یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا اور

---

[1] اس آیت اور بعد والی آیات کی اور بھی شانِ نزول بیان کی گئی ہے انھی میں سے بعض میں اس کو جنگ احد کے واقعہ سے مربوط سمجھا گیا ہے حالانکہ بعد والی آیات، جو ہجرت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اس سے مربوط نہیں بلکہ اسی شانِ نزول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

[2] اوپر والے جملے میں حقیقتاً اور لفظ مخفی ہے جو بقیہ جملہ پر توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے اور اصل جملہ یوں بنتا ہے فما لکم تفرقتم فی المنافقین فئتین۔



اس طرح وہ اپنے آپ کو ان کے بُرے انجام میں کیوں شریک کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ منافقین کے اس گروہ سے ان کے بُرے اور شرمناک اعمال کی وجہ سے خدا نے اپنی حمایت اور توفیق منقطع کر لی ہے اور منصوبے مکمل طور پر ناکام کر دیئے ہیں اور ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص پاؤں پر کھڑا ہونے کی بجائے سر کے بل کھڑا ہو (واللہ ارکسھم بما کسبوا)[1]

ضمنی طور پر "بما کسبوا" سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت، سعادت، اور نجات کے راستے سے ہٹ جانا انسان کے خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اور اگر اس عمل کو خدا سے نسبت دی جائے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ خدا حکیم ہے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق سزا دیتا ہے اور لیاقت واہلیت کی مناسبت سے اسے جزا بھی دے گا۔ آیت کے آخر میں سادہ لوح افراد کو، جو منافقین کے اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو جنہیں خدا نے ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ہدایت سے محروم کر دیا ہے ہدایت کرو حالانکہ یہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں (اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا) کیونکہ یہ تو خدا کی انمٹ سنت ہے کہ کسی شخص کے اعمال کے اثرات اس سے جُدا نہیں ہوں گے تو تم یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ وہ افراد جن کی نیت صحیح نہیں اور جن کے دلوں میں نفاق بھرا ہوا ہے اور جو عملاً خدا کے دشمنوں کی حمایت کرتے ہیں انھیں ہدایت نصیب ہوگی یہ تو بے جا اور غیر منطقی توقع ہے۔[2]

۸۹۔ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۸۹۔ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ اور پھر وہ اور تم ایک دوسرے کے برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ مگر یہ کہ (وہ توبہ کریں اور) خدا کی راہ میں ہجرت کریں۔ لیکن وہ لوگ جو کام سے منہ موڑ لیں (اور تمھارے خلاف اقدامات جاری رکھیں) انھیں جہاں پاؤ قید کر لو اور (اگر ضروری ہو تو) انھیں قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

تفسیر

گذشتہ آیت ان منافقین کے بارے میں تھی جن کی حمایت میں کچھ سادہ لوح مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انکی

---

[1] ارکسھم رکس (بروزن مکث) کے مادہ سے کسی چیز کو اوندھا کرنے کے معنی میں ہے اور بعض پھیرنے کے بھی معنی لیتے ہیں۔
[2] اس تفسیر کی پہلی جلد میں ہدایت وضلالت کے بارے میں مفصل بحث آچکی ہے۔



سفارش کرتے تھے جبکہ قرآن نے انھیں اسلام سے بیگانہ قرار دے دیا اور اب اس آیت میں فرماتا ہے: ان کے اندر اس قدر جہالت اور تاریکی ہے کہ نہ صرف وہ خود کافر ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ تاکہ ایک دوسرے کے مساوی ہو جاؤ (ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء) اس وجہ سے وہ تو عام کفار سے بھی بدتر ہیں۔ کیونکہ عام کافر دوسروں کے عقائد باطل کرنے کے درپے رہتے ہیں کیونکہ وہ ایسے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان میں سے کسی کو دوست نہ بنائیں (فلا تتخذوا منهم اولیاء) مگر یہ کہ وہ اپنے افعال سے باز آجائیں اور نفاق اور تخریب کاری سے دستبردار ہو جائیں اور اس کا ثبوت اور نشانی یہ ہے کہ وہ کفر اور نفاق کے مرکز سے اسلام کے مرکز (مکہ سے مدینہ) کی طرف ہجرت کریں (حتّٰی یهاجروا فی سبیل اللہ)۔

لیکن اگر وہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوں تو پھر سمجھ لو کہ وہ کفر و نفاق سے دستبردار نہیں ہوئے اور ان کا مسلمان کہلانا صرف جاسوسی اور تخریب کاری کی غرض سے ہے اور اس صورت میں وہ تمھیں جہاں کہیں بھی مل جائیں انھیں قید کر لو یا اگر ضروری ہو تو انھیں قتل کر دو (فان تولوا فخذوهم واقتلوهم حیث وجدتموهم)۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ کبھی ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ (ولا تتخذوا منهم ولیًا ولا نصیرًا)۔

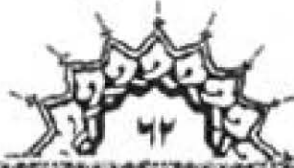
درج بالا آیت میں منافقین کے اس گروہ کے بارے میں جو سخت احکام آئے ہیں اس وجہ سے ہیں کہ ایک زندہ معاشرے کی تشکیل کے لیے جو اصلاح کے راستے پر چلتا ہے ایسے دوست نما خطرناک دشمن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ اسلام غیر مسلم افراد (مثلاً یہود و نصاریٰ) سے چند شرائط کے ساتھ صلح کی اجازت دے دیتا ہے اور ان سے کوئی تعرض نہ کرنے کے لیے تیار ہے مگر منافقین کے اس گروہ کے بارے میں اس قدر شدت سے کام لیتا ہے۔ بظاہر وہ مسلمان ہیں پھر بھی انھیں قید کرنے بلکہ بوقت ضرورت ان کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ اس امر کی اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسے افراد اسلام کے پردے میں اسلام کو ایسی گزند پہنچا سکتے ہیں جیسی کوئی دشمن نہیں پہنچا سکتا۔

ایک سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ کا منافقین کے بارے میں یہ رویہ تھا کہ آپ کبھی ان کے قتل کا حکم نہیں دیتے تھے کہ دشمن کہیں آپ کو اپنے اصحاب کے قتل میں ملوث نہ کریں یا کچھ لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ذاتی دشمنوں کو منافق کہہ کر ان سے نہ الجھیں اور انھیں قتل نہ کر دیں۔

جواب

توجہ رہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا یہ رویہ صرف مدینہ کے منافقین اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں تھا جو بظاہر مسلمان تھے، لیکن



وہ لوگ جو مکہ کے منافقین کی طرح واضح طور پر اسلام دشمنوں سے ملے ہوئے تھے وہ اس حکم میں شامل نہیں تھے ۔

۹۰۔ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۹۰۔ مگر وہ لوگ جنھوں نے تمھارے ہم پیمان لوگوں سے عہد و پیمان باندھا ہے یا وہ جو تمھاری طرف آتے ہیں اور تم سے جنگ کرنے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے سے عاجز ہیں (نہ تم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم سے لڑنے کی طاقت رکھتے ہیں) اور اگر خدا چاہے تو انھیں تم پر مسلط کر دے تاکہ وہ تم سے جنگ کریں (اب جبکہ انھوں نے صلح کی پیشکش کی ہے تو خدا انھیں اجازت نہیں دیتا کہ ان سے تعرض کرو۔

شانِ نزول

مختلف روایات سے جو آیت کی شان نزول کے بارے میں آئی ہیں اور مفسرین نے ہر قسم کی تفاسیر میں انھیں نقل کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبائل عرب میں دو قبیلے "بنی حمزہ" اور "اشجع" نام کے تھے ان میں سے پہلے قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا عہد کیا تھا اور قبیلہ اشجع نے بھی بنی حمزہ سے ایسا معاہدہ کر رکھا تھا ۔ بعض مسلمان بنی حمزہ کی طاقت اور عہد شکنی سے خوفزدہ تھے لہٰذا انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو تجویز پیش کی کہ اس سے پہلے کہ وہ حملہ آور ہوں مسلمان ان پر حملہ کر دیں ۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا :

"کلا فانهم ابر العرب بالوالدين و اوصلهم للرحم اوفاهم بالعهد"

نہیں کبھی یہ کام نہ کریں کیونکہ وہ تمام قبائل عرب میں اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنیوالے ہیں اور اپنے عزیز و اقارب پر سب سے زیادہ مہربان ہیں اور بہتر ایفائے عہد کرنے والے ہیں ۔

کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ اشجع قبیلے کے سات سو افراد مسعود بن رجیلہ کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب پہنچ چکے ہیں ۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے نمائندے ان کے پاس بھیجے کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے لیے آئے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ کو یہ معلوم ہوا تو حکم دیا کہ بہت سی مقدار میں کھجوریں تحفہ کے طور پر ان کے پاس لے جاؤ اس کے بعد حضورؐ نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہم آپ کے دشمنوں سے مقابلے کی



سکت نہیں رکھتے کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور دوسری طرف آپ سے مقابلے کی ہم طاقت رکھتے ہیں نہ آپ سے ہم لڑنا چاہتے ہیں ۔ کیونکہ ہماری سکونت آپ کے قریب نہیں ہے لہٰذا ہم اس لیے آئے ہیں کہ آپ سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں ۔ اس موقع پر درج بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس ضمن میں مسلمانوں کو ضروری احکام جاری کیے گئے ۔ چند ایک روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا ایک حصہ قبیلہ "بنی مدلج" کے بارے میں نازل ہوا ہے وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم نہ تو آپ کے ہم نوا ہیں اور نہ ہی آپ کے مخالف کوئی قدم اٹھائیں گے ۔

پیغمبر اکرمؐ نے ان سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا ۔

تفسیر

صلح کی پیش کش کا استقبال

ان منافقین کے لیے جو دشمنان اسلام کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اس سخت حکم کے بعد زیر نظر آیت میں حکم دیتا ہے کہ اس قانون سے دو گروہ مستثنیٰ ہیں :

۱ جو تمھارے کسی ہم پیمان کے ساتھ مربوط ہیں اور انھوں نے اس سے معاہدہ کر رکھا ہے (الا الذین یصلون الی قوم بینکم و بینھم میثاق)۔

۲ وہ جو اپنی مخصوص حالت کی وجہ سے ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ نہ تو وہ تمھارے ساتھ مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں نہ تمھارا ساتھ دے سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے قبیلہ سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں (او جاءوکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم)۔

ظاہر ہے کہ پہلے گروہ کو معاہدے کے احترام کی وجہ سے اس قانون سے مستثنیٰ ہونا چاہیے اور دوسرا گروہ بھی اگرچہ مقدور نہیں ہے اسے چاہیے کہ حق کی تلاش کے بعد اس سے اپنا رشتہ جوڑ لے ۔ لیکن چونکہ وہ غیر جانبدار رہنے کا اعلان کرتا ہے لہٰذا اس پر اعتراض کرنا عدل اور مردانگی کے اصولوں کے خلاف ہے اس کے بعد اس بنا پر کہ مسلمان اپنی شاندار کامیابیوں پر مغرور نہ ہو جائیں اور انھیں اپنی لشکری قوت اور مہارت کا مرہون منت سمجھیں اس غیر جانبدار گروہ کے مقابلہ میں ان کے انسانی جذبات کو تحریک دیتے ہوئے فرماتا ہے : اگر خدا چاہے توان (کمزور) لوگوں کو تم پر مسلط کر سکتا ہے تاکہ وہ تم سے برسرپیکار ہوں (ولو شاء اللہ لسلطھم علیکم فلقاتلوکم) لہٰذا ہمیشہ کامیابیوں پر اپنے خدا کو نہ بھولو اور کسی جہت بھی اپنی طاقت پر غرور نہ کرو ۔ نیز کمزور لوگوں کو معاف کرنے کو اپنے نقصان میں نہ سمجھو ۔ آیت کے آخر میں دوبارہ آخری گروہ کے لیے تاکید زیادہ واضح انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے : اگر وہ تم سے جنگ نہ کریں اور صلح و مصالحت کی پیش کش کریں تو خدا تمھیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ تمھارا فرض ہے کہ جو ہاتھ صلح کے لیے تمھاری طرف بڑھے اسے مضبوطی سے تھام لو (فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا)



قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں اور چند دوسری آیات میں صلح کی پیش کش کو " القاءِ سلام " " صلح پھینکنا " قرار دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ طرفین نزاع، صلح سے پہلے عموماً ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں یہاں تک صلح کی پیش کش کو بھی بڑے محتاط ہو کر دیکھتے ہیں گویا ایک دوسرے سے فاصلہ پر رہتے ہوئے اس پیش کش کو ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں۔

٩١۔ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ ۚ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا ۚ فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُبِينًا ۝

ترجمہ

٩١۔ بہت جلد تم کچھ ایسے لوگوں سے ملو گے جو چاہتے ہیں کہ تمھاری طرف سے بھی امان میں ہوں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی مامون ہوں (یہ مشرک ہیں لہٰذا تمھارے سامنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں) لیکن جس وقت وہ فتنہ (اور بت پرستی) کی طرف پلٹ جاتے ہیں تو وہ سر کے بل اس میں ڈوب جاتے ہیں اگر وہ تم سے الجھنے سے کنارہ کش نہ ہوئے اور انھوں نے صلح کی پیش کش نہ کی اور تم سے دستبردار نہ ہوئے تو انھیں جہاں کہیں پاؤ قید کر لو (یا) انھیں قتل کر دو اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ہم نے تمھارا واضح تسلط قرار دیا ہے۔

شانِ نزول

درج بالا آیت کے لیے مختلف شانِ نزول منقول ہوئے ہیں زیادہ مشہور ان میں سے یہ ہے کہ اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دھوکے بازی اور چالبازی کے طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا۔ لیکن جب بھی وہ قریش اور ان کے بتوں کے سامنے جاتے تو ان کے بتوں کی عبادت اور پرستش شروع کر دیتے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ وہ اسلام اور قریش دونوں سے محفوظ رہیں، دونوں طرف سے فائدہ اٹھائیں اور کسی سے انھیں نقصان نہ پہنچے۔ اصطلاح کے مطابق دونوں گروہوں سے دو طرفہ تعلقات استوار رکھیں۔ اس پر زیر نظر آیت نازل ہوئی جس میں اس گروہ کے خلاف سخت کارروائی کا حکم دیا گیا۔



تفسیر

طرفین سے ساز باز رکھنے والوں کی سزا

یہاں ایک اور گروہ سے تعارف ہوتا ہے جو سراسر اس گروہ کے مخالف ہے جس کے بارے میں گذشتہ آیات میں صلح کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان آزادی سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے دھوکے اور خیانت کی راہ اختیار کر رکھی ہے وہ دونوں گروہوں سے ہم قدم اور ہم فکر ہونے کا اظہار کرتے ہیں (ستجدون اخرین یریدون ان یأمنوکم و یأمنوا قومھم) اسی وجہ سے جب فتنہ سازی اور بُت پرستی کا موقع ان کے ہاتھ آتا ہے تو ان کے سارے پروگرام اُلٹے ہو جاتے ہیں اور سر کے بل بت پرستی میں ڈوب جاتے ہیں (کلما ردوا الی الفتنة ارکسوا فیھا)۔ یہ پہلے گروہ کے بالکل برعکس ہیں کیونکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ یہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں۔ جب کہ ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں سے الجھتے رہیں وہ صلح کی پیش کش کرتے تھے جبکہ یہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے وہ مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتے تھے لیکن یہ ظلم وجور سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ یہ تینوں فرق جن کی طرف (فان لم یعتزلوکم ویلقوا الیکم السلم ویکفوا ایدیھم) میں اشارہ ہوا ہے اس امر کا سبب ہیں کہ ان کے بارے میں حکم پہلے گروہ سے مکمل طور پر مختلف حکم ہو مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انھیں جہاں کہیں پائیں اسیر کرلیں اور مقابلہ کرنے کی صورت میں قتل کردیں (فخذوھم واقتلوھم حیث ثقفتموھم) لہٰذا جہاں ان کے لیے کافی اتمامِ حجت کیا گیا ہے وہاں آیت کے آخر میں یہ بھی فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہم نے واضح طور پر ان پر تمھارا تسلط قائم کیا ہے۔ (واولئکم جعلنا لکم علیھم سلطانًا مبینًا)۔

زیرِ بحث آیت میں جس تسلط کی طرف اشارہ ہے ہو سکتا ہے یہ تسلط منطقی لحاظ سے ہو کیونکہ مسلمانوں کی منطق مشرکین کی منطق پر غالب تھی یا یہ بھی ہو سکتا ہے ظاہری اور خارجی لحاظ سے ہو کیونکہ جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت مسلمان بہت حد تک طاقت ور ہو چکے تھے۔

درج بالا آیت میں "ثقفتموھم" کی تعبیر ممکن ہے ایک دقیق نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یہ لفظ ثقافت کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے کسی چیز کا مشکل سے اور مہارت سے ہاتھ آنا اور "وجدتموھم" وجدان کے مادہ سے صرف ہاتھ آنے کے معنی میں ہے ان دونوں کا مفہوم مختلف ہے گویا منافقین کا یہ گروہ (جو دوغلہ ہے) دونوں سے تعلقات رکھتا ہے یہ منافقین کا خطرناک ترین گروہ ہے ممکن نہیں کہ انھیں آسانی سے پہچان لیا جائے اور وہ کسی جال میں پھنس جائے لہٰذا فرماتا ہے: اگر مہارت اور مشکل سے ان پر قبضہ کرلو تو انھیں خدا کا حکم سناؤ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انھیں گرفتار کرنا کٹھن اور مشکل کام ہے۔

٩٢۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا



فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ وَّدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهۡلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّصَّدَّقُوۡا ؕ
فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ؕ وَ
اِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَیۡنَكُمۡ وَبَیۡنَهُمۡ مِّیۡثَاقٌ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ وَ
تَحۡرِیۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَهۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ ۫
تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا ○

ترجمہ

۹۲۔ کسی صاحبِ ایمان فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صاحبِ ایمان کو قتل کرے مگر یہ کہ یہ کام غلطی اور اشتباہ میں اس سے سرزد ہو جائے اور پھر جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کیا ہے اسے چاہیے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے اور خون بہا مقتول کے گھر والوں کو دے مگر یہ کہ وہ خون بہا بخش دیں اور اگر مقتول ایسے گروہ سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں (اور کافر ہیں) لیکن قاتل خود مومن تھا تو چاہیے (کہ صرف) ایک غلام آزاد کرے (اور خونبہا ادا کرنا ضروری نہیں ہے) اور اگر ایسے گروہ میں سے تھا جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے تو چاہیے کہ اس کا خون بہا اس کے اہلِ خانہ کو دے اور ایک غلام (بھی) آزاد کرے اور جو شخص (غلام کے آزاد کرنے پر) دسترس نہیں رکھتا، وہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے۔ یہ (ایک قسم کی تخفیف اور) اللہ کے حضور توبہ ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

شانِ نزول

مکہ کے ایک بت پرست حارث بن یزید نے "ابوجہل" کی مدد سے ایک مسلمان "عیاش بن ابی ربیعہ" کو اسلام کی طرف مائل ہونے کی پاداش میں ایک عرصہ تک شکنجۂ ظلم میں جکڑے رکھا۔ مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد "عیاش" نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمانوں میں شامل ہو گیا۔ اتفاقاً ایک دن مدینہ کے قریب ایک محلہ میں اس کا سامنا اسے آزار دینے والے حارث بن یزید سے ہو گیا۔ عیاش نے موقع غنیمت جان کر حارث کو قتل کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے ایک دشمن کو قتل کیا ہے حالانکہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حارث توبہ کر کے مسلمان ہو چکا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا۔ یہ واقعہ آنحضرتؐ سے عرض کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس قتل کے بارے میں جو خطا سے اور اشتباہ میں ہو گیا



حکم بیان کیا گیا۔

تفسیر

قتلِ اشتباہ کے احکام

چونکہ گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو عملی طور پر اپنے اندرونی خطرناک دشمنوں (منافقین) کی سرکوبی کی اجازت دی گئی ہے تو اب اس بنا پر کہیں کچھ لوگ اس قانون سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے ذاتی دشمنوں کو منافقین کہہ کر قتل نہ کر دیں یا لاپرواہی سے کسی بے گناہ کا خون نہ بہا دیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں قتل اشتباہ اور قتل عمد کے احکام بیان ہوئے تاکہ قتل جو اسلام کے نزدیک نہایت سنگین معاملہ ہے اس کے بارے میں تمام لازمی پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھا جائے۔

اس آیت کی ابتدا میں کہ جس میں قتل اشتباہ کا ذکر ہے فرماتا ہے: کسی مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی صاحب ایمان شخص کو قتل کرے مگر یہ کہ اشتباہ میں ایسا ہو جائے (وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمناً الا خطأً) حقیقت میں یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر کوئی مومن یہ نہیں چاہتا کہ اپنے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین کرے، کیونکہ حریم ایمان میں تمام افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بدن انسانی کا ایک عضو دوسرے عضو کو سوائے اشتباہ کے کاٹ دے یا اسے کوئی آزار دی جائے۔ اس سبب سے جو اس قسم کے کام میں مشغول ہیں ان کا ایمان صحیح نہیں ہے اور حقیقت میں وہ ایمان سے بے بہرہ ہیں۔ (الا خطأً) (مگر غلطی سے) کے الفاظ اس معنی میں نہیں کہ انھیں اجازت ہے کہ شک کی بنا پر قتل جیسا عمل کریں کیونکہ شک و شبہ میں انسان دور تک نہیں دیکھ سکتا اور کوئی شخص شک کی حالت میں اپنے اشتباہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہے کہ مومنین شک و شبہ کی حالت کے علاوہ ایسا گناہ کبیرہ نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد قتل اشتباہ کا جرمانہ اور کفارہ تین مراحل میں بیان کیا گیا ہے:۔

پہلی صورت یہ ہے کہ "بے گناہ شخص جو شک اور شبہ میں قتل ہو گیا ہو، اگر وہ مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو اس صورت میں قاتل کے لیے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ غلام کو آزاد کرے اور دوسرا یہ کہ مقتول کا خون بہا مقتول کے وارثوں کو ادا کرے (ومن قتل مؤمناً خطأً فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة الی اھلہ)۔

مگر یہ کہ مقتول کے وارث دیت کو اپنی رضا اور رغبت سے چھوڑ دیں (الا ان یصدقوا)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقتول ایسے خاندان سے وابستہ ہو جو مسلمانوں سے دشمنی رکھتا ہو، تو اس صورت میں قتل اشتباہ کا کفارہ صرف غلام آزاد کرنا ہے اور ایسے گروہ کو دیت دینا ضروری نہیں کہ جو مالی طور پر مسلمانوں کے خلاف مضبوط ہو جائے۔ اس کے علاوہ اسلام ایسے شخص کو اپنے خاندان سے ربط رکھنے سے منع کرتا ہے جس کے خاندان میں سب کے سب اسلام کے دشمن ہوں اس بنا پر یہ نقصان کی تلافی کا مقام نہیں ہے (فان کان من قوم عدو لکم وھو مؤمن فتحریر رقبة مؤمنة)۔



تیسری صورت یہ ہے کہ مقتول کا خاندان ایسے کفار میں سے ہو جنھوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کر رکھا ہو۔ اس صورت میں معاہدہ کے احترام میں ایک غلام آزاد کرنے کے علاوہ مسلمان اس کا خون بہا اس کے پس ماندگان کو دیں (وان کان من قوم بینکم و بینھم میثاق فدیۃ مسلمۃ الی اھلہ و تحریر رقبۃ مؤمنۃ)۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ کیا مقتول اس صورت میں پہلی دونوں صورتوں کی طرح مرد مومن ہو گا یا یہ حکم کافر اور ذمی کے لیے بھی ہے لیکن بظاہر آیات اور روایات جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں ان کے مطابق اس سے مراد بھی "مقتول مومن" ہی ہے اور کیا اس قسم کے مسلمان مقتول کی دیت کافر وارث کو دی جا سکتی ہے جبکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔ آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ دیت اس کے ورثہ کو دی جائے گی چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں یہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاہدے کی بنیاد پر ہے۔ لیکن چونکہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا لہٰذا بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اوپر والے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس کی دیت و خون بہا صرف اس کے مسلمان وارثوں کو دیا جائے نہ کہ کفار وارثوں کو۔ بعض روایات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن من قوم بینکم و بینھم میثاق (ایسے گروہ سے جو تمھارے ساتھ معاہدہ رکھتے ہیں) کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارث مسلمان نہ ہوں، کیونکہ مسلمان ایک دوسرے سے معاہدہ نہیں کرتے (غور کیجیے گا)۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے بارے میں جو غلام آزاد کرنے کے بارے میں دسترس نہیں رکھتے (یعنی مالی طور پر استطاعت نہیں رکھتے یا آزاد کرنے کے لیے غلام ملتا ہی نہ ہو موجودہ زمانے کی طرح۔ فرماتا ہے ایسے افراد کو چاہیے کہ وہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے (فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین) آخر میں کہتا ہے: یہ غلام آزاد کرنے کی بجائے دو ماہ روزہ رکھنے کا حکم ایک قسم کی تخفیف اور خدا کے حضور توبہ ہے یا یہ کہ جو کچھ قتل اشتباہ کے کفارہ کے طور پر کہا گیا ہے اس سب کو خدا سے توبہ قرار دیا گیا ہے اور خدا ہمیشہ ہر چیز سے باخبر ہے اور اس کے تمام احکام حکمت کے مطابق ہیں (توبۃ من اللہ و کان اللہ علیما حکیما)۔

چند اہم نکات

خسارے کی تلافی کے لیے احکام

۱۔ یہاں قتل اشتباہ کی تلافی کے لیے تین موضوع بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک طرح سے خسارے اور نقصان کی تلافی ہے جو اس عمل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پہلا غلام آزاد کرنا ہے اصل میں ایک اجتماعی خسارے (ایک اہل ایمان کا قتل) کی تلافی ہے دوسرا دیت کا ادا کرنا ہے جو اصل میں ایک طرح سے اقتصادی خسارے کی تلافی ہے جو کہ ایک شخص کے قتل ہونے سے ایک خاندان کو ہوتا ہے ورنہ پہلے بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ دیت (خون بہا) کبھی بھی ایک انسان کے خون کی حقیقی قیمت نہیں ہو سکتی کیونکہ ایک بے گناہ انسان کا خون ہر طرح سے زیادہ قیمتی ہے بلکہ خاندان کے اقتصادی خسارے کی ایک طرح سے تلافی ہے۔ اور تیسرا دو ماہ مسلسل روزے رکھنے کا مسئلہ ہے جو کہ اخلاقی اور روحانی خسارے کی تلافی ہے، جو غلطی سے قتل کرنے والے کو نا

ہوتی ہے۔ البتہ خیال رکھنا چاہیے کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ایک با ایمان غلام کو آزاد کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ یعنی پہلے درجے میں صرف ایک غلام آزاد کرنا کافی ہے اور دوسرے درجے میں اگر ایسا غلام آزاد نہیں کر سکتے تو روزے رکھنا ہوں گے لیکن غور کرنا چاہیے کہ غلام آزاد کرنا ایک طرح کی عبادت شمار ہوتا ہے لہٰذا اس عبادت کا اثر آزاد کرنے والے کی روح پر ضرور ہوگا۔

۲۔ مسلمانوں میں دیت سے صرف نظر

جس مقام پر مقتول کے پس ماندگان مسلمان ہوں وہاں "الا ان یصدقوا" (مگر یہ کہ وہ دیت سے صرف نظر کرلیں) کا ذکر آیا ہے لیکن جس مقام پر وہ مسلمان نہ ہوں وہاں یہ بات نہیں۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ پہلے موقع پر اس کام کی کوئی بنیاد ہے لیکن دوسری جگہ اس قسم کی بنیاد نہیں ہے اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو ایسے مواقع پر غیر مسلموں کے احسان کا زیر بار نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ غیر مسلموں کے لیے دیت کا پہلے تذکرہ

قابل توجہ امر یہ ہے کہ پہلی صورت میں جبکہ پس ماندگان مسلمان ہوں پہلے "ایک غلام آزاد کرے" اور پھر "دیت" کا ذکر ہے۔ جبکہ تیسری صورت میں جبکہ وہ مسلمان نہیں ہیں پہلے دیت کا تذکرہ ہے شاید تعبیر کا یہ اختلاف اس طرف اشارہ کرتا ہو کہ مسلمانوں کے معاملے میں دیت کی تاخیر کا زیادہ تر منفی رد عمل نہیں ہوتا جبکہ غیر مسلموں کے معاملے میں ہر چیز سے پہلے دیت ادا ہونا چاہیے تاکہ نزاع اور جھگڑے کی آگ ٹھنڈی ہو سکے اور دشمن اسے معاہدے کی خلاف ورزی پر محمول نہ کریں۔

۴۔ اسلامی پیمانوں کی طبعی بنیاد

آیت میں دیت کی مقدار نہیں بتائی گئی اور اس کی تفصیل سنت کے مطابق مقرر ہوتی ہے۔ جس کی رو سے پوری دیت ہزار مثقال سونا یا ایک سو اونٹ، یا دو سو گائیں، اور اگر وارث راضی ہوں تو ان جانوروں کی قیمت ہے (البتہ سونے یا بعض جانوروں کا دیت کے طور پر تعین اسلامی اصول کے مطابق ہے اور اسلام نے اپنے پیمانے اور میزان طبعی امور میں سے مقرر کیے ہیں نہ کہ بناوٹی، مصنوعی اور وقتی طریقوں سے جو کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ غلطی کی سزا؟

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ "غلطی" کی سزا نہیں ہوتی، تو اسلام اس کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے۔ حالانکہ اس غلطی کا مرتکب کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس کا جواب واضح ہے کیونکہ خون کا مسئلہ کوئی معمولی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسلام اس سخت حکم کے ذریعے چاہتا ہے کہ لوگ نہایت محتاط رہیں تاکہ کسی قسم کا قتل یہاں تک اشتباہ اور غلطی سے بھی ان سے سرزد



نہ ہو۔ کیونکہ بہت سی غلطیاں بھی قابلِ گرفت ہیں علاوہ ازیں اس لیے بھی کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ قتل اشتباہ کے دعویٰ سے اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ آیت کا آخری جملہ (توبۃً من اللہ) ممکن ہے اسی امر کی طرف اشارہ ہو کہ عام طور پر اشتباہات کا مرکز پوری کوشش اور غور نہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا اہم معاملات میں (مثلاً قتل نفس) کے سلسلے میں اس طرح سے تلافی ہونا چاہیے کہ خدا سے توبہ ان کے مرتکب ہونے والوں کے شامل حال ہوجائے۔

۹۳۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○

ترجمہ

۹۳۔ اور جو شخص کسی صاحبِ ایمان کو جان بوجھ کر قتل کردے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہے گا اور خدا اس پر غضب نازل کرتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے محروم کردیتا ہے اور اس کے لیے اس نے عذابِ عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

شانِ نزول

مقیس بن صبابہ کنانی ایک مسلمان تھا اس نے اپنے مقتول بھائی کی لاش محلہ "بنی نجار" میں دیکھی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آکر یہ واقعہ بیان کیا رسولِ اکرمؐ نے اسے قیس بن ہلال مہری کے ساتھ بنی نجار کے سرداروں کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اگر وہ ہشام کے قاتل کو پہچانتے ہیں تو اسے اس کے بھائی مقیس کے حوالے کردیں اور اگر نہیں پہچانتے تو اس کا خون بہا اور دیت ادا کردیں وہ چونکہ ہشام کے قاتل کو نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انھوں نے مقتول کی دیت اسے ادا کردی اور اس نے بھی قبول کرلی اور قیس بن ہلال کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔

اثنائے راہ میں زمانہ جاہلیت کے باقی رہنے والے افکار نے مقیس کے جذبات کو ابھارا اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا کہ دیت قبول کرنا شکست اور ذلت کا باعث ہے لہٰذا اپنے ہم سفر کو جو قبیلہ بنی نجار میں سے تھا اپنے بھائی کے خون کے بدلے قتل کردیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا اور اسلام سے بھی کنارہ کش ہوگیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی اس خیانت کے بدلے اس کا خون مباح قرار دیا اور اوپر والی آیت اسی مناسبت سے نازل ہوئی جس میں قتل عمد (جان بوجھ کر قتل) کی سزا بیان ہوئی ہے۔



تفسیر

قتل عمد کی سزا

قتل اشتباہ کی سزا بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اس شخص کی سزا بیان ہوئی ہے جو جان بوجھ کر کسی باایمان شخص کو قتل کردے۔ چونکہ انسان کشی ایک بہت بڑا جرم اور گناہ کبیرہ ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے اور اس کا مقابلہ نہ کیا جائے تو امن و امان جو ایک صحیح معاشرے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے بالکل ختم ہوجائے گا۔ قرآن نے مختلف آیات میں اسے اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل روئے زمین کے تمام لوگوں کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے:

من قتل نفسًا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا

جو شخص کسی نفس کو (اگر وہ قاتل نہ ہو یا زمین پر فساد نہ پھیلائے) قتل کردے گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ (مائدہ - ۳۲)

اسی لیے زیر بحث آیت میں ان لوگوں کے لیے جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کردیں۔ چار سزائیں اور آخرت کے شدید عذاب کا (علاوہ قصاص کے جو دنیاوی سزا ہے) ذکر ہوا ہے۔

۱ خلود یعنی ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا (ومن یقتل مومنًا متعمدًا فجزاءہ جھنم خالدًا فیھا)۔

۲ خشم و غضب الٰہی (وغضب اللّٰہ علیہ)۔

۳ رحمتِ خداوندی سے محرومی (ولعنہ)۔

۴ عذاب عظیم میں مبتلا کیا جانا (واعدلہ عذابًا عظیمًا)۔

اس طرح قتل عمد کے لیے اس قدر سخت ترین سزا کا ذکر ہوا ہے جس قدر سخت سزا قرآن میں کسی اور چیز کے متعلق بیان نہیں ہوئی اس کے علاوہ قتل عمد کی دنیاوی سزا وہی قصاص ہے جس کی تفصیل جلد اول میں سورۂ بقرہ آیت ۱۷۹ کے ذیل میں بیان ہوچکی ہے۔

کیا انسانی قتل ابدی سزا کا موجب ہے

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خلود" یعنی ہمیشہ کے لیے سزا تو ان لوگوں کو ملے گی جو ایمان لائے بغیر دنیا سے رخصت ہوجائیں جبکہ قتل عمد کرنے والوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہوں اور یہاں تک امکان ہے کہ وہ پشیمان ہو کر اس گناہِ عظیم سے (جو ان سے سرزد ہوچکا ہے) حقیقی توبہ کرلیں اور گذشتہ گناہ کی جس قدر ممکن ہو تلافی کرلیں۔

۱۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آیت میں مومن کے قتل سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو ایمان لانے کی وجہ سے قتل کرے یا اس کے قتل کو جائز اور مباح قرار دے۔ جان لینا چاہیے کہ اس طرح کا قتل، قاتل کے کفر کا ثبوت ہے اور اس کا لازمہ ابدی اور



ہمیشہ کا عذاب ہے۔

اسی مفہوم کی ایک حدیث بھی حضرت امام صادق ؑ سے منقول ہے[1]

۲۔ یہ احتمال بھی ہے کہ صاحب ایمان اور بے گناہ افراد کو قتل کرنے کی وجہ سے انسان بے ایمان ہو کر دنیا سے رُخصت ہو اور اسے توبہ کی بھی توفیق نصیب نہ ہو اور اسی وجہ سے وہ ابدی اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔

۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلود سے مراد اس آیت میں بہت طویل عذاب ہو نہ کہ ہمیشہ کا عذاب۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اصولی طور پر کیا قتل عمد قابلِ توبہ ہے؟ بعض مفسرین اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قتل عمد درج بالا آیت کے مطابق بنیادی طور پر قابلِ توبہ نہیں ہے اور چند ایک روایات میں بھی جو آیت کے ذیل میں آئی ہیں اس معنی کی طرف اشارہ موجود ہے کہ "لاتوبة له" (اس کی کوئی توبہ نہیں) لیکن تعلیمات اسلام کی روح اور عظیم ہادیانِ حق کی روایات اور توبہ کے فلسفہ (جو تربیت کی بنیاد اور آئندہ کی زندگی میں گناہ سے محفوظ رہنا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گناہ ایسا نہیں جو قابلِ توبہ نہ ہو۔ اگرچہ کچھ گناہوں سے توبہ کی بہت سخت اور سنگین شرائط ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے:

ان الله لا يغفر ان يشرك به و يغفر ما دون ذٰلك لمن يشاء (نساء: ۴۸)

خدا صرف شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا لیکن اس کے علاوہ جس کے لیے چاہتا اور مصلحت سمجھتا ہے، اسے بخش دیتا ہے۔

یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ آیت شفاعت اور گناہوں سے بخشش کے متعلق ہے ورنہ تو شرک کا گناہ بھی توبہ کرنے اور توحید و اسلام کی طرف پلٹ آنے سے قابلِ بخشش ہے جیسا کہ صدر اسلام کے اکثر مسلمان ابتدا میں مشرک تھے اور پھر انھوں نے توبہ کی اور خدا نے ان کے گناہ کو بخش دیا۔ اس وجہ سے صرف شرک ایسا گناہ ہے کہ جو توبہ کیے بغیر بخشا نہیں جا سکتا۔ لیکن توبہ کرنے سے تمام گناہ یہاں تک کہ شرک بھی قابلِ بخشش ہے جیسا کہ سورہ زمر کی آیہ ۵۲ اور ۵۴ میں ہے:

ان الله يغفر الذنوب جميعًا انه هو الغفور الرحيم و انيبوا الى ربكم واسلموا له

خدا تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ خدا کی طرف پلٹ آؤ اور توبہ کرو اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر لو۔

بعض مفسرین نے جو یہ کہا ہے کہ توبہ کے سایہ میں تمام گناہوں کی بخشش سے متعلق آیات، اصطلاح کے مطابق جو آیات عام تخصیص کے زمرے میں آتی ہیں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان آیات کی زبان جو کہ گناہ گاروں کو جہاں منامی کرتی ہیں اور مختلف تاکیدات

---

[1] کافی تفسیر عیاشی میں اس آیت کے ذیل میں امام صادق سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے فرمایا من قتل مومنا على دينه فذلك المتعمد الذى قال الله تعالىٰ عز وجل فى كتابه واعد له عذابا عظيما



کے ساتھ ہیں، قابل تخصیص نہیں ہے اور اصلاح کے مطابق تخصیص سے انکار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر واقعاً وہ شخص جس سے قتل عمد سرزد ہوا ہے مکمل طور پر ہمیشہ کے لیے خدا کی بخشش سے مایوس ہو جائے (یہاں تک کہ اپنے بُرے عمل کی بار بار معافی مانگے اور بہت سے نیک اعمال سے برائی کی تلافی بھی کرے) پھر بھی ہمیشہ کی لعنت اور عذاب میں مبتلا رہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی باقی ماندہ عمر میں خدا کی عبادت زیادہ کرے، بُرے اعمال سے توبہ کرے اور یہاں تک کہ انسانوں کے بار بار قتل سے توبہ کرے۔ یہ امر جو تعلیمات انبیاء کی روح کے منافی ہے کیونکہ وہ تو نوعِ بشر کی ہر مرحلہ میں تربیت کے لیے آئے ہیں تاریخ اسلام میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے خطرناک قسم کے گناہ گاروں مثلاً حمزہ بن عبدالمطلب کے وحشی قاتل تک کو معاف کر دیا اور اس کی توبہ قبول کر لی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شرک اور ایمان کی مختلف حالتوں میں قتل اتنا مختلف سمجھا جائے کہ ایک حالت میں تو بخشا جائے اور دوسری حالت میں قابلِ بخشش نہ ہو۔ اصولی طور پر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم کسی گناہ کو شرک سے بڑھ کر نہیں سمجھتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ گناہ بھی توبہ اور قبول اسلام سے بخشا جا سکتا ہے۔ اب ہم کس طرح باور کر سکتے ہیں کہ قتل کا گناہ حقیقی توبہ کے ذریعے بھی قابلِ بخشش نہ ہو۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے اس سے کوئی اشتباہ نہ ہو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ قتل عمد معمولی اور کم اہمیت کا حامل ہے یا اس سے توبہ بہت آسان ہے بلکہ اس کے برعکس اس گناہ سے حقیقی توبہ بہت ہی مشکل ہے اور یہ اس عمل کی تلافی کی محتاج ہے اور یہ تلافی کوئی آسان کام نہیں ہے۔[1]

قتل کی اقسام

فقہی کتب میں فقہا نے قصاص و دیت کے باب میں اسلامی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے قتل کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ "قتل عمد"۔ "قتل شبیہ عمد" اور "قتل اشتباہ"۔

قتل عمد

یہ قتل وہ ہوتا ہے جس میں پہلے سے پختہ ارادہ اور ذرائع قتل کو بروئے کار لایا جاتا ہے (مثلاً کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے ارادہ سے کسی ہتھیار، لکڑی، پتھر یا ہاتھ سے کام لے)۔

---

[1] روایات میں بے گناہ صاحب ایمان افراد کے قتل کی اہمیت کے بارے میں ایسی تعبیرات بیان ہوئی ہیں جو انسان کو جھنجوڑ دیتی ہیں ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"لزوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل امرء مسلم"

"دنیا کا زوال اور ختم ہو جانا خدا کے ہاں ایک مرد مسلمان کے قتل ہونے سے کمتر ہے" نیز فرماتے ہیں:

"لو ان رجلا قتل بالمشرق و آخر رضی بالمغرب لا شرک فی دمه"

"اگر ایک شخص مشرق میں قتل ہو جائے اور دوسرا مغرب میں ہو اور اس پر راضی ہو تو وہ اس کے خون میں شریک ہے" (المنار ج ۵ ص ۳۴۱)



قتل شبیہ عمد

یہ وہ قتل ہے جس میں قتل کا ارادہ نہ ہو لیکن مقتول کے خلاف ایسے اقدام کیے جائیں کہ بے خبری میں نوبت اس کے قتل تک پہنچ جائے۔ مثلاً کسی کو قتل کے ارادہ سے مارا پیٹا نہ جائے مگر یہ مار پیٹ اتفاقاً اس کے قتل کا سبب بن جائے۔

قتل اشتباہ

یہ وہ قتل ہے جس میں قتل کا ارادہ شامل ہو نہ مقتول کے خلاف کوئی اقدام کرنے کا ارادہ ہو بلکہ یہ ایسا قتل ہے جیسے ارادہ کسی جانور کو شکار کرنے کا ہو مگر غلطی سے تیر کسی انسان کو جا لگے اور وہ قتل ہو جائے۔

ان میں سے ہر قسم کے تفصیلی احکام ہیں جو کتب فقہ میں موجود ہیں۔

۹۴۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؗ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝

ترجمہ

۹۴۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم راہ خدا میں قدم اٹھاتے ہو (اور جہاد کے لیے آمادۂ سفر ہوتے ہو) تو تحقیق کرو اور اس شخص کو جو صلح اور اسلام کا اظہار کرتا ہے (یہ بنا پر) یہ نہ کہو کہ تو مسلمان (مومن) نہیں کہ دنیائے ناپائیدار کا سرمایہ (اور مال غنیمت) حاصل کر سکو۔ کیونکہ خدا کے ہاں (تمھارے لیے) بڑی بڑی غنیمتیں (موجود) ہیں تم پہلے ایسے ہی تھے اور خدا نے تم پر احسان کیا (اور تمھاری ہدایت کی) اس بنا پر (اس عظیم شکرانے کے طور پر) تحقیق کرو، جو کچھ تم عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

درج بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شان نزول اسلامی روایات اور تفاسیر میں آئی ہیں جو کم و بیش ایک دوسرے



سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگِ خیبر سے واپسی کے بعد اسامہ بن زید کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان یہودیوں کی طرف بھیجا جو فدک کی ایک بستی میں رہتے تھے تاکہ انھیں اسلام یا شرائط ذمہ قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ ایک یہودی مرداس جسے لشکرِ اسلام کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے مال اور اولاد کے ساتھ ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لی۔ پھر خود مسلمانوں کے استقبال کے لیے دوڑ آیا۔ اسامہ بن زید نے سوچا کہ یہ یہودی جان اور مال کے خوف سے قبول اسلام کر رہا ہے اور دلی طور پر مسلمان نہیں اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا مال اسباب (بھیڑ بکریوں) پر بطور غنیمت قبضہ کر لیا۔ جب یہ خبر پیغمبرؐ کو ملی تو آپؐ اس واقعہ پر نہایت برہم اور رنجیدہ ہوئے اور فرمایا تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ اسامہ پریشان ہو کر کہنے لگا اس شخص نے جان و مال کی حفاظت کے لیے قبول اسلام کیا تھا پیغمبرؐ نے کہا تم اس کے باطن سے آگاہ نہیں تھے تمھیں کیا معلوم شاید وہ حقیقی طور پر مسلمان ہوا ہو تو اس موقع پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ جنگی غنائم کی وجہ سے کبھی ایسے لوگوں کو مت جھٹلاؤ جو قبولِ اسلام کرتے ہیں بلکہ جو شخص بھی قبولِ اسلام کرے اس کی بات کو مان لینا چاہیے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے سلسلہ میں ضروری تاکیدات ہو چکیں اب اس آیت میں ان بے گناہ افراد کی جان کی حفاظت کے لیے ایک احتیاطی حکم جو ممکن ہے تہمت کی زد میں آجائیں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، اے ایمان لانے والو! جس وقت جہاد کی راہ میں قدم اٹھاؤ تو تحقیق اور جستجو کر لو اور ایسے لوگوں کو جو قبولِ اسلام کریں نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو (یا ایھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا و لا تقولوا لمن القٰی الیکم السلام لست مؤمنا)۔

اور حکم دیتا ہے کہ جو لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں انھیں خندہ پیشانی سے قبول کرو اور ان کے قبولِ اسلام کے بارے میں ہر قسم کی بدگمانی اور سوءِ ظن سے صرف نظر کرو اس کے بعد مزید کہتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جہانِ ناپائیدار کی ان نعمتوں کے لیے قبول اسلام کرنے والوں کو تہمت دو اور انھیں ایک دشمن سمجھ کر قتل کر دو اور ان کا مال و اسباب بطور غنیمت لے لو (تبتغون عرض الحیوۃ الدنیا)[1] جبکہ ہمیشہ رہنے والی گراں بہا غنیمتیں تو خدا کے پاس ہیں (فعند اللہ مغانم کثیرۃ)۔ اگرچہ پہلے تم ایسے ہی تھے اور زمانہ جاہلیت میں تمھاری جنگیں غارت گری کی بنا پر ہوتی تھیں (کذٰلک کنتم من قبل)[2] لیکن اب

---

[1] "عرض" (بروزن مرض) کا معنی ہے ایسی چیز جو ثبات اور پائیداری نہ رکھتی ہو۔ اس بنا پر عرض الحیوۃ الدنیا کا معنی ہے دنیاوی زندگی کا سرمایہ جو بغیر استثناء کے سب ناپائیدار ہے۔

[2] اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم خود بھی اسلام لانے کی ابتدا میں یہی کیفیت رکھتے تھے یعنی زبان سے اسلام کی حقانیت کی گواہی دیتے تھے اور وہ تم سے قبول کر لی گئی جبکہ تمھارے دل میں چھپی ہوئی بات کسی پر واضح نہیں تھی۔



اسلام کے سایے میں اور اس احسان کی وجہ سے جو خدا نے تم پر کیا ہے، اس کیفیت سے نجات پا چکے ہو اس بنا پر اس عظیم نعمت کے شکرانے کے طور پر تمھارے لیے لازم ہے کہ تمام امور میں تحقیق کرو (فمن اللّٰہ علیکم فتبینوا) اور یہ بات جان لو کہ خدا تمھارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے (ان اللّٰہ کان بما تعملون خبیرًا)۔

اسلامی جہاد مادی پہلو نہیں رکھتا

درج بالا آیت میں بڑے واضح طور پر یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مسلمان کو نہیں چاہیے کہ وہ مادی مفاد حاصل کرنے کے لیے میدانِ جہاد میں قدم رکھے اس لیے لے کہا گیا ہے کہ دشمن کی طرف سے پہلی مرتبہ ہی اظہار ایمان کو مان لے اور اس کی صلح کی پیش رفت کا جواب دے، چاہے کتنی ہی مادی نعمتوں سے محروم ہونا پڑے۔ کیونکہ اسلامی جہاد کا مقصد توسیع پسندی اور مال غنیمت جمع کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اور ہدف نوعِ انسانی کو انسانوں کی غلامی اور زر و زور کے خداؤں کی بندگی سے نجات دلانا ہے اور جس وقت امید کی یہ راہ نظر آئے تو فوراً اپنا لینی چاہیے مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے، تم بھی ایک دن اسی طرح کے پست افکار رکھتے تھے اور مادی فوائد کے لیے لوگوں کا خون بہاتے تھے لیکن آج وہ صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے۔

علاوہ ازیں تم خود دائرہ اسلام میں داخل ہوتے وقت سوائے اظہار ایمان کے کیا کرتے تھے اس قانون سے دوسروں کے بارے میں کیوں اجتناب کرتے ہو جس سے تم خود مستفید ہو چکے ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس آیت کے مضمون پر توجہ کرتے ہوئے ہو سکتا ہے یہ اعتراض پیدا ہو کہ اسلام لوگوں کو اس دین سے وابستہ ہونے کے ظاہری دعووں کو قبول کر کے اسلامی ماحول میں "منافقین" کے داخل ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس لائحہ عمل سے ممکن ہے بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور اسلام کی آڑ میں جاسوسی اور غیر اسلامی اعمال و افعال کے مرتکب ہوں۔

شاید دنیا میں کوئی ایسا قانون نہ ہو جس میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کے لیے گنجائش نہ ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ قانون کو واضح مصلحتوں کا حامل ہونا چاہیے اب اگر اس بنا پر کہا جائے کہ قبولِ اسلام کرنے والے کی جب تک دلی کیفیت کا پتہ نہ لگایا جائے اس کے دعوے کو قبول نہ کیا جائے تو اس سے بہت سے مفاسد پیدا ہو جائیں گے جن کا نقصان کہیں زیادہ ہے اور انسانی فطرت و عواطف کے اصول نیست و نابود ہو جائیں گے کیونکہ جو شخص کسی دوسرے سے کوئی گلہ اور شکایت، کینہ اور حسد رکھتا ہو، وہ اسے تہمت لگا سکتا ہے کہ اس کا اسلام دکھاوے کا ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے ہم آہنگ نہیں اس طرح بہت سے بے گناہ قتل کر دیے جائیں گے اس کے علاوہ بہ دین اور مذہب کی طرف مائل اور راغب ہونے کی ابتدا میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو بھول پن میں، رکھ رکھاؤ کے لیے اور ظاہری طور پر مائل ہوتے ہیں لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اور اس دین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ایمان محکم اور مضبوط ہو جاتے ہیں اور ایمان کی جڑیں ان کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہیں اس وجہ سے ایسے لوگوں کو دھتکارا نہیں جا سکتا۔



۹۵۔ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

۹۶۔ دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

ترجمہ

۹۵۔ وہ صاحبِ ایمان جو بغیر بیماری اور تکلیف کے جہاد سے دستبردار ہوگئے اور وہ مجاہد جنہوں نے اپنے مال اور جان کے ذریعے جہاد میں حصہ لیا برابر نہیں ہیں، خدا نے ان مجاہدین کو جنہوں نے اپنی جان اور مال سے جہاد کیا ہے بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور برتری دی ہے ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کو (ان کے نیک اعمال پر) خدا نیک جزا کا وعدہ کرتا ہے اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت اور اجرِ عظیم بخشتا ہے۔

۹۶۔ خدا کی طرف سے (اہم) درجات اور بخشش و رحمت (انھیں نصیب ہوگی) اور (اگر ان سے کچھ لغزشیں ہوئی ہیں) تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جہاد کے متعلق گفتگو ہوئی تھی یہ دو آیات مجاہدین اور غیر مجاہدین کا تقابل اور موازنہ کرتی ہیں۔ خدا کہتا ہے: وہ باایمان کہ جو میدان جہاد میں شرکت کرنے سے اجتناب کرتے ہیں جبکہ انھیں ایسی کوئی خاص بیماری بھی لاحق نہیں کہ جو انھیں میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے مانع ہو کبھی ان مجاہدین کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہوسکتے جو راہِ خدا میں اور اعلائے کلمہ حق کے لیے اپنی جان و مال سے جہاد کرتے ہیں (لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاهدون فی سبیل الله باموالهم و انفسهم)۔

واضح ہے کہ "قاعدون" سے مراد یہاں وہ افراد ہیں جنہوں نے اصولِ ایمان پر ایمان رکھنے کے باوجود ہمت اور جوانمردی نہ دکھانے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کی۔ اگرچہ ان کے لیے یہ جہاد واجب عینی نہیں تھا کیونکہ اگر ان کے لیے واجب ہوتا تو قرآن ان کے بارے میں ایسے نرم اور ملائم لہجے میں بات نہ کرتا اور آیت کے آخر میں ان سے بدلے اور جزا کا وعدہ نہ کرتا اس



وجہ سے جب یہ صورتحال ہو کہ جہاد واجب عینی نہ ہو" مجاہدین" "قاعدین" کے مقابلے میں واضح طور پر برتر ہیں بہر حال اس آیت میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو نفاق یا دشمنی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔

ضمنی طور پر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ "غیر اولی الضرر" کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جو ان تمام افراد کو (جہاد سے) مستثنیٰ قرار دیتی ہے جو کسی عضو کے نقص، بیماری یا بہت زیادہ کمزوری اور ضعف وغیرہ کے سبب جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد پھر مجاہدین کی برتری اور فضیلت کو صراحت اور فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

خدا ان مجاہدین کو جو اپنے جان و مال سے اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، ان لوگوں پر عظیم فضیلت بخشتا ہے جو میدان جہاد میں شرکت سے اجتناب اور کنارہ کشی کرتے ہیں (فضل اللہ المجاھدین باموالھم و انفسھم علی القاعدین درجة)۔[1]

لیکن باوجود اس کے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ مجاہدین کے گروہ کے مدمقابل وہ افراد ہیں جن پر جہاد "واجب عینی" نہیں تھا۔ یا وہ بیماری، ناتوانی یا دیگر علل کی وجوہ سے میدان جہاد میں شرکت کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے کہ ان کی صالح نیت ایمان اور نیک اعمال نظر انداز نہ ہوں انھیں بھی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: دونوں گروہوں (مجاہدین و غیر مجاہدین) سے اچھائی کا وعدہ کیا گیا ہے (وکلا وعد اللہ الحسنیٰ) لیکن واضح ہے کہ وہ اچھائی جس کا وعدہ دونوں سے کیا گیا ہے اس میں بہت زیادہ فرق ہے حقیقت میں قرآن اس بیان کے ذریعے نشاندہی کرتا ہے کہ ہر نیک کام کا حصہ اپنی جگہ پر محفوظ ہے اور بھولنے والا نہیں خصوصاً جبکہ بحث جہاد سے کنارہ کش ہونے والے ایسے افراد کے متعلق ہے جو جہاد میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اور اسے ایک بہت بڑی سعادت اور مقصد سمجھتے تھے لیکن چونکہ یہ واجب عینی نہ تھا اس بنا پر وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ گئے اس کے باوجود وہ جتنا لگاؤ اس کام (جہاد) سے رکھتے ہیں اس قدر جزا پائیں گے اسی طرح "اولی الضرر" افراد بھی جو بیماری یا کسی عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے میدان جہاد میں شریک نہیں ہوئے) مکمل طور پر اس سے لگاؤ رکھتے تھے وہ بھی مجاہدین کی جزا و صلے میں سے قابل ذکر حصہ پائیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے لشکر اسلام سے فرمایا:

لقد خلفتم فی المدینة اقواما ما سرتم مسیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم وھم الذین صحت نیاتھم و نصحت جیوبھم وھوت افئدتھم الی الجھاد وقد منعھم عن المسیر ضرر او غیرہ

مدینہ میں تم کچھ لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو کہ جو اس راہ میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ تھے (اور خدائی اجر اور صلے میں شریک تھے) وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیت پاک ہے اور وہ بہت زیادہ خیر خواہی کرنے والے ہیں اور ان کے دل جہاد کے مشتاق تھے مگر کچھ مجبوریوں مثلاً بیماری اور نقص وغیرہ نے انھیں اس کام سے روک دیا ہے۔[2]

---

[1] درجة کا لفظ بطور نکرہ آیا ہے جیسا کہ کتب ادب میں ہے کہ ایسے موقع پر نکرہ عظمت و اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے گویا اس قدر ان کا درجہ بلند ہے جو مکمل طور پر پہچانا نہیں جاتا اور یہ اس طرح ہے کہ جب کسی چیز کی بہت زیادہ قدر و قیمت بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت کوئی نہیں جانتا۔

[2] تفسیر صافی، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔



لیکن چونکہ اسلام میں جہاد کی اہمیت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے لہٰذا دوبارہ مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے، خدا نے مجاہدین کو قاعدین پر اجرِ عظیم بخشا ہے (وفضل اللہ المجاهدین علی القاعدین اجرًا عظیمًا)۔ بعد ازاں آیت میں "اجرِ عظیم" کی وضاحت کی گئی ہے کہ جو خدا کی طرف سے اہم درجات اور اس کی بخشش و رحمت ہے (درجات منه ومغفرة و رحمة) اور اگر اس دوران میں کچھ افراد اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے کچھ لغزشوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو خدا نے ان سے بھی بخشش و نجات کا وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے (وکان اللہ غفورًا رحیمًا)

چند اہم نکات

بلاغت کا ایک پہلو

۱۔ اوپر والی آیت میں تین مرتبہ مجاہدین کا نام آیا ہے پہلی دفعہ مجاہدین کا ذکر ہدف و مقصد اور وسیلہ و ذریعہ کے ساتھ ہوا ہے (المجاهدون فی سبیل اللہ باموالهم وانفسهم) اور دوسری دفعہ صرف وسیلہ جہاد کا ذکر ہوا ہے لیکن ہدف و مقصد کا تذکرہ نہیں ہے (المجاهدین باموالهم وانفسهم) اور تیسرے مرحلے میں صرف مجاہدین کا نام آیا ہے (المجاهدین) اور یہ بلاغت کلام کا ایک واضح نکتہ ہے کہ جب سننے والا مرحلہ بہ مرحلہ موضوع سے زیادہ آشنا ہوتا چلا جاتا ہے تو اس کی قیود اور مشخصات کو کم کرتے چلے جاتے ہیں اور آشنائی و شناسائی کا معاملہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ صرف ایک اشارے ہی سے تمام چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

"درجۃ" اور "درجات"

۲۔ آیت میں پہلے تو مجاہدین کی قاعدین پر فضیلت و برتری کے لیے لفظ "درجۃ" استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسری آیت میں جمع کی صورت میں لفظ "درجات" استعمال ہوا ہے ظاہراً ان دو تعبیروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ پہلی تعبیر میں مجاہدین کے مقصد کی اپنے غیر پر اصل فضیلت کا تذکرہ ہے لیکن دوسری تعبیر میں اس برتری کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس لیے رحمت و مغفرت کا ذکر بھی ساتھ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں میں اجمال اور تفصیل والا فرق ہے ضمنی طور پر "درجات" کی تعبیر سے یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ سب مجاہدین ایک درجہ اور پایہ کے نہیں ہیں اور ان کے خلوص، جانثاری اور تکالیف برداشت کرنے کے لحاظ سے ان کے معنوی اور دنیاوی مقامات بھی مختلف ہیں کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ تمام مجاہدین جو ایک ہی صف میں دشمن کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں نہ وہ ایک جتنا جہاد کرتے ہیں اور نہ ہی ایک جیسا خلوص رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ہر ایک اپنے عمل اور نیت کی مناسبت سے جزا اور صلہ پائے گا۔

جہاد کی انتہائی تاکید

جہادِ عالم آب و گل کا ایک عمومی قانون ہے اور دنیا میں جو بھی چیز ہے چاہے وہ نباتات میں سے ہو یا حیوانات میں سے۔

جہاد کے ذریعے اپنا راستہ صاف کرتی ہے تاکہ اپنے مطلوبہ کمالات تک پہنچ جائے مثلاً ہم درخت کی جڑیں دیکھیں تو وہ قوت اور غذا حاصل کرنے کے لیے ہر وقت فعال اور متحرک رہتی ہیں اگر وہ یہ فعالیت اور سعی چھوڑ دیں تو ان کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین میں اگر انھیں رکاوٹیں درپیش ہوں تو اگر ان میں اتنی طاقت ہو تو وہ ان میں سوراخ کر کے آگے بڑھ جاتی ہیں تعجب اس بات پر ہے کہ یہ لطیف اور نازک جڑیں بعض اوقات فولادی اوزاروں کی طرح اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور اگر یہ جڑیں کمزور ہوں تو بھی راستہ بدل کر رکاوٹ عبور کر لیتی ہیں۔

اگر ہم اپنے جسم کو دیکھیں تو اس کے اندر بھی رات دن ملکہ سوتے جاگتے ایک عجیب و غریب قسم کی جنگ جاری رہتی ہے یہ جنگ ہمارے خون کے سفید جرثوموں اور حملہ آور دشمن کے درمیان جاری رہتی ہے اگر ایک لمحے کے لیے بھی یہ جنگ رک جائے اور جسم کی حفاظت کرنے والے یہ محافظ جنگ سے دستبردار ہو جائیں تو طرح طرح کے موذی امراض ہمارے جسم کو گھیر لیں اور ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

بالکل یہی صورت انسانی معاشروں، قوموں اور ملتوں کی ہے وہ لوگ جو ہمیشہ جہاد اور نگہبانی کی حالت میں رہتے ہیں ہمیشہ زندہ اور کامران رہتے ہیں اور وہ لوگ جو سوچتے ہیں کہ عیش و عشرت میں وقت گذارا جائے اور جو انفرادی سطح پر زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ جلد یا بدیر مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ زندہ اور فعال قوم لے لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ رسول خدا فرماتے ہیں:

فمن ترک الجهاد البسه ذلا و فقرا فی معیشته و محقا فی دینه ان الله اعز امتی بسنابک خیلها و مراکز رماحها۔ [1]

"جو شخص جہاد کو ترک کر دیتا ہے خدا اسے ذلت کا لباس پہنا دیتا ہے اور فقر و فاقہ اس کی زندگی پر اور تاریکی ویسا ہی اس کے دین پر منحوس سایے کی طرح چھا جاتی ہے۔ خداوند عالم میری امت کو گھوڑوں کے سموں کے ذریعے جو جہاد میں آگے جاتے ہیں اور نیزوں کی انیوں کے وسیلے سے عزت بخشتا ہے۔"

رسول خدا ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

اغزوا تورثوا ابناءکم مجدا۔ [2]

"جہاد کرو تاکہ عظمت اپنی اولاد کو ورثے میں دے جاؤ۔"

حضرت علی امیرالمومنین خطبہ جہاد میں اس طرح فرماتے ہیں:

فان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اولیائه و هو لباس التقوی و درع الله الحصینة وجنته الوثیقة فمن ترکه رغبة عنه البسه الله ثوب الذل و شمله البلاء و دیث بالصغار و القماءة ۔ ۔ ۔ ۔ [3]

"جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے مخصوص دوستوں کے لیے کھول رکھا ہے۔ جہاد تقویٰ کا پُرفضیلت لباس ہے۔ جہاد خدا کی ناقابل شکست زرہ ہے، جہاد پروردگار عالم کی سپر اور ڈھال ہے، جو شخص جہاد کو ترک کر دیتا ہے خدا اس کے جسم پر ذلت اور مصیبت کا لباس پہنا دیتا ہے اور اسے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل و

---

[1]، [2] وسائل کتاب جہاد ابواب جہاد العدو وما یناسبہ باب یکم حدیث ۱۲، ۰
[3] نہج البلاغہ خطبہ ۲۷



خوار کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جہاد صرف مسلح جنگ وجدال کا نام نہیں بلکہ جہاد میں ہر وہ کوشش اور شامل ہے جو خدائی مقدس اہداف و مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ جہاد کا مفہوم دفاعی اور مسلح جنگوں کے علاوہ علمی، منطقی، اقتصادی اور سیاسی مقابلوں پر بھی محیط ہے۔

۹۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝

۹۸۔ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝

۹۹۔ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝

ترجمہ

۹۷۔ وہ لوگ کہ جنکی روح (قابضِ ارواح) فرشتوں نے قبض کی جب کہ وہ اپنے اوپر ظلم کر چکے تھے اور ان سے کہا کہ تم کس حالت میں تھے (اور مسلمان ہونے کے باوجود کفار کی صف میں کیوں جا کھڑے ہوئے) تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنی سرزمین پر انتشار اور دباؤ میں تھے تو ان (فرشتوں) نے کہا تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے پس ان (کے پاس کوئی عذر و معذرت نہیں تھی اور ان) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کا انجام برا ہے۔

۹۸۔ مگر ایسے مرد، عورتیں اور بچے جو واقعاً دباؤ اور جبر کا شکار تھے کہ جن کے پاس (اس آلودہ ماحول سے نجات پانے کیلیے) نہ کوئی چارہ تھا اور نہ کوئی راہ۔

۹۹۔ ممکن ہے خدا انھیں عفو کے قابل قرار دے اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

شانِ نزول

جنگ بدر کی ابتدا سے قبل سردارانِ قریش نے یہ خطرناک اعلان کیا تھا کہ مکہ کے تمام رہنے والے جو میدان جنگ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں اور جو اس کام کی مخالفت کرے گا اس کا گھر ویران کر دیا



جئے گا اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے گا اس دھمکی کے بعد کچھ ایسے افراد جو بظاہر ایمان لا چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں گھر اور مال و متاع انتہائی عزیز تھا وہ ہجرت کے لیے تیار نہ ہوئے اور بت پرستوں کے ساتھ میدان جنگ کی طرف چل پڑے میدان جنگ میں انھوں نے مشرکین کا ساتھ دیا وہ مسلمانوں کی کم تعداد کو دیکھ کر شک و شبے میں مبتلا ہو گئے اور آخر کار میدانِ جنگ میں قتل ہو گئے درج بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی جس میں ان کا عبرت ناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

جہاد سے متعلق مباحث کے بعد ان آیات میں ایسے لوگوں کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن انھوں نے اسلام کے اہم لائحہ عمل یعنی "ہجرت" کو عملاً نظر انداز کیے رکھا جس کے نتیجے میں وہ خطرناک وادیوں میں پہنچ گئے اور مشرکین کی صفوں میں شامل ہو کر انھوں نے جانیں گنوا دیں قرآن کہتا ہے: وہ لوگ کہ (قبضِ روح کرنے والے) فرشتوں نے جن کی روح اس حالت میں قبض کی کہ جب انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا انھوں نے ان سے پوچھا کہ اگر تم لوگ مسلمان تھے تو پھر کفار کی صفوں میں شامل ہو کر تم نے مسلمانوں سے کیوں جنگ کی (ان الذین توفاھم الملٰئکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم)۔

وہ جواب میں معذرت خواہی سے کہتے ہیں: ہم اپنے ماحول میں جبر اور دباؤ میں تھے اس لیے ہم فرمان الٰہی پر عمل کی طاقت نہیں رکھتے تھے (قالوا کنا مستضعفین فی الارض) لیکن ان کی یہ معذرت قابلِ قبول نہ ہوگی اور فوراً وہ خدا کے فرشتوں سے یہ جواب سنیں گے کہ کیا پروردگار کی زمین وسیع و عریض نہ تھی کہ تم ہجرت کرتے اور اپنے آپ کو اس آلودہ اور گھٹے ہوئے ماحول سے نکال کرلے جاتے (قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا)۔

آخر میں ان کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس قسم کے لوگ جنھوں نے بیکار عذر داری اور ذاتی مصلحت اندیشیوں کے سبب ہجرت نہیں کی اور انھوں نے اس گھٹے ہوئے ماحول میں زندگی گذارنے کو ترجیح دی ہے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بُرا انجام ہے (فاولٰئک ماوٰھم جھنم و ساءت مصیرًا)۔

بعد والی آیت میں مستضعفین حقیقی کمزور اور عاجز افراد (نہ کہ جھوٹے مستضعفین) کے استثناء کے ساتھ فرماتا ہے: وہ مرد عورتیں اور بچے جو اس گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ حقیقتاً معذور ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا ناقابل عمل ذمہ داری لاگو کرے (الا المستضعفین من الرجال و النساء والولدان لا یستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا)۔

آخری آیت میں فرماتا ہے: ہو سکتا ہے عفو خداوندی ان کے شاملِ حال ہو اور خدا ہمیشہ سے معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے (فاولٰئک عسی اللہ ان یعفو عنھم و کان اللہ عفوًّا غفورًا)

یہی سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہ افراد حقیقتاً معذور ہیں تو پھر کیوں نہیں فرماتا کہ خدا حتماً اور یقیناً انھیں بخش دے گا وہ تو کہتا ہے "عسیٰ" (شاید) اس سوال کا جواب وہی ہے جو اس سورہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ اس طرح کی تعبیروں سے مراد کیا ہے۔ اس آیت میں مذکور حکم چند شرائط کے ساتھ آیا ہے جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔



خدا اس قسم کے افراد سے عفو کرتا ہے جنھوں نے موقع ملنے پر ہجرت کے عمل سے تھوڑی سی کوتاہی بھی نہ کی ہو۔ اصطلاح کے مطابق اس کام کے ضمن میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اور اب بھی موقع ملتے ہی ہجرت کرنے پر آمادہ اور تیار ہوں۔

چند اہم نکات

۱۔ روح کی استقامت

اس آیت میں موت کی بجائے " توفی " کا لفظ حقیقت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ موت کا معنی نابود اور فنا ہونا نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی " فرشتوں کی جماعت اور روح انسانی کو پالینا " ہے۔ یعنی وہ اس کی روح کو جو کہ اس کے وجود کا سب سے بنیادی حصہ ہے نکال کر ایک دوسرے جہان میں لے جاتے ہیں ایسی تعبیر جو قرآن میں بارہا آئی ہے در اصل قرآن مجید کا اس امر کی طرف ایک واضح ترین اشارہ ہے کہ موت کے بعد روح باقی رہتی ہے اس کی تفصیل مختلف آیات میں مناسب موقع پر آتی رہے گی یہ جواب ان لوگوں کے لیے ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن نے روح کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

۲۔ روح قبض کرنے والے، ایک یا ایک سے زائد فرشتے

قرآن میں کئی ایک مقامات (۱۲ مقامات) ہیں جن میں توفی[1] اور موت کا تذکرہ ہے اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روح قبض کرنے کے لیے ایک ہی فرشتہ متعین نہیں کیا گیا بلکہ بہت سے فرشتوں کے ذمہ یہ کام ہے جو لوگوں کی ارواح کو اس جہان سے دوسرے جہان میں لیجانے پر مامور ہیں۔ درج بالا آیت میں فرشتوں کا ذکر جمع کے صیغے (الملائکہ) کے ساتھ آیا ہے۔ یہ بھی اس امر کا گواہ ہے سورہ انعام کی آیت ۶۱ میں ہے:

حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا

" جب تم میں سے کسی ایک کی موت کا وقت آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں "

اب اگر ہم دیکھیں کہ بعض آیات میں یہ امر ملک الموت (موت کا فرشتہ) سے منسوب کیا گیا ہے[2] تو وہ اس مفہوم میں ہے کہ وہ ان تمام فرشتوں کا سردار ہے جو ارواح قبض کرنے پر مامور ہیں اور اسی فرشتے کو احادیث میں " عزرائیل " کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس بناء پر جب لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایک فرشتہ کس طرح ایک ہی وقت میں تمام مقامات پر حاضر ہو کر انسانوں کی روح قبض کرتا ہے تو اس کا جواب اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] " توفی " کے معنی کے سلسلہ میں تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۳۴۱ کی طرف مراجعہ فرمائیں اردو ترجمہ

[2] سورہ سجدہ آیت ۱۱



اس کے علاوہ اگر فرض کریں کہ اور فرشتے نہیں ہیں اور صرف ایک فرشتہ ہے پھر بھی کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اس کا اکیلا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے کیونکہ ایک ایسا وجود جو مادے سے نہ بنا ہوا اس میں مادی اشیاء کی نسبت وسیع احاطہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ملک الموت کے بارے میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے ملک الموت سے اس جہان پر احاطہ رکھنے کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا:

ما الدنیا کلہا عندی فیما سخرہا اللہ لی و مکننی علیہا الا کالدرھم فی کف الرجل یقلبہ کیف یشاء

یہ جہان اور جو کچھ اس میں ہے اس تسلّط اور احاطہ کے لحاظ سے جو خدا نے مجھے بخشا ہے میرے نزدیک اس درہم (روپیہ) کی مانند ہے جو کسی شخص کے ہاتھ میں ہو کہ جس طرح چاہے الٹ پھیر کرے[1]

بعض آیات میں روح قبض کرنے کا تعلق خدا سے وابستہ کیا گیا ہے مثلاً۔

"اللہ یتوفی الانفس حین موتہا"

"خدا موت کے وقت جانوں کو قبض کرتا ہے"۔ (سورۂ زمر ۴۲)

یہ گذشتہ آیات سے متضاد نہیں کیونکہ جن معاملات میں کام واسطوں کے ذریعے ہوتے ہیں وہاں بعض اوقات کام کی نسبت وسیلوں کی طرف دی جاتی ہے اور کبھی اس طرف کہ جو اسباب اور وسیلے پیدا کرتا ہے دونوں نسبتیں صحیح ہیں بہتر نظریہ یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے حوادث کی نسبت قرآن مجید میں فرشتوں کی طرف دی گئی ہے جو خدا کی جانب سے عالم ہستی میں مامور ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں فرشتہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس مفہوم میں تمام مجرد موجودات سے لے کر طبعی توانائیاں تک شامل ہیں۔

۲۔ مستضعف کون ہے؟

آیات قرآن اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو افراد فکری، جسمانی یا اقتصادی طور پر اتنے ضعیف اور کمزور ہوں کہ حق و باطل میں تمیز نہ کر سکیں یا جو باوجود صحیح عقیدہ رکھنے کے جسمانی یا مالی طور پر کمزوری کے باعث یا معاشرے کی ناروا پابندیوں کے سبب اپنے فرائض ادا نہ کر سکتے ہوں اور نہ ہی ہجرت کے قابل ہوں انھیں مستضعف کہتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

ولا یقع اسم الاستضعاف علی من بلغتہ الحجۃ فسمعتہا اذنہ و وعاہا قلبہ۔

"وہ شخص مستضعف نہیں ہے جس پر حجت تمام ہو چکی ہو اس نے حق کو سنا ہو اور اس کے ذہن نے اس کا ادراک کیا ہو"۔[2]

امام موسیٰ بن جعفرؑ سے پوچھا گیا، مستضعف کون ہے؟ امام نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:

الضعیف من لم ترفع لہ حجۃ ولم یعرف الاختلاف فاذا عرف الاختلاف فلیس بضعیف۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۹۱ آیت ۱ سورہ اسراء کے ذیل میں
[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۳۶



"مستضعف وہ شخص ہے جس تک حجت اور دلیل نہ پہنچی ہو اور وہ (مذاہب اور عقائد کے بارے میں) موجود اختلاف کو نہ سمجھ سکا ہو (جو کہ محرکِ تحریک ہے) اور جو اس چیز کو سمجھ چکا ہو وہ مستضعف نہیں ہے۔[1]"

واضح ہے کہ اوپر والی دونوں احادیث میں مستضعف فکری اور عقیدہ کے لحاظ سے ہے لیکن زیر بحث آیت میں اور اسی سورہ کی آیہ ۷۵ میں جو بیان ہو چکی ہے مستضعف سے مراد عملی مستضعف ہے یعنی وہ شخص جس نے حق کی تشخیص کر لی ہو لیکن ماحول کا جبر اور گھٹن اسے عمل کی اجازت نہ دیتا ہو۔

۱۰۰۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُھَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۰۰۔ اور جو شخص راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے اور وسیع امن کے خطے پائے گا اور جو شخص اپنے شہر سے خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے پھر اسے موت آجائے تو اس کا اجر و ثواب خدا پر ہے اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

ہجرت ـــــ اسلام کا ایک اصلاحی حکم

جو لوگ ہجرت کے فریضہ سے کوتاہی کر کے طرح طرح کی ذلتوں اور بدبختیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کے تذکرے کے بعد اس آیت میں قطعی طور پر ہجرت کی اہمیت کے سلسلہ میں دو حصوں میں بحث ہوئی ہے۔

سب سے پہلے دنیاوی زندگی میں ہجرت کے ثمرات اور برکات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، جو لوگ خدا کی راہ میں اور خدا کے لیے ہجرت کرتے ہیں انھیں خدا کے اس وسیع جہان میں امن کی بہت سی اور وسیع جگہیں میسر آئیں گی جن میں رہ کر وہ حق کو فروغ دیں گے اور مخالفین کو زیر کر سکیں گے (ومن یھاجر فی سبیل اللہ یجد فی الارض مراغماً کثیراً وسعۃ) غور کرنا چاہیے کہ "مراغم" رغام (بروزن کلام) کے مادہ سے بمعنی "خاک اور مٹی" لیا گیا ہے۔ ارغام کا معنی ہے کسی کو مٹی میں رگیدنا اور ذلیل کرنا اور مراغم اسم مفعول بھی ہے اور اسم مکان بھی۔ لیکن زیر نظر آیت میں اسم مکان کے معنی میں

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۳۹



آیا ہے یعنی وہ مکان جہاں حق کا اجرا کر سکتے ہیں اور اگر کوئی شخص عناد کی وجہ سے حق کی مخالفت کرے تو اسے مغلوب کر کے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں ۔ اس کے بعد ہجرت کے معنوی اور اخروی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ، اگر کچھ لوگ ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر اور وطن سے خدا اور پیغمبر کی طرف ہجرت کریں اور ہجرت کے مقام تک پہنچنے سے پہلے انھیں موت آجائے تو ان کا اجر اور ثواب خدا کے ذمہ ہے اور خدا ان کے گناہوں کو بخش دے گا (ومن یخرج من بیتہ مھاجرًا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ وکان اللہ غفورًا رحیمًا) اس وجہ سے ہجرت کرنے والے ہر صورت میں ایک عظیم کامیابی حاصل کریں گے چاہے وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں اور حریت و آزادی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی سے بہرہ ور ہوں اور منزل مقصود تک پہنچ جائیں اور چاہے وہ ایسا نہ کر سکیں اور اپنی جان اس راہ میں قربان کر دیں ۔ اس کے باوجود ہر قسم کا اجر و ثواب خدا ہی کے ذمہ ہے ۔ لیکن بیان خصوصیت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے " فقد وقع اجرہ علی اللہ " یعنی اس کا اجر خدا پر لازم ہو چکا ہے " یہ امر ہجرت کرنے والوں کے اجر و ثواب کی انتہائی عظمت و اہمیت کا مظہر ہے ۔

اسلام اور ہجرت

اس آیت اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات کے مطابق اسلام صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ انسان اگر کسی ماحول میں کچھ عوامل و اسباب کی بنا پر اپنی ذمہ داری نبھا نہ سکے تو دوسرے ماحول اور مقام امن کی طرف ہجرت کرے کیونکہ جہان ہستی کے باوجود

نتواں مرد بہ ذلت کہ در اینجا زادم

(یعنی اس وجہ سے ذلت کے ساتھ کسی جگہ نہیں مرنا چاہیئے کہ یہ میری جائے پیدائش ہے)

اور اس حکم کی علت اور سبب واضح ہے کیونکہ انسان کسی خاص مقام کا پابند نہیں ہے وہ کسی معین مقام اور ماحول سے وابستہ اور اس میں محدود نہیں ہے اس طرح انسان کا اپنی جائے پیدائش اور اس کے ماحول اور علاقے سے انتہائی لگاؤ اسلام کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کی ہجرت سے مانع نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام میں یہ تمام وابستگیاں اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے منقطع کر دی گئیں ۔ ایک مغربی مورخ کے بقول :

> قبیلہ اور خاندان وہ اکیلا درخت ہے جو صحرا میں اگتا ہے اور کوئی شخص اس کی پناہ اور سایے کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ہجرت کے ذریعے اس درخت کو جس نے ان کے خاندان کے لیے گوشت اور لہو سے پرورش پائی تھی اپنے پروردگار کے لیے کاٹ دیا (اور قریش سے اپنا رابطہ ختم کر دیا)[1]

علاوہ ازیں تمام زندہ موجودات میں یہ بات مشترک ہے کہ جب وہ اپنے وجود کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو ہجرت کا راستہ اختیار کرتے ہیں اس سے پہلے بہت سے لوگوں نے کسی علاقے کے جغرافیائی حالات کے متغیر ہونے کے بعد اپنی زندگی کی بقا کے لیے

۱؎ محمد خاتم پیامبران جلد اول ۔



اپنے وطن اور جائے پیدائش سے دوسرے علاقوں کی طرف کوچ کیا ہے نہ صرف انسان بلکہ دوسرے جانداروں میں بہت سی ایسی انواع ہیں جو مہاجر کے طور پر پہچانی گئی ہیں ۔ مثلاً بعض ہجرت کرنے والے پرندے ایسے بھی ہیں جو اپنی زندگی کی بقا کے لیے بعض اوقات پورے کُرہ ارض کی سیر کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کا سفر طے کرتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی بقا کے لیے تقریباً ۱۸ ہزار کلو میٹر تک پرواز کرتے ہیں اور یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ ہجرت حیات و زیست کو رواں دواں رکھنے کے قوانین میں سے ہے تو کیا ممکن ہے کہ انسان ایک پرندے سے بھی کم تر ہے ؟ یا یہ ہو سکتا ہے کہ جب مقدس مقاصد و اہداف اور حیات معنوی جن کی قدر و قیمت مادی زندگی سے کہیں زیادہ ہے ، خطرے میں پڑ جائیں تو انسان اس عذر کی بنا پر کہ یہ میری جائے پیدائش ہے اپنے اہداف و مقاصد کو چھوڑ دے اپنے آپ کو طرح طرح کی ذلت و خواری ، محرومی اور غلامی کے سپرد کر دے ۔ یا یہ کہ وہ اس عمومی قانونِ حیات کے مطابق اس علاقے سے ہجرت کر جائے اور کسی ایسی جگہ منتقل ہو جائے جو اس کی مادی و روحانی نشوونما اور رُشد کے لیے مناسب ہو ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ ہجرت جو اپنی حفاظت کی بجائے دین اسلام کے تحفظ کے لیے ہوئی مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدا ہے اور یہ ہجرت ہمارے تمام سیاسی ، تبلیغی اور معاشرتی معاملات کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ ہجرتِ پیغمبر اکرمؐ کا سال اسلام کی تاریخ کے ابتدا کے طور پر کیوں منتخب ہوا ہے ۔

تو یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے ہم جانتے ہیں کہ ہر قوم و ملت کی اپنی ایک تاریخی ابتدا ہوتی ہے ۔ عیسائیوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا حضرت مسیحؑ کے سال پیدائش سے شمار کی ہے اسلام میں باوجودیکہ ہجرت سے اہم واقعات تھے ، مثلاً ولادت پیغمبر اسلامؐ ، آپؐ کی بعثت ، فتح مکہ اور رحلت پیغمبر اکرمؐ ، پھر بھی ان میں سے کوئی واقعہ منتخب نہیں ہوا اور صرف ہجرتِ رسولِ خداؐ تاریخ کی ابتدا کا عنوان ٹھہری ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفہ دوم کے وقت جب اسلام طبعی طور پر وسعت حاصل کر چکا تھا مسلمانوں کو ایسی ابتدائے تاریخ کے تعین کی فکر لاحق ہوئی جو عمومی لحاظ سے سب کے لیے یکساں ہو ۔ بہت رد و قدح کے بعد حضرت علیؑ کے نظریہ کو قبول کر لیا گیا ۔ حضرت علیؑ نے ابتدائے تاریخ کے لیے ہجرت کا انتخاب کیا ۔[1]

حقیقت میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہجرت وہ روشن ترین قدم تھا جسے اسلام میں عملی جامہ پہنایا گیا اور جو تاریخ اسلام کی فصلِ نو کا آغاز بنا ۔ مسلمان جب تک مکہ میں تھے اپنی تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور میں سے گزر رہے تھے ظاہراً وہاں وہ کسی قسم کی اجتماعی اور سیاسی طاقت نہ تھے لیکن ہجرت کے فوراً بعد اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی اور بڑی تیزی کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں ترقی ہوئی اور اگر مسلمان فرمان رسالت کے مطابق اس طرح ہجرت نہ کرتے تو نہ صرف یہ کہ اسلام مکہ کے دائرے سے باہر نہ نکلتا بلکہ ممکن تھا کہ وہیں خاموش اور دفن ہو جاتا ۔

واضح ہے کہ ہجرت کوئی ایسا حکم نہیں کہ جو زمان پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ ہر عہد اور زمانہ میں کسی جگہ بھی ایسے حالات ہوں تو مسلمانوں کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ وہ ہجرت کریں ۔

---

[1] تاریخ طبری جلد دوم ص ۱۱۲



بنیادی طور پر قرآن ہجرت کو آزادی اور سکون کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیت میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ سورہ نحل آیۃ ۴۱ میں بھی یہ حقیقت ایک اور طریقے سے بیان ہوئی ہے:

والذین هاجروا فی الله من بعد ما ظلموا لنبوئنهم فی الدنیا حسنة

اور وہ لوگ جن پر ظلم کیے گئے اور اس کے بعد انھوں نے راہِ خدا میں ہجرت اختیار کی وہ دنیا میں پاکیزہ مقام حاصل کریں گے۔

اس نکتہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ہجرت اسلام کی نگاہ میں صرف مکانی اور خارجی ہجرت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس ہجرت سے پہلے اندر اور باطن سے ہجرت کا آغاز ہو اور اس ہجرت سے مراد ہجرت اور دُوری ہے ان چیزوں سے کہ جو انسان کی اہانت اس کے مرتبے اور اعزاز سے ٹکراتی ہوں یہ ہجرت اس لیے ہے تاکہ اس کے زیر اثر انسان خارجی اور مکانی ہجرت کے لیے آمادہ ہو سکے اور یہ ہجرت ضروری ہے تاکہ اگر ہجرت مکانی کی ضرورت پڑے تو اس باطنی ہجرت کے زیر اثر انسان راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو سکے اصولی طور پر روح ہجرت وہی ظلمت سے نور، کفر سے ایمان اور گناہ و نافرمانی سے اطاعت خداوندی کے لیے دیوانہ وار نکل پڑنا ہے اسی لیے ہم احادیث میں پڑھتے ہیں کہ وہ مہاجرین جنھوں نے جسمانی طور پر ہجرت کی مگر روحانی ہجرت نہیں کی وہ مہاجرین کی صفوں میں شمار نہیں ہوتے اس کے مقابلے میں وہ لوگ جنھیں مکانی ہجرت کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ باطنی طور پر ہجرت میں شامل تھے وہ مہاجرین کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ویقول الرجل هاجرت ولم یهاجر انما المهاجرون الذین یهجرون السیئات ولم یأتوا بها۔

بعض کہتے ہیں کہ ہم نے ہجرت کی ہے حالانکہ حقیقت میں انھوں نے ہجرت نہیں کی حقیقی ہجرت کرنے والے وہ ہیں جو گناہوں سے ہجرت اختیار کرتے ہیں اور ان کے مرتکب نہیں ہوتے۔[1]

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

من فر بدینه من ارض الی ارض و ان کان شبرًا من الارض استوجب الجنة و کان رفیق محمد و ابراهیم علیهما السلام

جو شخص اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین کی طرف ایک بالشت برابر ہجرت کرے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور محمد و حضرت ابراہیم علیہم السلام کی رفاقت اور ہم نشینی اسے نصیب ہو گی (کیونکہ یہ دونوں عظیم پیغمبر عالم ہستی میں ہجرت کرنے والوں کے پیشوا اور رہنما تھے)۔[2]

۱۰۱ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○

---

[1] سفینۃ البحار (ہجر)   [2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۱



ترجمہ

۱۰۱۔ اور جس وقت سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تمھیں کافروں کے فتنے کا ڈر ہو، کیونکہ کافر تمھارے واضح دشمن ہیں۔

تفسیر

نمازِ مسافر

گذشتہ آیات "جہاد" اور "ہجرت" کے بارے میں بحث کر رہی تھیں۔ اب اس آیت میں "نماز مسافر" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب سفر کرو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز کو کم اور قصر کر لو، اگر کفار کی طرف سے تمھیں خدشہ ہو کیونکہ کافر تمھارے واضح دشمن ہیں (واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلٰوۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا) اس آیت میں سفر کو "ضرب فی الارض" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ مسافر سفر کرتے وقت زمین کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہے۔[1] یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں نماز قصر کا مسئلہ دشمن کے خطرے کے ساتھ مشروط ہے جبکہ ہم فقہی مباحث میں پڑھتے ہیں کہ نماز قصر ایک عمومی حکم ہے اور اس میں پرخطر اور پُرامن سفروں میں کوئی فرق نہیں ہے شیعہ اور اہلِ سنت کی طرف سے کئی ایک روایات جو نماز قصر کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس عمومیت کی تائید کرتی ہیں۔[2] اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے قصر والے حکم کو خوف سے مربوط کرنا مندرجہ ذیل چند وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر ہو۔

الف: یہ پابندی اور شرط اسلام کے ابتدائی دنوں کی صورتِ حال سے متعلق ہے اور اصطلاح کے مطابق قید غالبی ہے یعنی غالباً ان کے سفر خوف و خطر سے بھرپور ہوتے تھے اور جیسا کہ علمِ اصول میں کہا جا چکا ہے کہ قیود غالبی کا مفہوم نہیں ہوتا جیسا کہ:۔

وربائبکم اللاتی فی حجورکم

تمھاری بیوی کی وہ لڑکیاں جو تمھاری گودوں میں پلی بڑھی ہیں تم پر حرام ہیں۔ (نسآء۔ ۲۳)

اس آیت میں بھی یہی مسئلہ درپیش ہے کیونکہ بیوی کی بیٹیاں محارم میں داخل ہیں چاہے وہ اس کی گود میں رہی ہوں یا نہ رہی ہوں غالباً جو طلاق یافتہ عورتیں دوسرا شوہر کرتی ہیں وہ جوان ہوتی ہیں اور چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں جو دوسرے شوہر کی گود میں پلتے ہیں اس لیے فی حجورکم (تمھاری گودوں میں) کی قید اس آیت میں آئی ہے۔

---

[1] مفردات راغب مادہ "ضرب"

[2] مزید اطلاع کے لیے وسائل الشیعہ جلد پنجم اور سنن بیہقی جلد ۳ ص ۱۳۴ وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔



ب : بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ نماز قصر کا مسئلہ پہلے تو خوف کے وقت سے متعلق تھا (اوپر والی آیت کے مطابق) پھر اس حکم نے وسعت پیدا کی اور یہ تمام مواقع کے لیے عمومیت اختیار کر گیا۔

ج : ممکن ہے یہ پابندی تاکیدی پہلو رکھتی ہو یعنی نماز قصر مسافر کے لیے ہر جگہ لازم اور واجب ہے لیکن جب دشمن کا خدشہ ہو تو پھر اس کی زیادہ تاکید ہے۔ بہر حال اس میں شک و شبہ نہیں کہ آیت کی تفسیر میں آنے والی بہت سی اسلامی روایات کی طرف دھیان دیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز مسافر حالتِ خوف سے مخصوص نہیں ہے اسی لیے تو پیغمبر اکرمؐ بھی سفر کی حالت میں یہاں تک کہ مراسم حج میں (منیٰ کی سرزمین میں) نماز قصر پڑھتے تھے۔

ایک دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ "(تم پر کوئی گناہ نہیں ہے)" اور قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا گیا کہ بس نماز قصر ہی پڑھو تو ایسے میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نماز قصر واجب عینی ہے، واجب تخییری نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل یہی سوال رہبران اسلام سے ہوا اور انھوں نے دو نکات کی طرف اشارہ کیا ہے ـــــ:

پہلا یہ کہ "لا جناح" (تم پر کوئی گناہ نہیں) کی تعبیر خود قرآن مجید میں بعض مواقع پر وجوب کے معنی میں استعمال ہوئی ہے، مثلاً ـــــ:

ان الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت او اعتمر فلا جناح عليه ان يطوف بهما (البقرة ۱۵۸)

صفا اور مروہ خدا کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص حج و عمرہ ادا کرے اس کے لیے کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کرے (صفا اور مروہ کے درمیان سعی بجا لائے) ـــــ

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا حج و عمرہ دونوں میں واجب ہے اسی لیے تو پیغمبر اکرمؐ اور تمام مسلمان یہ عمل کرتے تھے۔ بالکل یہی مضمون ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے[1]

دوسرے الفاظ میں "لا جناح" کی تعبیر زیر بحث آیت میں اور نیز آیت حج میں حرمت کے وہم کی نفی کے لیے آئی ہے، کیونکہ اسلام کی ابتداء میں صفا اور مروہ (پہاڑیوں) کے اوپر بت رکھے ہوئے تھے بعض مسلمانوں کا یہ خیال تھا صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا بت پرستوں کے آداب میں سے ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا لہٰذا خدا اس غلط فہمی کی نفی کے لیے فرماتا ہے "کہ کوئی حرج نہیں کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرو"۔ اسی طرح مسافر کے ذکر میں احتمال ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کریں کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا ایک گناہ ہے لہٰذا لا جناح کی تعبیر کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے ـــــ

دوسرا نکتہ کہ جس کی طرف بعض روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ سفر میں نماز کو قصر کرنا ایک قسم کی خدا کی طرف سے رعایت ہے لہٰذا ادب اور احترام کا تقاضا ہے کہ انسان اس تخفیف کو رد نہ کرے اور اس کی طرف سے بے اعتنائی نہ برتے۔ اہل سنت کی

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۵۴۰



مہیا کر رکھا ہے (ان اللہ اعد للکافرین عذابا مھینا)۔

چند اہم نکات

۱۔ نمازِ خوف ہر دور میں ہو سکتی ہے

واضح ہے کہ یہاں پیغمبر اکرمؐ کے مسلمانوں کے درمیان نمازِ خوف کے موقع پر موجود ہونے سے یہ مراد نہیں کہ یہ نماز ذاتِ پیغمبر اکرمؐ کے وجود سے مشروط ہے بلکہ مراد سرفروشوں اور مجاہدین کے درمیان نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے امام، پیشوا اور رہنما کا وجود ہے۔ اسی لیے تو حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ نے بھی نمازِ خوف ادا کی تھی یہاں تک بعض اسلامی لشکروں کے کمانڈروں (مثلاً حضرت حذیفہ یمانی) نے اسی اسلامی عمل کو ضرورت کے وقت انجام دیا ہے[۱]

۲۔ دورانِ نمازِ خوف مسلح رہنے کے حکم میں فرق

آیت میں پہلے گروہ کو حکم ہوتا ہے کہ نمازِ خوف کے وقت ان کے پاس ہتھیار ہونے چاہییں۔ لیکن دوسرے گروہ سے کہتا ہے کہ دفاعی ساز و سامان (مثلاً زرہ) اور ہتھیاروں کو زمین پر بالکل نہ رکھیں ممکن ہے کہ ان دونوں دستوں کا فرق اس وجہ سے ہو کہ پہلے گروہ کے نماز کو ادا کرتے وقت دشمن ابھی تک اس لائحہ عمل سے بے خبر ہو لہٰذا اس میں حملے کا احتمال بہت کم ہے لیکن دوسرے دستہ کے وقت جبکہ دشمن ادائیگی نماز پر متوجہ ہو جاتا ہے تو حملے کا احتمال بہت زیادہ ہے۔

۳۔ مال و متاع کی حفاظت

مال و متاع کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ اپنی حفاظت کے علاوہ دوسرے جنگی وسائل اور سفر کے ساز و سامان، غذائی ذخیرے اور جو حیوانات تمہارے ساتھ ہیں ان کی نگرانی بھی تمہیں کرنا ہے۔

۴۔ نماز باجماعت کی اہمیت

ہم جانتے ہیں کہ نماز باجماعت اسلام میں واجب نہیں ہے لیکن بہت زیادہ تاکیدی مستحبات میں ہے اور اوپر والی آیت اس کی ایک زندہ نشانی ہے اس اسلامی لائحہ عمل کی تاکید یہاں تک ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی اس طریقے کی انجام دہی کیلیے نمازِ خوف سے استفادہ کیا جاتا ہے یہ امر اصل نماز اور جماعت دونوں کی اہمیت ظاہر کرتا ہے نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی مجاہدین اپنے ہدف اور مقصد سے کس قدر وابستہ ہوتے ہیں نیز اس کام سے دشمنوں پر بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان میدانِ جنگ میں بھی اپنی ذمہ داریاں

---

[۱] کنز العرفان جلد اوّل صفحہ ۱۹۱



قبیلہ بنی ابیرق نسبتاً ایک مشہور قبیلہ تھا اس قبیلہ کے تین بھائی بشر، بشیر، مبشر نامی تھے۔ بشیر ایک مسلمان رفاعہ کے گھر میں داخل ہوا اور تلوار، زرہ اور کچھ خوراک چوری کر لیں۔ اس کے بھتیجے "قتادہ" نے جو مجاہدین بدر میں سے تھا یہ واقعہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں بیان کیا لیکن ان تین بھائیوں نے اپنے ایک پڑوسی صاحب ایمان مسلمان لبید پر اس معاملے میں تہمت لگائی۔ لبید اس ناروا تہمت سے بہت زیادہ برہم ہوا اور تلوار نکال کر اس کے پاس آیا اور چیخ کر کہا: تم مجھ پر چوری کی تہمت لگاتے ہو، حالانکہ اس الزام کے زیادہ اہل تم ہو اور تم وہی منافق ہو جو پیغمبر خدا کی ہجو کہتے تھے اور پھر ہجو کے اشعار کو قریش سے منسوب کر دیتے تھے یا تو اس تہمت کو جو تم نے مجھ پر لگائی ہے ثابت کرو ورنہ میں اپنی تلوار تمھیں گھونپ دوں گا چور کے بھائیوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو لبید سے نرمی کا سلوک کیا لیکن جب انھیں یہ خبر ملی کہ واقعہ قتادہ کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ کے گوش گزار ہو چکا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے ایک خطیب کے پاس گئے کہ وہ چند افراد کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں جائے اور قیافہ سے حقیقی چوروں کو بری الذمہ قرار دے اور کہے کہ قتادہ نے جھوٹا الزام لگایا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے (ظاہر پر عمل کرنے کے فریضہ) کے مطابق اس گروہ کی شہادت کو قبول کر لیا اور قتادہ کو سزا کا مستحق قرار دیا، قتادہ جو بے گناہ تھا اس سے بہت پریشان ہوا اور اپنے چچا کے پاس لوٹ کر گیا اور بہت زیادہ افسوس کے ساتھ واقعہ بیان کیا تو اس کے چچا نے اس کی دلجوئی کی اور کہا کہ پریشان نہ ہو خدا ہمارا نگہبان ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس بے گناہ شخص کو بری الذمہ قرار دیا اور حقیقی خیانت کرنے والوں کی شدید سرزنش کی۔

اس آیت کی ایک اور شان نزول (بھی) نقل ہوئی ہے کہ ایک انصاری کی زرہ کسی جنگ میں چوری ہو گئی، شک بنی ابیرق قبیلہ کے ایک شخص پر تھا۔ چور کو جب خطرہ نظر آیا تو اس نے وہ زرہ ایک یہودی کے گھر میں پھینک دی اور اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اس کی صفائی دیں اور کہیں کہ زرہ تو یہودی کے گھر میں ہے اس لیے وہ بری الذمہ ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے جب یہ صورت دیکھی تو ظاہری طور پر اسے بری الذمہ قرار دیا اور یہودی کے خلاف فیصلہ دیا اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور حقیقت کو واضح کیا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو

خدا ان آیات میں پہلے تو پیغمبر اکرمؐ کو وصیت کرتا ہے کہ اس آسمانی کتاب کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے اصول جاری ہوں، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ اس کے ذریعے خدا نے تجھے جو علم دیا ہے لوگوں کے درمیان فیصلے کرو (انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ) اس کے بعد کہتا ہے کبھی بھی خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرو (ولا تکن للخائنین خصیما) اگرچہ بظاہر روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے لیکن اس میں شک و شبہ نہیں کہ یہ ایک عمومی حکم ہے جو تمام قاضیوں اور فیصلہ کرنے والوں کے لیے ہے اس بنا پر اس قسم کے خطاب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ممکن ہے کہ اس قسم کا معاملہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ پیش آیا ہے کیونکہ اس مذکورہ حکم کا



تعلق تمام افراد سے ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو بارگاہِ خداوندی سے طلب مغفرت کے لیے کہا گیا ہے (واستغفر اللّٰہ) کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے (ان اللّٰہ کان غفوراً رحیماً)۔

یہ کہ یہاں استغفار کس لیے ہے اس میں کئی احتمال ہیں:

پہلا یہ کہ استغفار اس ترک اولیٰ کی بنا پر ہے جو فیصلہ میں جلدی کرنے کی وجہ سے آیات کی شانِ نزول کے بارے میں آیا ہے یعنی اگر چہ وہی اعتراف کی نوعیت اور طرفین کی گواہی تمھارے فیصلہ کرنے کے لیے کافی تھی لیکن بہتر یہ تھا کہ پھر بھی اس معاملے میں مزید تحقیق کی جاتی

دوسرا یہ کہ پیغمبر اکرمؐ نے اسی شانِ نزول کے متعلق اسلام کے قضائی قوانین کے مطابق فیصلہ کیا اور چونکہ خیانت کرنے والوں کی سند اور ثبوت ظاہری طور پر زیادہ مستحکم تھے لہٰذا انھیں حق بجانب قرار دیا گیا پھر حق کے سامنے آجانے اور حق داروں کو حق مل جانے کے بعد حکم دیتا ہے کہ خدا سے مغفرت طلب کرو نہ کہ اس بنا پر کہ کوئی گناہ سرزد ہوا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ بعض لوگوں کی سازش کی وجہ سے ایک مسلمان کا حق سلب ہو رہا تھا (یعنی استغفار حکمِ واقعی سبب ہے نہ کہ حکم ظاہری)۔

یہ احتمال بھی بیان ہوا ہے کہ یہاں استغفار کا حکم طرفین دعویٰ کو دیا گیا ہے جنھوں نے دعویٰ پیش کیا اور پھر اس سلسلے میں کئی ایک غلط گواہیاں دیں۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہوا ہے آپ نے فرمایا ـــــ:

انما انا بشر وانکم تختصمون الی ولعل بعضکم یکون الحن بحجته من بعض فاقضی نحو ما اسمع فمن قضیت له من حق اخیه شیئا فلا یاخذه فانما اقطع له قطعة من النار۔

میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں (اور ظاہری امور پر فیصلے کرنے پر مامور ہوں) شاید تم میں سے بعض وہی دلیل بیان کرتے وقت بعض دوسروں سے زیادہ قوی ہوں اور میں بھی اسی دلیل کی بنا پر فیصلہ کروں گا باوجود اس کے جان لو کہ میرا فیصلہ جو طرفین کے دلائل کے سامنے آنے پر صادر ہوتا ہے وہ واقعی حق کو نہیں بدل سکتا لہٰذا اگر میں کسی کے حق میں (ظاہر کے مطابق) فیصلہ کر دوں اور دوسرے کا حق اسے دے دوں تو میں جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اسے دے رہا ہوں اسے چاہیے کہ وہ اس سے بچے اور نہ لے [1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ظاہر کے مطابق اور دعویٰ کرنے والے طرفین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کریں۔ البتہ اس قسم کے فیصلوں سے عام طور پر حق دار کو حق مل جاتا ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات ظاہراً دلیل اور گواہوں کی گواہی واقع کے مطابق نہ ہو تو یہاں خیال کرنا چاہیے کہ فیصلہ کرنے والے کا حکم واقع کو نہیں بدل سکتا اور اس سے حق، باطل اور باطل حق نہیں ہو سکتا۔

---

[1] المنار ج ۵ ص ۳۹۴ منقول از صحیح بخاری و صحیح مسلم

[2] پہلا احتمال اور شان نزول والی روایات اور اس روایت کا ظہور قواعد مذہب کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت بخصوص قرآن ترک اولیٰ سے بھی معصوم تھے (مترجم)



۱۰۷۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ
خَوَّانًا أَثِيمًا ۝

۱۰۸۔ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ
مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝

۱۰۹۔ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ
عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝

ترجمہ

۱۰۷۔ اور جنھوں نے اپنے آپ سے خیانت کی ہے ان کا دفاع نہ کرو، کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۰۸۔ وہ اپنے بُرے کاموں کو لوگوں سے چھپاتے ہیں لیکن خدا سے نہیں چھپاتے اور رات کی مجالس میں ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خدا راضی نہ تھا خدا ان کے ساتھ تھا اور وہ جو عمل کرتے ہیں خدا اس پر محیط ہے۔

۱۰۹۔ جی ہاں تم تو وہی ہو جنھوں نے اس جہان کی زندگی میں ان کو بچایا لیکن کون ہے جو خدا کے سامنے قیامت کے دن ان کا دفاع کرے گا یا کون ہے جو ان کا وکیل اور حامی ہوگا۔

تفسیر

خیانت کرنے والوں کی حمایت نہ کرنے کے احکامات کے بعد ان آیات میں اس سلسلہ کو یوں جاری رکھا گیا ہے، کسی وقت بھی خیانت کرنے والوں کی اور ان کی جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں، حمایت نہ کرو۔ (و لا تجادل عن الذین یختانون انفسھم) کیونکہ خدا خیانت کرنے والے گنہ گاروں کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما)۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے، وہ لوگ جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم آیت کی شانِ نزول کے مطابق جانتے ہیں کہ انھوں نے دوسروں سے خیانت کی تھی یہ اسی لطیف معنی کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی قرآن نے بارہا یاد دھانی کرائی ہے کہ انسان سے جو بھی عمل سرزد ہو اس کے اچھے یا بُرے آثار معنوی ہوں یا مادی ہر ایک سے پہلے خود اس پر



اثر انداز ہوں گے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم و ان اساتم فلھا۔

اگر نیک کام کرتے ہو تو اپنے نفوس کے لیے کرتے ہو اور اگر برائی کرو تو بھی اپنے نفس کے لیے ہے۔ ؎

یا یہ ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی قرآن تائید کرتا ہے اور وہ یہ کہ تمام افراد ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں اگر ایک کسی دوسرے کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے تو اس طرح خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بعینہ اس شخص کی طرح جو اپنے ہاتھ سے اپنے منہ پر طمانچہ مارے۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آیت ان افراد کے بارے میں نہیں کہ جو مثلاً ایک ہی دفعہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر اس پر پشیمان ہو گئے ہوں کیونکہ ایسے اشخاص کے بارے میں سختی نہیں بلکہ نرمی برتنی چاہیے۔ آیت تو ان افراد کے بارے میں ہے جن کی زندگی کا لائحہ عمل ہی خیانت ہے "یَخْتَانُوْنَ" کے قرینہ سے جو کہ فعل مضارع ہے اور ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے اور "خوان" کے قرینہ سے بھی جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت خیانت کرنے والا"۔ اَثِیْمًا کا معنی "گنہ گار" ہے یہ "خوان" کی تاکید کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ گذشتہ آیت میں بھی اسے خائن قرار دیا گیا ہے اور خائن اسم فاعل ہے اور وصفی معنی رکھتا ہے نیز تکرار عمل کی علامت ہے۔ پھر ایسے خیانت کاروں کی سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے انھیں شرم آتی ہے کہ ان کے اعمال کا باطن لوگوں کے سامنے ظاہر ہو لیکن وہ خدا سے تو شرم نہیں کرتے (یستخفون من الناس و لا یستخفون من اللّٰہ) وہ خدا جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور جس وقت رات کی تاریکی میں وہ خیانت کار سازشیں اور منصوبے بناتے تھے اور وہ باتیں کرتے ہیں کہ جن سے خدا راضی نہیں وہ (خدا) ان کے ساتھ تھا اور وہ ان کے تمام اعمال پر محیط ہے (وھو معھم اذ یبیتون ما لا یرضی من القول و کان اللّٰہ بما یعملون محیطا) اس کے بعد روئے سخن چور کے قبیلے کے ان افراد کی طرف ہے جنھوں نے اس کا دفاع کیا تھا۔ خدا انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے تعجب ہے کہ تم اس جہان کی زندگی میں تو ان کا دفاع کرتے ہو، لیکن کون ہے جو قیامت کے دن ان کا دفاع کرے یا وکیل بن کر ان کے کام آئے اور ان کی مصیبتوں اور ابتلاؤں کو ختم کرے (ھا انتم ھؤلاء جادلتم عنھم فی الحیوۃ الدنیا فمن یجادل اللّٰہ عنھم یوم القیامۃ ام من یکون علیھم وکیلا) اس وجہ سے تمھاری طرف سے ان کا دفاع معمولی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دائمی زندگی میں خدا کے سامنے ان کا کوئی دفاع کرنے والا نہیں ہے۔

حقیقت میں اوپر والی تین آیات میں پہلے تو پیغمبر اسلامؐ اور سب قاضیوں کو حق کی وصیت کی گئی ہے کہ وہ مکمل طور پر نگرانی اور دھیان رکھیں کہ کچھ لوگ حیلہ سازی اور جھوٹے گواہوں کے ذریعے دوسروں کے حقوق پائمال نہ کریں پھر خیانت کرنیوالوں اور بعد میں ان کا دفاع کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اس جہان اور دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے بُرے نتائج پر نظر رکھیں۔

؎ بنی اسرائیل ۷



اور یہ بلاغت قرآن کا ایک راز ہے کہ ہر واقعہ میں چاہے وہ ظاہراً جتنا بھی معمولی اور چھوٹا ہو وہ ایک ذرہ بھر یا تھوڑے سے اناج کے گرد گھومتا ہو، یا اس میں ایک یہودی اور دشمن اسلام کا ہاتھ ہو اس کے تمام پہلوؤں پر کھوج اور تحقیق کرتے ہوئے پوری توجہ دلاتا ہے اور ہر موقع پر خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔ خدا کے عظیم پیغمبر سے لے کر جس کا دامن عصمت کی بناء پر ہر قسم کے گناہ سے پاک ہے خیانت پیشہ گنہگار افراد اور ان لوگوں تک جو رشتہ داری کے تعصبات کی وجہ سے اس قسم کے افراد کا دفاع کرتے ہیں ہر ایک پر اس کی مناسبت سے بحث کرتا ہے۔

۱۱۰۔ وَمَنْ يَعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

۱۱۱۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

۱۱۲۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○ ع

ترجمہ

۱۱۰۔ جو شخص کوئی برا کام کرے یا اپنے اوپر ظلم کرے پھر خدا سے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔

۱۱۱۔ اور جو کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

۱۱۲۔ جو شخص غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو پھر بے گناہ پر الزام دھرے اس نے بہتان اور واضح گناہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر لاد لیا ہے۔

تفسیر

ان تین آیات میں خیانت اور تہمت سے متعلق بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔ تین عمومی احکامات بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ پہلے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ توبہ کی راہ بدکار لوگوں کے لیے ہر حال کھلی ہے اور جو شخص اپنے اوپر



یا کسی دوسرے پر ظلم کرے اور بعد میں حقیقتاً پشیمان ہو اور خدا سے مغفرت طلب کرے اور وہ اس کی تلافی کی کوشش بھی کرے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا (و من یعمل سوءا او یظلم نفسہ ثم یستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما)۔غور کرنا چاہیے کہ آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں ایک "سوء" اور دوسری کسی پر ظلم ۔ قرینہ مقابلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور "سوء" کے اصل لغوی معنی (دوسرے کو نقصان پہنچانا) سے اسلح معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا گناہ جس سے انسان دوسرے کو نقصان پہنچائے یا اپنے آپ کو وہ حقیقی توبہ اور تلافی کی صورت میں قابلِ بخشش ہے۔

ضمنی طور پر یجد اللہ غفورا رحیما (خدا کو بخشنے والا، مہربان پائے گا) سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی توبہ یہ اثر رکھتی ہے کہ انسان اپنے نفس کے اندر ہی اس کا نتیجہ پا لیتا ہے ایک طرف خدا کے غفور ہونے کے تصور سے گناہ کا پریشان کن اثر زائل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف وہ محسوس کرتا ہے کہ معصیت کے سبب وہ رحمت والطاف الٰہی سے دور ہو گیا تھا اور اب اس کی رحیمیت کی وجہ سے دوریاں ختم ہو گئی ہیں اور وہ خدا کے نزدیک ہو گیا ہے۔

۲۔ دوسری آیت اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جس کا اجمال گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ "انسان جس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے نتیجۃً اس سے اپنے آپ کو مزید نقصان میں مبتلا کر لیتا ہے (و من یکسب اثما فانما یکسبہ علی نفسہ) اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ خدا عالم ہے اور بندوں کے اعمال سے باخبر ہے اور وہ حکیم و دانا بھی ہے اور ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق سزا و جزا دیتا ہے (وکان اللہ علیما حکیما)۔

اس طرح گناہ اگرچہ ظاہر میں مختلف ہیں کبھی کسی گناہ کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اور کبھی اس کا نقصان اپنے آپ کو ہوتا ہے۔ لیکن اس کا حقیقی اور آخری نتیجہ بہر حال خود انسان کے اپنی طرف لوٹتا ہے اور گناہ کے بُرے اثرات سب سے پہلے خود انسان کی روح اور نفس میں ظاہر ہوتے ہیں [1]

۳۔ آخری آیت میں بے گناہ افراد پر تہمت لگانے کے گناہ کی شدت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "جو شخص خطا یا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے کسی بے گناہ کے سر تھوپتا ہے اس نے بہتان باندھا ہے اور واضح گناہ کا ارتکاب کیا ہے (و من یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بھتانا و اثما مبینا) اس آیت میں وہ گناہ کہ جن کا انسان مرتکب ہوا ہو اور پھر انھیں دوسرے کے سر تھوپ دے ان کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک خطیئۃ اور دوسرا اثم ان دونوں کے درمیان فرق کے سلسلہ میں مفسرین اور اہل لغت میں بہت اختلاف ہے جو معنی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "خطیئۃ" "خطا" سے ہے جو دراصل ان گناہوں اور لغزشوں کے معنی میں ہے جو انسان سے قصد اور ارادہ کے بغیر سرزد ہو جائیں اور بعض اوقات ان کا کفارہ اور تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بتدریج خطیئۃ کے معنی میں

---

[1] شعلۂ اول نصیبِ دامن "آتش زنہ" است ۔ این سزائے آن کہ بوسد آستانِ ظلم را۔ آگ کا پہلا شعلہ جلانے والے کے دامن کو جلاتا ہے ۔ آستانۂ ظلم پر بوسہ دینے کی یہی سزا ہے۔



وسعت پیدا ہو گئی اور وہ ہر گناہ کے بارے میں استعمال ہونے لگا چاہے وہ عمداً ہو یا بھول کر۔ کیونکہ کسی قسم کا گناہ (چاہے وہ عمداً ہو یا بھول کر) انسان کی روحِ سلیم کے لیے مناسب نہیں ہے اور اگر اس سے سرزد ہو جائے تو حقیقت میں ایک قسم کی لغزش اور خطا ہے جو اس کے مقام و مرتبے کے منافی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خطیئۃ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں عمدی اور غیر عمدی گناہ دونوں شامل ہیں۔ لیکن اثم عموماً عمدی اور اختیاری گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ دراصل اثم ایسی چیز کے معنی میں ہے جو انسان کو کسی کام سے باز رکھے اور چونکہ گناہ انسان کو بھلائی کے اور اچھے کاموں سے دور رکھتے ہیں لہٰذا انھیں "اثم" کہا جاتا ہے۔

ضمناً توجہ کرنی چاہیے کہ آیت میں تہمت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر استعمال کی گئی ہے اور وہ یہ کہ گناہ کو تیر کی طرح قرار دیا گیا ہے اور دوسرے کی طرف اس کی نسبت دینے کو تیر بدف کی طرف چھوڑنے کی طرح قرار دے کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح کسی کی طرف تیر پھینکنا ممکن ہے اسے ختم کر دے، اسی طرح گناہ کے تیر کو بھی کسی ایسے شخص کی طرف چھوڑنا جو گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ممکن ہے کہ اس کی عزت اور آبرو کو برباد کر دے جو دراصل اس کے قتل کی طرح ہے۔ واضح ہے اس عمل کا بوجھ ہمیشہ کے لیے ایسے شخص کے کندھے پر باقی رہے گا جس نے تہمت لگائی ہے اور "احتمل" (اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے) یہ لفظ بھی اس ذمہ داری کی اہمیت اور اس کے ہمیشہ قائم رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

جُرمِ تہمت

کسی بے گناہ پر تہمت باندھنا بدترین افعال میں سے ہے کہ جس کی اسلام نے شدت سے مذمت کی ہے۔ زیرِ نظر آیت اور متعدد اسلامی روایات جو اس ضمن میں ملتی ہیں اس کے لیے اسلام کا نظریہ واضح کرتی ہیں۔ امام صادقؑ ایک حکیم و دانا سے نقل کرتے ہیں:

البهتان على البرئ اثقل من جبال راسيات

بے گناہ پر بہتان باندھنا عظیم پہاڑوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ [1]

بے گناہ افراد پر بہتان باندھنا روح ایمان کے منافی ہے جیسا کہ امام صادقؑ سے منقول ہے:

اذا اتهم المؤمن اخاه انماث الايمان فى قلبه كما ينماث الملح فى الماء

جو شخص اپنے مومن بھائی پر تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح گُھل جاتا ہے جس طرح نمک پانی میں گُھل جاتا ہے۔ [2]

حقیقت میں بہتان اور تہمت، جھوٹ کی بدترین اقسام میں سے ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کے عظیم مفاسد اور غیبت کے نقصانات بھی شامل ہیں اور یہ ظلم و ستم کی بدترین قسم بھی ہے اس لیے پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اول مادہ "بہت"

[2] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۶۹ باب التهمة وسوء الظن



من بهت مؤمنا او مؤمنة او قال فيهما ماليس فيه اقامه الله تعالى يوم القيامة على تل من نار حتى يخرج مما قاله

جو شخص کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان باندھے یا ان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے جو ان میں نہ ہو تو خداوند عالم اسے قیامت کے دن آگ کے ایک ٹیلے پر کھڑا کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہ اس بات سے بری الذمہ ہو جائے جو اس نے کہی ہے[1]

حقیقت میں اس گھٹیا اور بزدلانہ کام کے رائج ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کا نظم و نسق اور اجتماعی انصاف برباد ہو جاتا ہے حق اور باطل آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں بے گناہ افراد گرفتار بلا ہو جاتے ہیں گنہ گار افراد بچے رہتے ہیں اور باہمی اعتماد ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

۱۱۳۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۱۳۔ اگر خدا کا فضل اور اس کی رحمت تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ تمھیں گمراہ کر دے لیکن وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے اور وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور خدا نے کتاب و حکمت تم پر نازل کی اور تمھیں اس چیز کی تعلیم دی جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر خدا کا عظیم فضل تھا۔

تفسیر

یہ آیت بنی ابیرق کے حادثہ کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قبل کی چند آیات کی شان نزول میں اس کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔

آیت کہتی ہے، اگر خدا کا فضل و رحمت تمھارے شامل حال نہ ہوتا تو (منافقین یا ان جیسے) بعض لوگ مصمم ارادہ کر چکے

---

[1] سفینۃ البحار جلد اوّل صفحہ ۱۱۱



بیٹھے کہ تمھیں راہِ حق و عدالت سے منحرف کر دیں لیکن لطفِ الٰہی تمھارے شاملِ حال رہا اور اس نے تمھاری حفاظت کی (ولو لا فضل اللہ علیک و رحمتہ لھمت طائفۃ منھم ان یضلوک)۔

وہ چاہتے تھے کہ ایک بے گناہ شخص پر تہمت لگائیں اور پھر پیغمبر کو اس واقعے میں ملوّث کریں تاکہ اس طرح ایک تو پیغمبر اکرمؐ کی اجتماعی اور معنوی حیثیت کو نقصان پہنچے اور دوسرا ایک بے گناہ مسلمان کے ذریعے اپنی بُری اغراض پوری کر سکیں لیکن وہ خدا جو اپنے پیغمبر کا محافظ ہے اس نے ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کر دیا۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ:

قبیلہ بنی ثقیف کا ایک وفد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہم دو شرطوں کے ساتھ آپ کی بعیت کے لیے تیار ہیں پہلی یہ کہ ہم اپنے بت اپنے ہاتھ سے نہیں توڑیں گے اور دوسری یہ کہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم مزید ایک سال تک عزیٰ بُت کی پرستش کرتے رہیں۔

خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان تجاویز کے لیے کوئی میلان ظاہر نہ کریں۔

اسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں پیغمبر اکرمؐ سے کہا گیا کہ لطفِ خدا آپؐ کو ان وسوسوں سے محفوظ رکھے گا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے، یہ لوگ صرف اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے (وما یضلون الا انفسھم و مایضرونک من شیء)۔

آخر میں گمراہی، خطا اور گناہ سے پیغمبرؐ کے محفوظ رہنے اور پیغمبرؐ کی معنویت کی علت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آپ پر خدا نے کتاب و حکمت نازل کی اور جو آپ نہیں جانتے تھے آپ کو اس کی تعلیم دی (و انزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم)۔

بعد ازاں فرماتا ہے: آپ پر اللہ کا بہت ہی زیادہ فضل و کرم تھا (وکان فضل اللہ علیک عظیمًا)۔

انبیاء کا سرچشمۂ عصمت

مندرجہ بالا آیت ان آیات میں سے ہے جو نبی کے خطا، اشتباہ اور گناہ سے محفوظ ہونے کی نشاندہی کرتی ہیں ارشاد ہوتا ہے: اگر خدا کی امداد تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ تمھیں گمراہ کر دیتے لیکن امدادِ الٰہی کی وجہ سے وہ تمھیں گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور اس سلسلے میں تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اس طرح سے دراصل خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطا اور گناہ سے محفوظ رکھا ہے تاکہ:

— پیغمبر امت کے لیے نمونۂ عمل بن سکے اور نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے امت کے واسطے ایک معیار قرار پا سکے۔

— ایک عظیم رہبر کی حیثیت سے لغزشوں کے المناک انجام اور نتیجے سے محفوظ رہ سکے۔ یوں اُمت بھی طاعتِ پیغمبر میں سرگردانی سے مامون رہے اور اطاعت و عدمِ اطاعت کے تضاد کا شکار نہ ہو جائے۔



۔۔۔۔ لوگوں کو پیغمبر پر کامل اعتماد ہو سکے کیونکہ کامل اعتماد خدائی رہبری کی پہلی شرط ہے۔

آیت میں مسئلہ عصمت کی ایک بنیادی دلیل اجمالی طور پر بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو علوم تعلیم فرمائے جن کی وجہ سے وہ گناہ اور خطاء سے بالکل مامون و محفوظ ہو گئے ہیں کیونکہ علم و دانش (جب اپنے آخری مرحلے کو پہنچ جائے تو) موجب عصمت ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر ایسے پانی کو ہرگز نہیں پی سکتا جس میں ملیریا اور دیگر بیسیوں بیماریوں کے جراثیم موجود ہوں اور جنہیں وہ خود لیبارٹری میں دیکھ چکا ہو اور ان کے ہولناک اثرات سے بھی آگاہ ہو یعنی اس کا علم اسے ایسا عمل کرنے سے روکتا ہے جبکہ جہالت میں ممکن ہے وہ ایسا کام کر جاتا۔ اس بنا پر جو شخص وحی الٰہی اور پروردگار کی تعلیم کے ذریعے مختلف مسائل کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہو وہ لغزش و اشتباہ کا شکار ہوتا ہے نہ گمراہی و گناہ میں پڑتا ہے ۔۔۔۔۔۔ یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ پیغمبر گناہ نہ کرنے پر مجبور ہے بلکہ پیغمبر کو خدا کی طرف سے علم تو ہوتا ہے لیکن وہ اس سے مجبور نہیں ہو جاتا۔ یعنی پیغمبر کبھی اپنے علم پر عمل کرنے پر مجبور نہیں ہوتا بلکہ اپنے اختیار سے اس علم پر عمل کرتا ہے جیسے مذکورہ مثال میں ڈاکٹر اس آلودہ پانی کی کیفیت سے آگاہی کے باوجود اسے نہ پینے پر مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اسے نہیں پیتا۔

اور اگر کہا جائے کہ پیغمبر کے لیے یہ فضل الٰہی کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا رہبری کی اہم اور بھاری ذمہ داری کی بنا پر ہے جو ان کے کندھے پر رکھی گئی ہے اور دوسروں کے دوش پر نہیں ہے کیونکہ خدا جتنی کسی پر مسئولیت اور ذمہ داری ڈالتا ہے اتنی ہی اسے توانائی اور قدرت عطا کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

۱۱۴۔ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۱۱۴۔ ان کی بہت سی سرگوشیوں (اور خفیہ میٹنگوں) میں خیر و سود مندی نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی شخص (اس طریقے سے) دوسروں کی مدد، کوئی نیک کام یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرے اور جو شخص رضائے الٰہی کے لیے یہ سب کچھ کرے تو اسے ہم عظیم اجر دیں گے۔



تفسیر

سرگوشیاں

گذشتہ آیات میں بعض منافقین یا ان جیسے لوگوں کے راتوں کے مخفی اور شیطانی جلسوں اور میٹنگوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں "نجویٰ" کے زیرِ عنوان ذرا تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

'نجویٰ' کا معنی صرف کان میں باتیں کرنا یا سرگوشی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی مخفی اور پوشیدہ میٹنگوں کو بھی 'نجویٰ' کہتے ہیں کیونکہ اصل میں 'نجویٰ'، 'نجوۃ' (بروزنِ دفعہ) کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے اونچی زمین۔ بلند زمینیں چونکہ اپنے اطراف سے جدا ہوتی ہیں اور خفیہ میٹنگیں اور سرگوشیاں بھی اطراف والوں سے جدا ہوتی ہیں لہٰذا انھیں 'نجویٰ' کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سب الفاظ 'نجات' کے مادہ سے ہیں جس کا معنی ہے 'رہائی' اور کیونکہ ایک بلند جگہ سیلاب کے حملے سے نجات ہوتی ہے اور خفیہ میٹنگ اور سرگوشی بھی دوسروں کی اطلاع سے دور ہوتی ہے اس لیے اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

بہرحال آیت کہتی ہے، ان کی زیادہ تر خفیہ میٹنگیں جو شیطانی سازشوں اور منصوبوں کے تحت منعقد ہوتی ہیں ان میں ان کی کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں ہے (لا خیر فی کثیر من نجوٰھم)۔

اس کے بعد اس لیے کہ کہیں یہ گمان نہ ہو کہ ہر طرح کی سرگوشی اور مخفی میٹنگ مذموم و ممنوع ہے ایک کلی قانون میں استثنائی صورت کے مواقع بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر یہ کہ کوئی شخص اس کے ذریعے صدقہ کی وصیت کرتا ہو، دوسروں کی مدد کا اقدام کرتا ہو، نیک کام انجام دیتا ہو، یا لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہو (الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس)۔

ایسی سرگوشیاں اور میٹنگیں اگر ریاکاری اور تظاہر کے لیے نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد رضائے پروردگار ہو تو خدا ان کیلیے اجرِ عظیم مقرر فرمائے گا (ومن یفعل ذٰلک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نؤتیہ اجرا عظیما)

اصولی طور پر سرگوشیوں، کانا پھوسیوں اور خفیہ میٹنگوں کو قرآن نے ایک شیطانی عمل قرار دیا ہے:

"انما النجویٰ من الشیطان"

یعنی۔ 'نجویٰ' شیطان کی طرف سے ہے (مجادلہ ـ ۱۰)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا عمل عموماً غلط کاموں کے لیے ہوتا ہے چونکہ نیک مفید اور مثبت کاموں کی انجام دہی کیلیے عموماً کوئی خفیہ اور پوشیدہ چیز نہیں ہوتی ہاں البتہ بعض اوقات خلاف معمول حالات کی وجہ سے انسان مجبور ہوجاتا ہے کہ نیک کاموں کو مثبت طور پر مخفیانہ بجالائے یہ استثنائی صورت بارہا قرآن میں بیان کی گئی ہے مثلاً:

یاایھا الذین اٰمنوا اذا تناجیتم فلاتتناجوا



بالاثم و العدوان و معصیۃ الرسول و تناجوا
بالبر و التقوٰی

اے ایمان والو! جب تم سرگوشی یا اخفاء کرو تو گناہ، ظلم اور پیغمبر کی نافرمانی کے لیے نہ ہو اور صرف نیک کاموں اور پرہیزگاری کے لیے 'نجویٰ' کرو۔ (مجادلہ - ۹)

بنیادی طور پر اگر سرگوشی اور نجویٰ بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کی موجودگی میں کریں تو یہ دوسروں میں سوئے ظن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور بعض اوقات دوستوں میں بدگمانی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ضرورت کے بغیر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے اور قرآن کے مذکورہ حکم کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ البتہ کبھی آبروئے انسانی کی حفاظت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کی چھپ کر مالی امداد کرنا، جسے زیرِ نظر آیت نے صدقہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح کبھی امر بالمعروف اگر کھلے بندوں کیا جائے تو دوسرے کی شرمندگی کا باعث ہوتا ہے اور ممکن ہے اس طرح سے وہ نصیحت قبول نہ کرے اور اپنے طریقہ کار پر ہٹ دھرمی دکھائے۔ آیت میں اس کا ذکر 'معروف' کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس کی ایک اور مثال لوگوں کے درمیان صلح و مصالحت کا موقع ہے۔ بعض اوقات مسائل کو علی الاعلان بیان کیا جائے تو اس سے مصالحت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں طرفین سے محرمانہ اور رازدارانہ طریقے سے گفتگو کرنا چاہیے تاکہ مصالحت کا مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔

مذکورہ تین مواقع پر اور ایسے ہی دیگر مواقع پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مثبت کام 'نجویٰ' کے زیرِ سایہ انجام دیے جائیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ تینوں کام 'صدقہ' کے مفہوم میں آجاتے ہیں کیونکہ جو شخص امر بالمعروف کرتا ہے وہ علم کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور جو صلح و مصالحت کرواتا ہے وہ لوگوں میں موجود اپنے اثر و رسوخ کی زکوٰۃ دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ سے منقول ہے:

ان اللّٰہ فرض علیکم زکوۃ جاھکم کما فرض علیکم زکوۃ ما ملکت ایدیکم۔

یعنی - خدا نے تم پر فرض اور واجب قرار دیا ہے کہ اپنے اثر و رسوخ اور معاشرتی حیثیت کی زکوٰۃ ادا کرو۔ جیسا کہ اس نے واجب کیا ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا کرو[1]

نیز پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

الا ادلک علی صدقۃ یحبھا اللّٰہ و رسولہ تصلح بین

---

[1] نور الثقلین ج ۱، صفحہ ۵۰۵ اور دیگر تفاسیر



الناس اذا تفاسدوا و تقرب بینھم اذا تباعدوا ۔

یعنی ـــ کیا تجھے ایسے صدقہ سے آگاہ کروں جسے خدا اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں (اور وہ یہ ہے کہ) جب لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں تو ان میں صلح کروا دو اور جب وہ ایک دوسرے سے دور ہوجائیں تو انھیں نزدیک لاؤ۔[1]

۱۱۵۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۱۵۔ جو شخص حق واضح ہوجانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور راہِ مومنین کے علاوہ کسی راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی راہ پر لیے جاتے ہیں جس پر وہ جارہا ہے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

شانِ نزول

گذشتہ آیات کی شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بشیر بن ابیرق نے ایک مسلمان کی چوری کرنے کے بعد اس کا الزام ایک بے گناہ شخص پر دھر دیا اور حیلہ سازی سے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے دیا۔ لیکن مذکورہ آیات کے نزول سے وہ رسوا ہوگیا۔ اس رسوائی کے بعد بجائے اس کے کہ توبہ کرتا اور راہِ حق پر لوٹ آتا، اس نے کفر کا راستہ اختیار کرلیا اور واضح طور پر مسلمانوں سے الگ ہوگیا اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سلسلے میں اسلام کا ایک عمومی حکم بیان کیا۔

تفسیر

جب انسان کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو آگاہی کے بعد اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک ہے بازگشت اور توبہ کا راستہ، جس کے ذریعے گناہ کے اثرات دُھل جاتے ہیں اور اس کا تذکرہ گذشتہ چند آیات میں ہوچکا ہے۔ دوسرا ہے ہٹ دھرمی اور عناد کا راستہ، جس کے منحوس نتیجے کے بارے میں زیر بحث آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۳ صفحہ ۱۹۵۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



جو شخص حق آشکار ہونے کے بعد رسول کے سامنے مخالفت اور عناد کا مظاہرہ کرے اور راہ مومنین کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے تو ہم اسے اسی راستے کی طرف کھینچے لیے جائیں گے جس پر وہ جا رہا ہے اور روز قیامت ہم اُسے جہنم میں ڈالیں گے اور کیسی بُری جگہ اس کے انتظار میں ہے (ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ و یتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ماتولی ونصله جهنم وساءت مصیرًا)۔

توجہ رہے کہ "یشاقق" "شقاق" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے ایسی سوچی سمجھی مخالفت جس میں عداوت و دشمنی ملی ہوئی ہو۔
"من بعد ماتبین له الهدیٰ" (یعنی ــ ہدایت اور راہ راست واضح ہو جانے کے بعد) ـــــ یہ جملہ بھی اسی معنی کی تاکید کرتا ہے۔ درحقیقت اس سے بہتر انجام ایسے لوگوں کے بس میں ہی نہیں ــ ان کا انجام اِس دنیا میں بھی منحوس اور افسوس ناک ہے اور اُس جہان میں بھی دردناک ہے۔ اِس جہان میں اس طرح جیسے قرآن کہتا ہے کہ وہ دن بدن اپنی غلط راہ میں زیادہ راسخ ہوتے جاتے ہیں وہ بے راہ روی میں جتنا آگے بڑھتے ہیں جادۂ حق سے ان کا زاویہ انحراف اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ وہ انجام ہے جو انھوں نے اپنے لیے خود اختیار کیا ہے یہ ایسی تعمیر ہے جس کا سنگ بنیاد انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے رکھا ہے لہٰذا اس انجام کے سلسلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا۔ یہ جو ارشاد الٰہی ہے کہ نوله ماتولیٰ ــ یعنی ہم اسے اسی راہ کی طرف کھینچیں گے جس پر وہ چل رہا ہے ــ یہ دراصل توفیق معنوی سلب ہونے، تشخیص حق نہ کرنے اور بے راہ روی میں پیش رفت کرنے کی طرف اشارہ ہے [1]۔

نوله ماتولیٰ ـ کے بارے میں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ "ہم ایسے لوگوں کو انھی جعلی معبودوں کی سرپرستی میں رہنے دیں گے جو انھوں نے اپنے لیے خود منتخب کر رکھے ہیں" "نصله جهنم" قیامت میں انکے انجام کی طرف اشارہ ہے۔

اجماع کی حُجیت

فقہ کی چار دلیلوں میں سے ایک اجماع ہے اس کا معنی ہے کہ کسی ایک مسئلے پر اسلامی علماء کا اتفاق رائے۔

اصولِ فقہ میں اجماع کی حُجیت ثابت کرنے کے لیے مختلف دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ بعض کے نزدیک ان میں سے ایک زیر بحث آیت بھی ہے۔ کیونکہ آیت کہتی ہے کہ جو شخص مومنین کے طریق کے علاوہ کوئی راستہ انتخاب کرے تو وہ دنیا اور آخرت میں بدبخت انجام ہو گا۔ اس لیے جب مومنین کسی مسئلے میں ایک راہ انتخاب کر لیں تو سب کو چاہیے کہ اس کی پیروی کریں۔

لیکن حق یہ ہے کہ زیر نظر آیت کا اجماع کی حجیت سے کوئی تعلق نہیں (اگرچہ ہم اجماع کی حجیت کے قائل ہیں البتہ اس شرط کے ساتھ کہ زیر بحث مسئلے میں قول معصوم بھی موجود ہے یا معصوم ذاتی طور پر اصحاب اجماع میں موجود ہو، اگرچہ ناشناس طور پر ہی موجود ہو، لیکن ایسے اجماع کی حُجیت کی دلیل دراصل سنت اور قولِ معصوم ہی کی حجیت ہے

---

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱ (اردو ترجمہ ص ۱۴۰) میں "خدا کی طرف سے ہدایت و گمراہی" کے زیر عنوان تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔



نہ کہ درج بالا آیت حجیتِ اجماع پر دلیل ہے)۔

آیت کے حجیت اجماع پر دلیل نہ ہونے کے بارے میں عرض ہے کہ:

۱۔ جو سزائیں آیت میں معیّن ہوئی ہیں وہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو جانتے بوجھتے پیغمبر کی مخالفت کریں اور راہِ مومنین کے علاوہ کوئی راستہ منتخب کریں یعنی یہ دونوں امور جمع ہوں تو اس کا نتیجہ وہ ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے اور یہ وہ مخالفت ہے جو علم و آگاہی سے کی جائے اس صورتِ حال کا تو حجیت اجماع کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں۔ اور یہ امر تنہا اجماع کو حجت قرار نہیں دیتا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ سبیل المومنین سے مراد راہِ توحید، خدا پرستی اور اصل اسلام ہے نہ کہ فقہی فتاوی اور فروعی احکام جیسا کہ شانِ نزول کے علاوہ آیت کا ظاہر بھی اس حقیقت پر گواہ ہے اور حقیقت میں راہِ مومنین سے ہٹ کر کوئی راہ اپنانے کا مطلب مخالفت پیغمبر کے علاوہ اور کچھ نہیں دونوں باتوں کی بازگشت ایک ہی مفہوم کی طرف ہے یہی وجہ ہے کہ امام باقر علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

جس وقت حضرت امیرالمومنین علیؑ کوفہ میں تھے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے درخواست کی، آپ ہمارے لیے کسی پیش نماز کا انتخاب کریں (تاکہ ماہِ رمضان کی مستحب نمازیں جو تراویح کے نام سے مشہور ہیں اور حضرت عمر کے زمانے میں جماعت سے پڑھا کرتے تھے اس پیش نماز کے ساتھ پڑھ سکیں) امام علیہ السلام نے اس کام سے منع کیا اور ایسی جماعت سے روکا (کیونکہ نفلی نماز کے لیے جماعت صحیح نہیں ہے) اپنے امام و پیشوا کا قطعی حکم سننے کے باوجود یہ لوگ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے لگے انھوں نے واد و فریاد بلند کی: لوگو! آؤ اس ماہِ رمضان میں آنسو بہاؤ۔

دوستانِ علی میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے: کچھ لوگ آپ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔

آپ نے فرمایا: انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو جسے چاہیں منتخب کرلیں اور اس (غیر مشروع) جماعت کو بجا لائیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:[1] و من یشاقق الرسول ۔۔۔۔۔ الخ

ہم نے جو کچھ آیت کی تفسیر کے بارے میں کہا ہے یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

۱۱۶۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ○

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۵۵۱



ترجمہ

۱۱۶۔ خدا اپنے ساتھ کیے جانے والے شرک کو نہیں بخشتا (لیکن) اس سے کم تر کو جسے چاہے (اور مناسب سمجھے) بخش دیتا ہے اور جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔

تفسیر

شرک ــــ ناقابلِ معافی گناہ

منافقین اور مرتدین یعنی اسلام قبول کر لینے بعد کفر پر پلٹ جانے والوں سے مربوط مباحث کے بعد، یہاں دوبارہ گناہ شرک کی شدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسا گناہ ہے جو عفو و بخشش کے قابل نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ فرق کے ساتھ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۴۸ میں گذر چکا ہے۔

ایسی تکرار تربیتی مسائل میں لازمۂ بلاغت ہے کیونکہ بنیادی اور اہم مسائل کی فاصلے سے تکرار ہونا چاہیے تاکہ وہ نفوس میں راسخ ہو جائیں۔

درحقیقت گناہ بھی مختلف بیماریوں کی طرح ہیں جب تک بیماری بدن کے اصلی مراکز پر حملہ آور ہو کر انھیں بے کار نہیں کر دیتی بدن کی دفاعی قوت صحت و بہبود کے لیے کارآمد بنتی ہے لیکن اگر مثال کے طور پر بیماری بدن کے اصلی مرکز یعنی دفاع پر حملہ کر دے اور اسے مفلوج کر دے تو امید کے دروازے بند ہو جائیں گے اور موت یقین کی صورت میں آ کھڑی ہوگی۔ شرک ایک ایسی ہی بیماری ہے جو روحِ انسانی کا احساس مرکز بے کار کر دیتی ہے اور انسانی جان پر تاریکی و ظلمت کا چھڑکاؤ کرتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے نجات کی کوئی امید نہیں ہے۔ لیکن اگر حقیقت توحید اور یکتا پرستی جو ہر طرح کی فضیلت، جنبش اور تحریک کا سرچشمہ ہے زندہ ہو تو پھر دیگر گناہوں سے بخشش کی امید کی جا سکتی ہے (ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ آیت اس سورہ میں کچھ فرق کے ساتھ دو مرتبہ آئی ہے تاکہ شرک و بت پرستی کے وہ آثار جو سال ہا سال سے لوگوں کے نفوس کی گہرائیوں میں گھر بنا چکے تھے۔ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور توحید کے معنوی و مادی آثار ان کے شجرِ وجود پر آشکار ہو جائیں البتہ دونوں آیات میں تھوڑا سا فرق ہے بیان فرمایا گیا ہے، و من یشرک باللہ فقد ضل ضلالا بعیدا ـــ یعنی ـــ جو شخص خدا کے لیے شریک کا قائل ہو وہ دور کی گمراہی میں گرفتار ہے ـــ لیکن گذشتہ آیت میں ارشاد ہوا ہے، و من یشرک باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما ـــ یعنی ـــ جو شخص کسی کو خدا کا شریک بنا دے اس نے بہت بڑا جھوٹ اور افترا باندھا ہے۔



درحقیقت وہاں جنبۂ الٰہی اور خدا شناسی کے لحاظ سے شرک کے عظیم نقصان کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہاں لوگوں کے لیے اس کے ناقابل تلافی نقصانات بیان ہوئے ہیں وہاں مسئلے کا عملی پہلو مدنظر رکھا گیا ہے اور یہاں اس کے عملی پہلو اور خارجی نتائج کا ذکر ہے واضح ہے کہ اصطلاح کے مطابق یہ دونوں لازم وملزوم ہیں [1]

۱۱۷۔ اِنۡ يَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰـثًا‌ ۚ وَاِنۡ يَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَيۡـطٰنًا مَّرِيۡدًا ۙ‏

۱۱۸۔ لَّعَنَهُ اللّٰهُ‌ ۘ وَقَالَ لَاَ تَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِكَ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۙ‏

۱۱۹۔ وَّلَاُضِلَّـنَّهُمۡ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمۡ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُبَـتِّكُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَنۡ يَّتَّخِذِ الشَّيۡـطٰنَ وَلِيًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِيۡنًا ؕ‏

۱۲۰۔ يَعِدُهُمۡ وَيُمَنِّيۡهِمۡ‌ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡـطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا‏

۱۲۱۔ اُولٰۤـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ وَلَا يَجِدُوۡنَ عَنۡهَا مَحِيۡصًا‏

ترجمہ

۱۱۷۔ وہ خدا کو چھوڑ کر صرف بتوں کو پکارتے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں اور (یا) وہ صرف سرکش اور تباہ کار شیطان کو پکارتے ہیں۔

۱۱۸۔ خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں تیرے بندوں سے ایک معیّن مقدار لے کر رہوں گا۔

۱۱۹۔ اور میں انھیں گمراہ کروں گا اور آرزوؤں اور تمناؤں کے حصول میں سرگرم رکھوں گا اور انھیں حکم دوں گا کہ وہ (بے ہودہ اور فضول کام انجام دیں اور) چوپایوں کے کان چیر دیں اور خدا کی (پاک) خلقت کو خراب کر دیں (فطرتِ توحید کو شرک آلود کر دیں) اور وہ لوگ جنھوں نے خدا کی بجائے شیطان کو اپنا ولی چُنا ہے انھوں نے

[1] اس آیت کے سلسلے میں دیگر وضاحتیں تفسیر نمونہ جلد ۳ میں پیش کی جا چکی ہیں (دیکھیے اردو ترجمہ صفحہ ۲۹۴)



واضح نقصان کیا ہے۔

۱۲۰۔ شیطان ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا ہے اور انھیں آرزوؤں میں سرگرم رکھتا ہے اور مکر و فریب کے سوا انھیں کوئی وعدہ نہیں دیتا۔

۱۲۱۔ (شیطان کے) ان (پیروکاروں) کے رہنے کی جگہ جہنم ہے اور ان کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔

تفسیر

شیطانی سازشیں

پہلی آیت ان مشرکین کی حالت بیان کر رہی ہے جن کے منحوس انجام کا تذکرہ گذشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اس میں درحقیقت ان کی سخت گمراہی کا سبب بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: وہ اس قدر کوتاہ فکر ہیں کہ انھوں نے وسیع عالم ہستی کے خالق کو چھوڑ کر ایسے موجودات کے در پر رجوع کرتے ہیں کہ جن کا کچھ بھی مثبت اثر نہیں بلکہ بعض اوقات تو شیطان کی طرح تباہ کار اور گمراہ کن بھی ہوتے ہیں (ان یدعون من دونہ الا اناثا وان یدعون الا شیطانا مریدا)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں مشرکین کے معبود دو چیزوں میں منحصر قرار دیئے گئے ہیں اول ــــــ "اناث" اور دوم ــــــ "شیطان مرید"

"اناث" جمع ہے "انثٰی" کی جو کہ "انث" (بروزن "ادب") کے مادہ سے ہے "انثٰی" نرم اور قابل انعطاف موجود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوہا جب آگ میں نرم ہو جائے تو عرب "انث الحدید" کہتے ہیں۔ عورت کو بھی "اناث" یا "مؤنث" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ نرم دل، لطیف اور انعطاف پذیر صنف ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں قرآن کا اشارہ قبائل عرب کے مشہور بتوں کی طرف ہے ہر عرب قبیلے نے اپنا ایک بت بنا رکھا تھا جسے مونث نام دیا گیا تھا۔ مثلاً الالات ــــــ جس کا معنی ہے "الٰہ" اور یہ "اللہ" کا مونث ہے "عزیٰ" بھی مونث ہے۔ "اعز" کا اسی طرح "منات" "اساف" اور "نائلہ" بھی مونث نام ہیں۔

بعض دوسرے بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں اناث سے مراد مونث کا مشہور معنی نہیں ہے بلکہ یہ لفظ یہاں اصل لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے تھے جن کی حیثیت ایک کمزور مخلوق سے زیادہ نہ تھی اور جو آسانی سے انسان کے ہاتھوں ہر شکل میں ڈھل جاتے تھے ان کا پورا وجود دوسروں کے رحم و کرم پر جدھر چاہو ادھر مڑ جانے والا اور حوادث کے سامنے جھک جانے والا تھا۔ زیادہ کھلے لفظوں میں وہ بے ارادہ اور بے اختیار معبود تھے جن سے کوئی نفع و نقصان نہ پہنچ سکتا تھا۔

باقی رہا لفظ "مرید" ــــــ تو اس کی تشریح کچھ یوں ہے: یہ لفظ لغت کے لحاظ سے "مرد" (بروزن "زرد")



کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے درختوں کی شاخیں اور پتے جھڑ جانا۔ اسی لیے جس نوجوان کے چہرے پر ابھی بال نہ اگے ہوں اسے "امرد" کہا جاتا ہے۔ لہذا "شیطان مرید" سے مراد وہ شیطان ہے جس کے شجرِ وجود کی تمام صفات فضیلت گر چکی ہوں اور بھلائی اور طاقت کی کوئی چیز اس میں باقی نہ رہی ہو یا پھر یہ لفظ مادہ "مرود" (بروزن "سرود") سے ہے جس کا معنی ہے طغیان اور سرکشی ــــــ یعنی ان کا وجود تباہ کار اور ویرانیاں لانے والا شیطان ہے۔

درحقیقت قرآن نے ان کے معبودوں کو دو گروہوں میں بیان کیا ہے ایک گروپ وہ بے جو بے اثر اور بے خاصیّت ہے اور دوسرا تباہ کار اور ویران گر ہے اور جو شخص ایسے معبودوں کے سامنے سر جھکائے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں شیطان کی صفات، اس کے مقاصد و اہداف اور بنی آدم سے اس کی مخصوص دشمنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس کے لائحہ عمل کے مختلف حصّوں کی تشریح کی گئی ہے: ارشاد ہوتا ہے: خدا نے اسے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے (لعنه الله) اس کی تمام تباہ کاریوں اور بدبختیوں کی بنیاد دراصل یہی ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی سے دور ہو چکا ہے، اور یہ دوری اس کے غرور و تکبّر کا نتیجہ ہے یہ بات واضح ہے کہ ایسا وجود جو رحمتِ خدا سے دور ہو کر ہر طرح کی خیر و خوبی سے محروم ہو چکا ہو، وہ دوسروں کی زندگی کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جس نے حیات بخشنے والے سے کچھ نہ پایا ہو وہ ہستی آفریں کیسے ہو سکتا ہے ایسا وجود نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہو سکتا بلکہ نقصان دہ بھی ہو گا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ شیطان نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ یہ کام سرانجام دے گا:

۱۔ تیرے بندوں سے ایک معیّن حصّہ لوں گا (و قال لاتخذن من عبادك نصيبًا مفروضًا)۔

وہ جانتا ہے کہ وہ خدا کے سب بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا اور صرف ہوس پرست، ضعیف ایمان والے اور کمزور ارادے کے مالک ہی اس کے سامنے جھکیں گے۔

۲۔ انھیں گمراہ کروں گا (و لاضلنهم)۔

۳۔ انھیں لمبی چوڑی امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے مصروف رکھوں گا (و لامنينهم)۔[1]

۴۔ انھیں فضول اور بے ہودہ کاموں کی دعوت دوں گا ان میں سے یہ بھی ہے کہ انھیں حکم دوں گا کہ وہ چوپایوں کے کانوں میں سوراخ کریں یا انھیں کاٹ ڈالیں (و لامرنهم فليبتكن اذان الانعام)۔

یہ زمانہ جاہلیت کے ایک بدترین عمل کی طرف اشارہ ہے بُت پرستوں میں یہ کام مروّج تھا کہ وہ بعض چوپایوں کے کان چیر دیتے یا انھیں قطع کر دیتے پھر ان پر سواری کو ممنوع سمجھ لیتے اور ان سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ اٹھاتے۔

۵۔ انھیں اس کام پر ابھاروں گا کہ خدا کی پاک خلقت کو بگاڑ دیں (و لامرنهم فليغيرن خلق الله)۔

یہ جملہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت اولیٰ میں توحید، یگانہ پرستی اور ہر طرح کی پسندیدہ صفت

---

[1] اس لفظ کا مادہ "منی" (بروزن "منع") ہے جو تقدیر اور حساب لگانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے بعض اوقات خیالی اندازوں اور موہوم آرزوؤں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نطفہ کو بھی "منی" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زندہ موجودات کی ابتدا کا حساب اسی سے لگایا جاتا ہے۔

رکھی ہے لیکن شیطانی وسوسے اور ہوا و ہوس لے اس صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں اور بے راہ روی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اس بات کی شاہد سورۂ روم کی آیہ ۳۰ ہے۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم۔

اپنا چہرہ خالص توحیدی آئین کی طرف کرلو یہ وہی فطرت ہے کہ جس پر خدا نے شروع سے لوگوں کو رکھا ہے یہ آفرینش کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی ——— یہی حقیقی اور مستقیم دین ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ یہاں تغیر سے مراد فطرت توحید اور فرمان خدا میں تغیر ہے[1] ——— اور یہ ایسا ضرر ہے جو قابل تلافی نہیں ——— شیطان یہ نقصان انسان کی سعادت کی بنیاد کو پہنچاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کو اوہام میں تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد سعادت شقاوت میں بدل جاتی ہے۔

آخر میں ایک حکم عمومی بیان کیا گیا ہے، جو شخص خدا کی بجائے شیطان کو اپنا سرپرست بناتا ہے وہ کھلے نقصان کا مرتکب ہوا ہے (ومن يتخذ الشيطان وليا من دون الله فقد خسر خسرانا مبينا)۔

اگلی آیت میں گذشتہ گفتگو کی دلیل کے طور پر چند نکات بیان کیے ہیں:

شیطان ہمیشہ ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہتا ہے اور انھیں لمبی چوڑی آرزوؤں میں محو رکھتا ہے لیکن مکر و فریب کے علاوہ کرتا ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے (يعدهم ويمنيهم وما يعدهم الشيطان الا غرورا[2])۔

محل بحث آیت میں سے آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں کے آخری انجام کا تذکرہ ہے۔ فرمایا گیا ہے:

ان کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور ان کے لیے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے (اولئك ماواهم جهنم ولا يجدون عنها محيصا[3])

۱۲۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝

---

[1] تفسیر تبیان ج ۳ ص ۳۳۴

[2] "غرور" دراصل کسی چیز کے واضح اور آشکار اثر کو کہتے ہیں لیکن یہ لفظ زیادہ تر ان آثار کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا ظاہر پر فریب اور باطن ناپسندیدہ ہو اور ہر ایسی چیز کو غرور کہتے ہیں جو انسان کو فریب دے اور راہ حق سے منحرف کر دے چاہے وہ مال و ثروت ہو یا مقام و اقتدار۔

[3] "محیص" "حیص" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے عدول کرنا اور نگاہ پھیر لینا۔ لہٰذا محیص کا معنی ہوگا عدول کا ذریعہ اور فرار کا وسیلہ۔



ترجمہ

۱۲۲- اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک کام سرانجام دیئے ہم انھیں عنقریب ان باغات بہشت میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اللہ تم سے سچا وعدہ کرتا ہے اور کون ہے جو قول اور اپنے وعدوں میں اللہ سے زیادہ سچا ہو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جو لوگ شیطان کو اپنا ولی بناتے ہیں وہ واضح طور پر خسارے اور نقصان میں ہیں شیطان ان سے جھوٹے وعدے کرتا ہے انھیں آرزوؤں میں محو رکھتا ہے اور اس کا وعدہ مکر وفریب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں اس آیت میں اہلِ ایمان کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ: وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیئے ہیں وہ بہت جلد فردوس بریں کے باغات میں جائیں گے، یہ وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (والذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سندخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر) یہ نعمت دنیاوی نعمتوں کی طرح ناپائیدار نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مومنین کو میسر رہے گی (خالدین فیھا ابدا)۔

یہ وعدہ شیطان کے جھوٹے وعدوں کی طرح نہیں ہے بلکہ سچا ہے اور خدا کا وعدہ ہے (وعد اللہ حقا) اور یہ واضح ہے کہ خدا سے بڑھ کر اپنے قول وقرار کا سچا کوئی نہیں ہو سکتا (ومن اصدق من اللہ قیلا) کیونکہ وعدہ خلافی یا تو عجز وناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا جہالت واحتیاج کی بنا پر جو کہ اللہ کی ساحتِ قدس سے بعید ہے۔

۱۲۳- لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ ۙ
وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ۝
۱۲۴- وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ۝

ترجمہ

۱۲۳- تمھاری اور اہل کتاب کی آرزوؤں سے (فضیلت وبرتری) نہیں ہوتی، جو شخص برا عمل کرے گا اسے سزا دی جائے گی اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو اپنا ولی ویاور نہیں پائے گا۔



۱۲۴۔ اور جو شخص اعمالِ صالح میں سے کچھ انجام دے، چاہے مرد ہو یا عورت، اگر وہ ایمان رکھتا ہے تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ مسلمان اور اہلِ کتاب ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے اہل کتاب کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمھارے پیغمبر سے پہلے آیا ہے اور ہماری کتاب تمھاری کتاب سے مقدم ہے اور مسلمان کہتے کہ ہمارا پیغمبر تمام پیغمبروں کا خاتم ہے اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے اور دیگر آسمانی کتب سے زیادہ کامل و اکمل ہے لہٰذا ہم تم سے زیادہ افضل ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم برگزیدہ قوم ہیں اور جہنم کی آگ چند دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی (وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودة)۔[1]

اور مسلمان کہتے کہ ہم بہترین اُمت ہیں کیونکہ خدا نے ہمارے بارے میں فرمایا ہے:

(کنتم خیر امة اخرجت للناس)[2]

اسی ضمن میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان دعووں پر خطِ بطلان کھینچ دیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ ہر انسان کی قدر و قیمت ان کے اعمال کے مطابق ہوگی۔

تفسیر

سچے اور جھوٹے امتیازات

ان دو آیات میں اسلام کی ایک بہت ہی اہم اساس کو بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ افراد کی وجودی قدر و قیمت اور جزاء و سزاء، ان کے دعووں اور آرزوؤں سے مربوط نہیں ہے بلکہ صرف ایمان اور عمل سے وابستہ ہے اسلام کی یہ بنیاد ثابت اور سنت ہے اور غیر متبدل ہے یہ وہ قانون ہے جس کی نظر میں تمام امتیں یکساں ہیں لہٰذا پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: فضیلت و برتری کا انحصار تمھاری اور اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر نہیں ہے (لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتاب)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جو شخص کوئی عمل بجالائے گا وہ اس کے بدلے اپنی سزا پائے گا اور خدا کے علاوہ کسی کو اپنا

---

[1] بقرہ۔ ۸۰

[2] آلِ عمران ــ ۱۱۰



ولی ویاور نہ پائے گا (من یعمل سوءًا یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرًا) اور اسی طرح جو لوگ نیک عمل بجالائیں گے اور صاحبِ ایمان ہوں گے وہ مرد ہوں یا عورتیں جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا (ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثی و ھو مؤمن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرًا)۔[1]

اس طرح قرآن نے نہایت سادگی سے بقولے سب کے ہاتھ پر پاک پانی ڈالا ہے اور کسی مذہب سے دعوے کی حد تک خیالی، اجتماعی یا نسلی وابستگی کو بے فائدہ قرار دیا ہے اور نجات کی بنیاد اس مکتب کے اصولوں پر ایمان لانے اور اس کے پروگراموں پر عمل کرنے کو ٹھہرایا ہے۔

پہلی آیت کے ذیل میں بنیادی شیعہ سنی کتب میں ایک حدیث منقول ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بعض مسلمان ایسی وحشت و پریشانی میں مبتلا ہوگئے کہ وہ ڈر کے مارے رونے لگے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انسان خطاکار ہے اور آخر اس سے گناہ سرزد ہونا تو ممکن ہی ہے اور اگر کسی قسم کی کوئی معافی اور بخشش نہیں اور تمام بُرے اعمال کی سزا ملے گی پھر یہ تو بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ لہٰذا انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس آیت نے ہمارے لیے تو کوئی صورت نہیں چھوڑی، اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

> اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بات وہی ہے جو اس آیت میں نازل ہوئی ہے تاہم میں تمھیں ایسی بشارت دیتا ہوں جو تمھارے لیے قربِ خدا اور نیک اعمال بجالانے کی تشویق کا سبب بنے گی اور وہ یہ کہ تمھیں جو مصیبتیں پہنچیں گی، تمھارے گناہوں کا کفارہ بنیں گی یہاں تک تمھارے پاؤں میں چبھنے والا ایک کانٹا بھی۔[2]

ایک سوال کا جواب

ارشادِ الٰہی ہے: ولا یجد لہ من دون اللہ ولیًا ولا نصیرًا (یعنی وہ اپنے گناہوں کے مقابلہ میں کسی کو اپنا سرپرست ویاور نہیں پائے گا) ممکن ہے بعض لوگ اس سے استدلال کرتے ہوئے کہیں کہ اس جملے سے مسئلہ شفاعت وغیرہ کی بالکل نفی ہوجاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ـــــــ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ شفاعت کا معنی یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے مثلاً انبیاء، آئمہ اور صلحا خدا کے مقابلے میں کوئی مستقل طاقت رکھتے ہیں بلکہ ان کی شفاعت بھی حکم خدا کے ماتحت ہے اور اس کی اجازت اور جس کی شفاعت کی جانا ہے اس کی اہلیت کے بغیر کبھی شفاعت نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایسی شفاعت کی برگشت بالآخر خدا کی طرف ہے اور خدا کی سرپرستی، نصرت اور مدد کا ایک شعبہ شمار ہوتی ہے۔

---

[1] نقیر کے مفہوم پر اسی سورہ کی آیت ۵۳ میں بحث کی جاچکی ہے۔

[2] نور الثقلین جلد اول۔ ص ۵۵۲



۱۲۵۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ
مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝
۱۲۶۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝ ع

ترجمہ

۱۲۵۔ جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے اس سے بہتر کس کا دین ہے اور پھر جو نیکو کار بھی ہو اور ابراہیم کے خالص اور پاک دین کا پیرو ہو اور خدا نے ابراہیم کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔

۱۲۶۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کا ہے اور خدا ہر چیز پر محیط ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ایمان و عمل کی تاثیر کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ کسی دین و آئین سے منسوب ہو جانا ہی کافی نہیں لیکن زیر نظر آیت میں اس بنا پر کہ کہیں گذشتہ بحث سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ دین اسلام کی تمام ادیان پر برتری کا اظہار یوں کیا گیا ہے: کون سا دین اس شخص کے دین سے بہتر ہے جو بارگاہِ الٰہی میں سراپا تسلیم ہو اور نیک عمل سے دستبردار نہ ہو اور ابراہیم کے پاک اور خالص دین کا پیرو کار ہو (ومن احسن دینا ممن اسلم وجهه لله وهو محسن واتبع ملة ابراهيم حنيفا)۔

البتہ آیت یہاں استفہامیہ صورت میں ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے والے سے اس حقیقت کا اقرار لیا جائے۔

اس آیت میں تین چیزوں کو بہترین دین کے مقیاس کے طور پر شمار کیا گیا ہے:

پہلی: پورے طور پر خدا کے حضور سپردگی "اسلم وجهه لله"[1]۔

---

[1] "وجہ" لغت میں چہرے کو کہتے ہیں اور انسان کا چہرہ چونکہ اس کے قلب و روح کا آئینہ ہوتا ہے اور انسان کو خارجی دنیا سے مربوط کرنے والے حواس تقریباً سب چہرے میں واقع ہیں اس لیے یہ لفظ کبھی کبھی ذات کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص آیت ۸۸ میں ہے

"کل شیٔ ھالك الا وجھه"

ذات خدا کے علاوہ سب چیزیں ہلاک ہو جائیں گی۔



دوسری: نیکوکاری (وھو محسن) یہاں نیکوکاری سے مراد دل، زبان اور عمل سے ہر طرح کی نیکی ہے۔ تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جو اس سوال کے جواب میں ہے کہ احسان سے کیا مراد ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(اس آیت میں) احسان سے مراد یہ ہے کہ جو کام بھی عبادتِ خدا کے لیے انجام دو وہ اس طرح ہو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے اور وہ تم پر شاہد و ناظر ہے۔

تیسری: ابراہیمؑ کے پاک دین و آئین کی پیروی کرنا (و اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا)۔[1]

آیت کے آخر میں دینِ ابراہیم پر اعتماد کی یہ دلیل بیان کی گئی ہے کہ خدا نے ابراہیم کو اپنے خلیل کی حیثیت سے منتخب کرلیا ہے (واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا)۔

خلیل کسے کہتے ہیں؟

ہوسکتا ہے "خلیل" "خُلّت" (بروزن "قوّت") کے مادہ سے ہو جس کا معنی ہے دوستی۔ یا پھر "خَلّت" (بروزن "ضربت") کے مادہ سے ہو جس کا مطلب ہے نیاز و احتیاج۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ زیر نظر آیت میں کون سا معنی آیت کے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ بعض کے خیال میں دوسرا معنی حقیقت آیت کے قریب تر ہے کیونکہ ابراہیمؑ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ وہ بلا استثنا تمام چیزوں میں خدا کے محتاج ہیں لیکن اوپر والی آیت کہتی ہے کہ خدا نے خود ابراہیمؑ کو یہ مقام دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دوستی ہے کیونکہ اگر یہ کہیں کہ خدا نے دوست کی حیثیت سے ابراہیمؑ کو منتخب فرمایا تو یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کا انتخاب اپنے محتاج کی حیثیت سے کیا ہے جبکہ باقی تمام مخلوق بھی خدا تعالیٰ کی محتاج اور نیاز مند ہے لہٰذا یہ بات ابراہیمؑ سے مخصوص نہیں ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ

یعنی ـــــ اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ (فاطر ـــــ ۱۵)

امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں ہے:

---

[1] "ملت" کا معنی "دین" ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت خدا کی طرف نہیں ہوتی مثلاً "ملۃ اللہ" نہیں کہتے بلکہ پیغمبر کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے جبکہ لفظ دین کی اضافت اللہ کی طرف بھی، پیغمبر کی طرف بھی اور دیگر افراد کی طرف بھی ہوتی ہے۔

حنیف ـــــ اس شخص کو کہتے ہیں جو ادیان باطل چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہو اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اس کی تشریح جلد دوم میں کی جاچکی ہے (ص ۲۶۹ اردو ترجمہ)



خدا نے ابراہیم کو اگر اپنا خلیل (اور دوست) بنایا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان کی دوستی کا محتاج تھا بلکہ یہ اس بنا پر تھا کہ ابراہیم خدا تعالیٰ کے مفید اور اس کی راہ میں کوشش کرنے والے بندے تھے[1]

یہ روایت بھی اس بات کی شاہد ہے کہ زیر بحث آیت میں خلیل کا مطلب دوست ہی ہے۔

رہا یہ سوال کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو یہ مقام کن خصوصیات کی بنا پر عطا فرمایا ہے تو اس سلسلے میں روایات میں کئی ایک وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ جو سب ابراہیمؑ کے انتخاب کی دلیل بن سکتی ہیں۔ ایک وجہ امام صادقؑ سے منقول ایک حدیث میں یوں بیان کی گئی ہے:

انما اتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلا لانہ لم یرد احدًا ولم یسئل احدًا قط غیر اللّٰہ۔

یعنی —— خدا تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل اس لیے بنایا کیونکہ انھوں نے کبھی کسی سوال اور تقاضا کرنے والے کو محروم نہیں کیا اور کبھی کسی سے سوال اور تقاضا نہیں کیا[2]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام زیادہ سجدہ کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے اور رات کی تاریکی میں نماز پڑھنے یا پروردگار کی اطاعت کے لیے کوشاں رہنے کی وجہ سے حاصل ہوا۔

اگلی آیت میں پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تمام اشیاء پر اس کے احاطے کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کی ملکیت ہے کیونکہ خدا تمام چیزوں پر محیط ہے (وللّٰہ ما فی السمٰوات وما فی الارض وکان اللّٰہ بکل شیءٍ محیطا) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست اس وجہ سے نہیں بنایا کہ خدا کو کسی چیز کی ضرورت اور احتیاج تھی بلکہ خدا تو سب سے بے نیاز ہے۔ یہ انتخاب تو ابراہیمؑ کی خوبیوں اور بہترین صفات کی وجہ سے ہے۔

۱۲۷- وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ط قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ لا وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ
فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ
وَتَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ لا
وَاَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ط وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ

---

[1] یہ حدیث مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

[2] تفسیر صافی اور تفسیر برہان ج ۱، ص ۴۱۷۔ بحوالہ عیون اخبار الرضا۔

اللّٰہ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا ○

ترجمہ

۱۲۷۔ تجھ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ خدا اس بارے میں تمھیں جواب دیتا ہے اور جو کچھ قرآن میں یتیم عورتوں کے متعلق، جن کے حقوق تم ادا نہیں کرتے اور ان سے شادی کر لینا چاہتے ہو اور اسی طرح چھوٹے بچوں اور ناتوانوں کے متعلق تمھارے لیے بیان ہوا ہے (اس سلسلے میں خدا کی کچھ وصیتیں ہیں اور خدا یہ بھی سفارش کرتا ہے) کہ یتیموں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرو اور جو نیکیاں تم انجام دیتے ہو خدا ان سے آگاہ ہے (اور وہ تمھیں ان کا مناسب بدلہ دے گا)۔

تفسیر

حقوق نسواں کے بارے میں مزید گفتگو

زیر نظر آیت میں کچھ لوگوں کے اعتراضات اور سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے عورتوں (خصوصاً یتیم لڑکیوں) کے متعلق کیے تھے ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! تم سے عورتوں سے متعلق احکام پوچھتے ہیں۔ کہو کہ خدا اس سلسلے میں تمھیں جواب دیتا ہے (ویستفتونک فی النساء قل اللہ یفتیکم فیھن)۔

مزید ارشاد ہوتا ہے وہ یتیم لڑکیاں جن کے مال پر تم قبضہ کر لیتے تھے نہ ان سے شادی کرتے تھے اور نہ ان کا مال ان کے سپرد کرتے تھے تاکہ وہ کسی اور سے شادی کر لیں۔ قرآن مجید ان کے بارے میں کچھ اور سوالوں کا جواب دیتا ہے اور اس ظالمانہ روش کی برائی کو واضح کرتا ہے (وما یتلی علیکم فی الکتاب فی یتمی النساء اللاتی لا تؤتونھن ما کتب لھن وترغبون ان تنکحوھن)۔[1]

اس کے بعد چھوٹے بچوں کے بارے میں وصیت کی گئی ہے جو کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق میراث سے محروم رہتے تھے فرمایا گیا ہے: خدا تمھیں وصیت کرتا ہے کہ تم کمزور بچوں کے حقوق کا لحاظ رکھو (والمستضعفین من الولدان)

---

[1] اس جملے کی مذکورہ تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ "مایتلی" مبتداء ہے اور "یفتیکم فیھن" اس کی خبر ہے جو آیت کے سابق حصے کے قرینہ سے محذوف ہے اور لفظ "ترغبون" بھی یہاں مقابلہ نہ ہونے کے معنی میں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "رغب" کا مادہ اگر "عن" کے ساتھ متعدی ہو تو یہ عدم تمائل اور اعراض کے معنی دیتا ہے اور اگر "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو مائل و راغب ہونے کے معنی دیتا ہے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "عن" مقدر ہے)۔



ایک مرتبہ پھر یتیموں کے حقوق کے بارے میں ایک مجموعی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: خدا انھیں وصیت کرتا ہے کہ یتیموں سے عدل کرو (وان تقوموا للیتامٰی بالقسط)۔

آخر میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جیسا عمل خصوصاً یتیموں اور کمزوروں سے متعلق تم سے سرزد ہو وہ علم خدا کی نظر سے مخفی نہیں رہتا اور اس کی مناسب جزا ملے گی (و ما تفعلوا من خیر فان اللہ کان بہ علیما)۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ "تستفتونک" دراصل "فتویٰ" اور "فتیا" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے مشکل مسائل کا جواب دینا۔ لغت میں اس کی بنیاد چونکہ "فتیٰ" ہے جس کا معنی ہے "نوجوان"۔ لہٰذا ممکن ہے پہلے پہل یہ لفظ ان مسائل کے لیے استعمال ہوتا ہو کہ جن کے جوابات جاذب اور تازہ ہوتے ہوں اور بعد ازاں ہر طرح کے مسائل کے جواب کے لیے استعمال ہونے لگا ہو۔

۱۲۸۔ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۲۸۔ اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے بارے میں اس بات سے خوفزدہ ہو کہ وہ سرکشی یا اعراض کا مرتکب ہوگا تو (ان پر) حرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کریں (اور عورت یا مرد صلح کی خاطر اپنے کچھ حقوق سے صرف نظر کرلیں) اور صلح بہتر ہے اگرچہ یہ لوگ (حب ذات کی فطرت کے مطابق ایسے مواقع پر) بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر نیکی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو (اور صلح کی وجہ سے درگذر کردو) تو خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ تم انجام دیتے ہو (اور وہ تمھیں مناسب جزا دے گا)۔

شانِ نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر اور کتب احادیث میں اس آیت کی شانِ نزول یوں بیان ہوئی ہے:

رافع بن خدیج کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سن رسیدہ تھی اور دوسری جوان۔ (بعض اختلافات کی بنیاد پر) اس نے اپنی سن رسیدہ بیوی کو طلاق دے دی۔ ابھی مدت کی مدت ختم نہ ہوئی



تھی کہ رافع نے اس سے کہا، اگر تم چاہو تو میں تم سے مصالحت کر لیتا ہوں البتہ اگر میں نے دوسری بیوی کو تجھ پر ترجیح دی تو تمھیں صبر کرنا ہوگا اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر عدت کی مدت ختم ہونے تک صبر کرو تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

اس عورت نے پہلی تجویز قبول کر لی۔ یوں ان کی آپس میں صلح ہو گئی۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں اس معاملے کے بارے میں حکمِ شریعت بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر

صلح بہتر ہے

جیسا کہ اسی سورت کی چونتیسویں اور پینتیسویں آیات کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں[1] کہ "نشوز" اصل میں "نشز" کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب ہے "بلند زمین"۔ یہ لفظ جب عورت اور مرد کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو سرکشی اور طغیان کا مفہوم دیتا ہے۔

گذشتہ آیات میں عورت کے "نشوز" سے مربوط احکام بیان ہوئے تھے اور زیرِ نظر آیت میں مرد کے "نشوز" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب عورت یہ محسوس کرے کہ اس کا شوہر سرکشی اور اعراض کا ارتکاب کر رہا ہے تو کوئی حرج نہیں کہ حریم زوجیت کی حفاظت کے لیے اپنے کچھ حقوق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صلح کر لے (و ان امرأة خافت من بعلها نشوزاً او اعراضاً فلا جناح علیهما ان یصلحا بینهما صلحاً)۔

عورت نے چونکہ اپنے کچھ حقوق سے اپنی رضا اور رغبت سے اعراض کر لیا ہے اور جبر و اکراہ والی کوئی بات نہیں۔ لہذا اس کا کوئی گناہ نہیں۔ اس کے لیے "لا جناح" (کوئی حرج اور گناہ نہیں) کا استعمال بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت کی شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے ضمنی طور پر دو فقہی مسئلے بھی معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ دو بیویوں کے لیے ہفتہ بھر کے اوقات کی تقسیم جیسے احکام حقوق کے پہلو سے ہیں نہ کہ حکم کے حوالے سے۔ اسی لیے عورت یہ حق رکھتی ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے اس حق سے جزوی یا کلّی طور پر صرفِ نظر کر لے۔

۲۔ ضروری نہیں کہ صلح کا معاوضہ مال ہی ہو بلکہ صلح کا معاوضہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنا حق چھوڑ دیا جائے۔

بعد ازاں صلح پر تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: بہرحال صلح بہتر ہے (و الصلح خیر) یہ ایک چھوٹا سا پُر معنی اور پُر مغز جملہ ہے۔ اس آیت میں جملہ اگرچہ خانگی اختلافات سے متعلق آیا ہے لیکن واضح ہے کہ یہ ایک کلّی اور عمومی قانون ہے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۳



جو ہر ایک کے لیے ہر مقام پر ہے۔ صلح وصفائی، دوستی اور محبت کو ہر مقام پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ نزاع و کشمکش اور ایک دوسرے سے دوری انسان کی طبع سلیم اور پر سکون زندگی کے برخلاف ہے اس لیے استثنائی صورت میں جہاں ناگزیر ہو اس کے سوا نزاع اور دوری کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کے اس حکم کے برعکس بعض مادہ پرستوں کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کی پہلی بنیاد دیگر جانوروں کی طرح بقا کی کشمکش اور تنازع ہے اور اسی طرح سے تکامل اور ارتقاء صورت پذیر ہوتا ہے۔ شاید یہی طرز فکر گذشتہ چند صدیوں کی بہت سی جنگوں اور خوں ریزیوں کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ انسان اپنی عقل و ہوش کے سبب دیگر جانوروں سے مختلف ہے اور اس کی ارتقاء اور تکمیل کا ذریعہ تنازع نہیں تعاون ہے[1]۔ اصولی طور پر تنازع بقاء کا نظریہ تو جانوروں کے تکامل کے لیے بھی کوئی قابلِ قبول بنیاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد بہت سے لڑائی جھگڑوں اور درگذر نہ کرنے کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: لوگ ذاتی طور پر اور حُبِ ذات کی فطرت کے باعث بُخل کی موجوں میں پھنس کے رہ جاتے ہیں اور ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے حقوق بے کم وکاست وصول کرے اور یہی تمام لڑائی جھگڑوں کی بنیاد ہے (واحضرت الانفس الشح)۔

لہٰذا اگر عورت اور مرد اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ بہت سے اختلافات کا سرچشمہ بُخل ہے اور بُخل ایک مذموم صفت ہے پھر وہ اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور درگذر کی راہ اختیار کریں تو نہ صرف یہ کہ خانگی اختلافات ختم ہو جائیں گے بلکہ بہت سے اجتماعی جھگڑے بھی جاتے رہیں گے۔ اس کے باوجود، اس بناء پر کہ مرد کہیں اس حکم سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں آیت کے آخر میں روئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے انھیں نیکی اور پرہیزگاری کی وصیت کی گئی ہے اور انھیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اعمال و کردار پر نگاہ رکھیں اور راہِ حق و عدالت سے منحرف نہ ہوں کیونکہ خدا ان کے تمام اعمال سے آگاہ ہے

(وان تحسنوا وتتقوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرًا)۔

۱۲۹۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

۱۳۰۔ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ۝

---

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد دوم میں تنازع بقاء کے زیرعنوان تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے (دیکھیے صفحہ ۱۴۲ اردو ترجمہ)



ترجمہ

۱۲۹- اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ (دلی محبت کے اعتبار سے) عورتوں کے درمیان عدالت کرسکو چاہے جتنی بھی کوشش کرو لیکن اپنا میلان بالکل ایک طرف نہ رکھو اور دوسری کو معلق نہ چھوڑ دو اور اگر اصلاح اور پرہیزگاری کی راہ اختیار کرو تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۱۳۰- اور اگر (صلح صفائی کی کوئی صورت نہ ہو اور) ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو خداوند عالم ان میں سے ہر ایک کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کردے گا اور خدا صاحبِ فضل و کرم اور حکیم ہے۔

تفسیر

ایک سے زیادہ شادیوں کے لیے عدالت شرط ہے۔

گذشتہ آیت کے آخر میں جس جملے میں احسان (تقویٰ) اور پرہیزگاری کا حکم دیا گیا ہے، وہ شوہروں کے بارے ایک طرح کی دھمکی بھی ہے کہ انھیں اپنے بیویوں کے بارے میں راہِ عدالت سے تھوڑا سا انحراف بھی نہیں کرنا چاہیے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالت تو دلی لگاؤ کے سلسلے میں بھی ممکن نہیں ہے لہٰذا متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے۔

زیرِ بحث آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے: محبت کے حوالے سے تو بیویوں کے درمیان عدالت ممکن نہیں ہے چاہے اس کے لیے کتنی بھی کوشش کیوں نہ جائے (ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء و لو حرصتم)۔

"ولو حرصتم" سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اس سلسلے میں بہت کوشش کرتے تھے، شاید اس کی وجہ اسی سورہ کی آیت ۳ تھی جس میں فرمایا گیا ہے:

فان خفتم الا تعدلوا فواحدة

یعنی ـــــــ اگر تم اس بات سے ڈرو کہ تم عدل قائم نہیں کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو ـــــــ

یہ واضح ہے کہ ایک آسمانی قانون خلاف فطرت نہیں ہو سکتا اور ممکن نہیں کہ وہ "تکلیف مالا یطاق" یعنی ـــــــ ایسی ذمہ داری جس کی انسان میں طاقت نہ ہو، کا حامل ہو۔ دل کی محبت کے مختلف عوامل ہوتے ہیں جن میں سے بعض انسانی اختیار سے ماوراء ہیں لہٰذا ان کے بارے میں عدالت کا حکم نہیں دیا گیا ہے لیکن بیویوں سے برتاؤ اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھنے کے بارے میں انسان پر عدالت کے لیے زور دیا گیا ہے جو کہ انسان کے بس میں ہے۔

اس بنا پر کہ مرد اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے: جب کہ تم محبت کے حوالے سے بیویوں کے درمیان مساوات قائم نہیں کرسکتے تو پھر سارا رجحان اور قلبی لگاؤ تو ایک طرف نہ رکھو کہ جس سے دوسری بالکل معلق ہو کر رہ جائے اور



اس کے حقوق عملی طور پر ضائع ہوجائیں (فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ)۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو اس حکم کے نزول سے قبل اپنی بیویوں کے درمیان عدل میں کوتاہی کرتے تھے، ارشاد ہوتا ہے: اگر وہ اصلاح اور تقویٰ کی راہ اپنائیں اور گذشتہ رویے کی تلافی کریں تو خدا اپنی رحمت و بخشش ان کے شامل حال کرے گا (و ان تصلحوا و تتقوا فان اللہ کان غفورًا رحیمًا)۔

اسلامی روایات میں بیویوں کے درمیان عدالت ملحوظ رکھنے سے متعلق بہت سے مطالب مذکور ہیں جن سے اس قانون کی اہمیت اور عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علیؑ جو دن کسی ایک بیوی سے تعلق رکھتے تھے، اس دن وضو بھی دوسری کے گھر نہیں کرتے تھے[1]

پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بھی ہے کہ آپؐ بیماری کے عالم میں بھی کسی ایک بیوی کے گھر قیام نہیں کرتے تھے[2]

معاذ بن جبل کے بارے میں منقول ہے کہ اس کی دو بیویاں تھیں وہ دونوں طاعون کی بیماری کے باعث اکٹھی مرگئیں تو معاذ نے ایک کو دوسری سے پہلے دفن کرنے کے لیے بھی قرعہ نکالا تاکہ اس سے کوئی خلاف عدالت کام نہ ہوجائے[3]

ایک اہم سوال کا جواب

جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۳ کے ذیل میں ہم نے یاد دہانی کروائی ہے کہ بعض ناسمجھ لوگ اس آیت کو زیر بحث آیت سے ملا کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادیاں عدالت سے مشروط ہیں اور عدالت ممکن نہیں ہے لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ اعتراض اٹھایا تھا امام جعفر صادقؑ کا ہم عصر تھا اور مادہ پرستوں میں سے تھا۔ اس کا نام ابن ابی العوجاء تھا۔ اس نے یہ سوال اسلام کے ایک مجاہد عالم ہشام بن حکم سے کیا۔ انھیں اس کا جواب معلوم نہ تھا لہٰذا وہ اپنے وطن جو ظاہراً کوفہ تھا سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس سوال کا جواب معلوم کرسکیں وہ امام صادقؑ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرتؑ کو تعجب ہوا کہ وہ حج و عمرہ کے دنوں کے بغیر مدینہ کیوں چلے آئے تھے۔ ہشام نے بیان کیا کہ اس قسم کا سوال پیش آیا ہے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا:

> سورۂ نساء کی تیسری آیت میں عدالت سے مراد نان نفقہ (اور حقوقِ زوجیت کا لحاظ رکھنا اور برتاؤ) ہے لیکن آیت ۱۲۹ میں عدالت جسے امر محال شمار کیا گیا ہے دلی لگاؤ اور میلان میں عدالت ہے (اس لیے تعدد ازواج شرائط اسلامی کے احترام کی صورت میں ممنوع ہے نہ محال)۔

---

[1]، [2] تفسیر تبیان، ج ۳، صفحہ ۳۵۰

[3] تفسیر تبیان ج ۳، صفحہ ۳۵۰



ہشام سفر سے لوٹ کر آئے اور یہ جواب ابن ابی العوجاء کو پیش کیا تو اس نے قسم کھا کر کہا:

یہ جواب خود تمھاری طرف سے نہیں ہے۔ ؎۱

واضح ہے کہ اگر ہم دو آیات میں "عدالت" کا الگ الگ مفہوم بیان کرتے ہیں تو یہ آیات میں موجود واضح قرینہ کی بناء پر ہے۔ محل بحث آیت میں صریحاً فرمایا گیا ہے کہ تمام قلبی لگاؤ ایک بیوی کی طرف نہ رکھو۔ لہٰذا دو بیویاں ہونا جائز شمار کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس شرط کے ساتھ کہ عملی طور پر ان میں سے کسی پر ظلم نہ ہو اگرچہ دلی لگاؤ میں فرق ہو۔ نیز اسی سورت کی آیت ۳ میں صراحت کے ساتھ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی گئی ہے۔

پھر بعد کی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ازدواجی زندگی کو باقی رکھنا طرفین کے لیے مشکل ہو گیا ہے اور ایسی وجوہ پیدا ہو گئی ہیں کہ جن سے افقِ حیات ان کے لیے تاریک ہو گیا ہے اور کسی طرح مصالحت نہیں ہو سکتی تو وہ مجبور نہیں ہیں کہ ایسی ازدواجی زندگی کو باقی رکھیں اور آخر دم تک خانگی زندان کے ماحول میں تلخ کامی سے رہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسے عالم میں انھیں چاہیے کہ جرأت سے اقدام کریں اور آنے والے حالات سے خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ اگر وہ ان حالات میں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو خداوند بزرگ و برتر دونوں کو اپنے فضل و کرم سے مطمئن کر دے گا اور امید ہے کہ بہتر جیون ساتھی اور روشن تر زندگی ان کے انتظار میں ہو (وان یتفرقا یغن اللّٰہ کلا من سعتہ) کیونکہ خدا کی حکمت آمیز رحمت بہت وسیع ہے (وکان اللّٰہ واسعًا حکیمًا)۔

۱۳۱۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا
حَمِيْدًا ۝

۱۳۲۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

۱۳۳۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى
ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝

۱۳۴۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

؎۱ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۲۰



وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۳۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ کا ہے اور جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں ہم نے وصیت کی کہ خدا کی (نافرمانی) سے ڈرو اور پرہیز کرو اور اگر کافر ہو جاؤ تو (خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کا مال ہے اور خدا بے نیاز ہے اور لائقِ تعریف ہے۔

۱۳۲۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کے لیے ہے اور خدا ان کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے کافی ہے۔

۱۳۳۔ اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تمھیں یہاں سے لے جائے اور (تمھاری جگہ) دوسرے لوگوں کو لے آئے اور خدا اس کام کی طاقت و قدرت رکھتا ہے۔

۱۳۴۔ جو لوگ دنیا کی جزا اور سزا چاہتے ہیں (اور معنوی اور اخروی نتائج کے طلبگار نہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ) خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا و ثواب ہے اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر حالات مجبور کریں کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس اقدام میں کوئی حرج نہیں اور آیندہ کے حالات سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ خدا انھیں اپنے فضل و کرم سے مطمئن اور بے نیاز کر دے گا۔

زیرِ نظر آیات میں سلسلہ کلام جاری ہے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم انھیں بے نیاز اور مستغنی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے (و للہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض)۔ جو ذات ایسی لامتناہی ملکیت اور بے پایاں قدرت رکھتی ہے وہ اپنے بندوں کو بے نیاز کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد اس موقع پر اور دیگر مواقع پر پرہیزگاری اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہود و نصاریٰ کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے صاحبِ کتاب ہیں اور اسی طرح تمھیں بھی ہم نے وصیت کی ہے کہ پرہیزگاری اختیار کرو (و لقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و ایاکم ان اتقوا اللہ)۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا: تقویٰ اختیار کرنے کا یہ حکم تمھارے فائدے میں ہے اور خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر تم روگردانی کرو، نافرمانی کی راہ اپناؤ تو خدا کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا



کیونکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کی ملکیت ہے اور وہ بے نیاز ہے اور لائق ستائش ہے (وان تکفروا فان اللہ مافی السمٰوٰت ومافی الارض و کان اللہ غنیًا حمیدًا) دراصل حقیقی معنی میں غنی اور بے نیاز تو خدا ہی ہے کیونکہ وہ غنی بالذات ہے اور کسی اور کی بے نیازی اسی کی مدد سے ہے۔ ورنہ ذاتی طور پر تو سب کے سب محتاج اور نیاز مند ہیں اسی طرح وہی بالذات لائق ستائش ہے کیونکہ جن کمالات کی وجہ سے وہ تعریف وستائش کے لائق ہے وہ اس کی ذات میں ہیں نہ کہ دوسروں کے کمالات کی طرح کہ جو عاریتاً انھیں دیئے جاتے ہیں اور کسی دوسرے کی طرف سے ہیں۔

بعد والی آیت میں یہ جملہ تیسری مرتبہ آیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے خدا کی ملکیت ہے اور خدا ان کی حفاظت ونگہبانی اور انتظام وانصرام کرتا ہے (و للہ مافی السمٰوٰت ومافی الارض و کفی باللہ و کیلًا)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مختصر سے فاصلے میں ایک مطلب کا تین مرتبہ تکرار کیوں کیا گیا ہے۔ کیا یہ تکرار صرف تاکید کے لیے ہے یا کچھ اور اشارے بھی اس میں مضمر ہیں۔ آیات میں غور وفکر کیا جائے اور دقت نظر سے کام لیا جائے تو ہر مرتبہ اس بات کے ذکر میں ایک نکتہ دکھائی دیتا ہے۔

پہلی مرتبہ دونوں میاں بیوی سے وعدہ کرتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ ہوجانے کے بعد خدا انھیں بے نیاز کر دے گا۔ اس موقع پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے اس نے اپنی زمین وآسمان کی وسعتوں کی ملکیت کا تذکرہ کیا ہے۔

دوسری مرتبہ تقویٰ وپرہیزگاری کی وصیت کے بعد یہ ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ اس فرمان کی اطاعت کا خدا کو کوئی فائدہ نہیں ہے یا اس کی مخالفت اس کے لیے ضرر رساں نہیں ہے۔ درحقیقت یہ بات اس کے مشابہ ہے جو حضرت امیرالمومنین علیؑ نے نہج البلاغہ میں خطبہ ہمام کی ابتداء میں فرمایا ہے:

ان اللہ سبحانہ و تعالٰی خلق الخلق حین خلقھم غنیا عن طاعتھم اٰمنا من معصیتھم لانہ لاتضرہ معصیۃ من عصاہ و لا تنفعہ طاعۃ من اطاعہ

یعنی ــــــ خدائے متعال نے انسانوں کو پیدا کیا جب کہ وہ ان کی اطاعت سے بے نیاز تھا اور ان کی نافرمانی سے امان میں تھا کیونکہ نہ تو گنہ گاروں کی نافرمانی اسے نقصان پہنچاتی ہے اور نہ اطاعت کرنے والوں کی اطاعت اسے فائدہ پہنچاتی ہے[1]

تیسری مرتبہ آیۃ ۱۳۳ میں موجود بحث کے عنوان کے طور پر اس کا تذکرہ ہے اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کہ تمھیں ختم کردے اور تمھاری جگہ زیادہ آمادہ پختہ ارادے والا گروہ پیدا کردے جو اس کی اطاعت میں زیادہ کوشاں ہو اور خدا ایسا کرنے پر قادر ہے (ان یشا یذھبکم ایھا الناس ویأت باٰخرین و کان اللہ علی ذٰلک قدیرًا)۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۳

تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے اپنا ہاتھ سلمان کی پشت پر مارا اور فرمایا:

وہ گروہ عجم اور فارس کے یہ لوگ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان درحقیقت ان عظیم خدمات کی پیش گوئی ہے جو ایرانی مسلمانوں نے اسلام کے لیے کی ہیں۔

آخری آیت میں ان لوگوں کے بارے میں بیچ میں گفتگو آگئی ہے جو خدا پر ایمان لانے کا دم بھرتے ہیں، میدان جہاد میں شرکت کرتے ہیں اور احکام اسلام کی پابندی کرتے ہیں مگر ان کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول نہیں ہوتا، بلکہ مادی نتائج شلاً مال غنیمت کا حصول ہوتا ہے ارشاد فرمایا گیا ہے، جو لوگ صرف دنیا کی جزا چاہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ خدا کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں کی جزا اور ثواب ہے (من کان یرید ثواب الدنیا فعند اللہ ثواب الدنیا و الاٰخرۃ)۔ لہٰذا وہ دونوں کی جستجو کیوں نہیں کرتے اور خدا سب کی نیتوں سے آگاہ اور ہر محل و مقام پر اس کی نظر ہے اور منافق صفت لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے (و کان اللہ سمیعًا بصیرًا)۔

یہ آیت ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت بیان کرتی ہے کہ اسلام کی نگاہ صرف معنوی اور اخروی پہلوؤں پر نہیں بلکہ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے مادی اور روحانی دونوں طرح کی سعادتیں چاہتا ہے۔

۱۳۵۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ○

ترجمہ

۱۳۵۔ اے ایمان والو، مکمل طور پر عدالت کے ساتھ قیام کرو، خدا کے لیے گواہی دو اگرچہ یہ خود تمھارے لیے یا تمھارے والدین کے لیے یا تمھارے اقربا کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا حق رکھتا ہے کہ ان کی حمایت کرے اس لیے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو، اس طرح تو حق سے منحرف ہو جاؤ گے۔ اور اگر حق میں تحریف کرو گے یا اس کے اظہار سے اعراض کرو گے تو جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔



تفسیر

عدالتِ اجتماعی

گذشتہ آیات میں خصوصیت سے یتیموں اور بیویوں سے عدالت کے بارے میں احکام تھے اب زیرِ نظر آیت میں بلا استثناء ایک بنیادی اور کلّی قانون کے ذریعے سب اہل ایمان کو اجرائے عدالت کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ عدالت قائم کریں اور عدالت سے کام لیں (یاایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط)۔

توجہ رہے کہ "قوامین" "قوام" کی جمع ہے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے "بہت قیام کرنے والا"۔ یعنی ہر حالت میں، ہر کام میں، ہر مقام پر اور ہر دور میں عدالت کے ساتھ قیام کرو تاکہ یہ عمل تمہارے اخلاق اور عادات کا حصّہ بن جائے اور اس سے انحراف تمہاری طبیعت، مزاج اور روح کے خلاف ہو جائے۔

"قیام" شاید یہاں اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ عام طور پر کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور کام کے پیچھے لگ جائے اس لیے کسی کام کے لیے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے لیے عزم راسخ اور مضبوط ارادے سے اقدام کیا جائے۔ اگرچہ وہ کام حکم قاضی کی مثل قیام و تحرک کا محتاج بھی نہ ہو۔ نیز ممکن ہے لفظ "قیام" کا استعمال اس لحاظ سے ہو کہ عام طور پر قائم اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر عمودی شکل میں ہو اور کسی طرف بھی تھوڑا سا جھکاؤ بھی نہ رکھتی ہو یعنی تمہیں عدالت کا اجراء اس طرح سے کرنا چاہیے کہ تھوڑا سا انحراف بھی نہ ہو۔

اس کے بعد تاکید کے لیے مسئلہ شہادت کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے: خاص طور پر شہادت اور گواہی کے معاملے میں تمام مفادات اور تعلّقات کو ایک طرف کر کے فقط خدا کے لیے گواہی دو اگرچہ وہ خود تمہاری ذات، تمہارے ماں باپ اور اعزّا و اقرباء کے نقصان میں ہو (شھداء للّٰہ و لو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین)۔

یہ بات تمام معاشروں میں موجود ہے اور خصوصاً زمانہ جاہلیّت کا معاشرہ اس کا شکار تھا کہ عام طور پر گواہی دینے والے اپنی محبّت و نفرت کے جذبات کے زیرِ اثر گواہی دیتے اور حق و عدالت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ ابن عباس سے منقول ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نو مُسلم افراد مدینہ میں آجانے کے بعد بھی رشتہ داری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے عزیزوں کے نقصان میں گواہی دینے سے احتراز کرتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور اس کے ذریعے ایسے لوگوں کو تنبیہ کی گئی۔[1]

جیسا کہ آیت اشارہ کر رہی ہے یہ کام روحِ ایمان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حقیقی مومن وہی ہے جو حق اور عدالت کے سامنے کسی کا لحاظ نہ کرے یہاں تک کہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے مفادات کی پرواہ نہ کرے۔

---

[1] المنار جلد ۵ صفحہ ۴۵۵



اس جملے سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رشتہ دار ایک دوسرے کے نفع یا نقصان میں گواہی دے سکتے ہیں (ہاں البتہ اس میں اس تہمت کا اندیشہ نہ ہو کہ طرفداری یا تعصب سے کام لیا جارہا ہے)۔

اس کے بعد اصولِ عدالت سے انحراف کے کچھ اور عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نہ دولت مندوں کی دولت شہادتِ حق سے مانع ہو اور نہ فقیر کے فقر کو دیکھ کر پیدا ہونے والے جذبات۔ کیونکہ شہادتِ حق جس کے نقصان میں جاری ہو وہ دولت مند ہو یا فقیر، خدا اس کے حالات سے زیادہ آگاہ ہے۔ پروردگار کی حمایت کے مقابلے میں اہل ثروت و اہل اقتدار سچی گواہی دینے والے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ عدالت کے اجراء سے فقیر ہی بھوکا رہ سکتا ہے (ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما)۔

دوبارہ تاکید کے طور پر حکم دیا گیا ہے: ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو، مبادا اجرائے عدالت میں رکاوٹ پیدا ہو جائے (فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا [1])۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ظلم و ستم کا سرچشمہ ہوا پرستی ہے اور اگر کوئی معاشرہ ہوا پرست نہ ہو تو ظلم و ستم وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔

دوبارہ قیام عدالت کی اہمیت کے پیش نظر فرماتا ہے: اگر تم حق دار تک اس کا حق پہنچنے میں حائل ہوئے یا حق میں تحریف کی یا حق آشکار ہو جانے کے بعد اس سے اعراض کیا تو خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے (و ان تلووا [2] او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا) "تلووا" دراصل تحریف حق اور حق میں تغیر و تبدل کی طرف اشارہ ہے۔ "تعرضوا" حق کے مطابق حکم کرنے سے اعراض اور منہ موڑنے کے معنی میں ہے۔ یہی بات امام باقرؑ سے منقول ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے [3]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں "خبیر" کا لفظ آیا ہے "علیم" کا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "خبیر" عموماً اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کی جزئیات اور ذرہ ذرہ سے واقف ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ حق سے تمہارے ذرا سے انحراف سے بھی واقف ہے چاہے تم اسے کسی بہانے سے کرو اور چاہے اسے حق بجانب قرار دے لو اور وہ اس کی سزا بھی دے گا۔

زیر نظر آیت اجتماعی عدالت کے بارے میں اسلام کی گہری دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے اور اس کی ہر شکل و صورت کو مکمل طور پر واضح کرتی ہے اس سلسلے میں عدالت اجتماعی کے بارے میں ان چند جملوں میں موجود طرح طرح کی تاکیدیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلام اس اہم انسانی مسئلے میں کس قدر حساس ہے البتہ یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ مسلمانوں کا عمل اور اسلام

---

[1] لفظ — تعدلوا ممکن ہے "عدالت" کے مادہ سے ہو یا "عدول" کے مادہ سے ہو اگر "عدالت" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا فلا تتبعوا الھوی لان تعدلوا (ہوس پرستی کی راہ نہ اپناؤ تاکہ تم عدالت کا اجرا کر سکو) اور اگر "عدول" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی یوں ہوگا فلا تتبعوا الھوی فی ان تعدلوا (انحراف حق کی راہ میں ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو)۔

[2] "تلووا" مادہ "لی" (بروزن "طی") سے ہے اس کا معنی ہے "روکنا" یا "تاخیر"۔ یہاں دراصل ترجیح و تاب دینے کے معنی میں آیا ہے۔

[3] تفسیر تبیان جلد ۵ صفحہ ۳۵۶

کے اس بلند پایہ حکم کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے اور مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک عامل ان کا یہ طرزِ عمل بھی ہے ۔

۱۳۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ
رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ
وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا
بَعِيدًا ○

ترجمہ

۱۳۶۔ اے ایمان لانے والو! (واقعی) ایمان لے آؤ خدا پر، اس کے پیغمبر پر، اس کی کتاب پر جو اس پر نازل ہوئی اور ان (آسمانی) کتب پر جو اس سے پہلے بھیجی گئی ہیں اور جو شخص خدا، اس کے ملائکہ، اس کی کتب، اس کے رسل اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں مُبتلا ہے ۔

شانِ نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بعض سربرآوردہ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں عبداللہ بن سلام، اسد بن کعب اور اس کا بھائی اسید بن کعب اور بعض دوسرے لوگ شامل تھے وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ابتداء میں خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ پر، آپ کی کتاب پر، حضرت موسیٰ پر، تورات پر اور عزیر پر ایمان لائے ہیں لیکن ہم باقی آسمانی کتب اور اسی طرح دیگر انبیاء پر ایمان نہیں لائے ۔

مندرجہ بالا آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی جس میں انھیں تعلیم دی گئی کہ انھیں سب پر ایمان لانا چاہیے (تفسیر مجمع البیانؒ و المنار)

تفسیر

شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا روئے سخن اہلِ کتاب کے بعض مومنین کی طرف ہے جو مخصوص تعصبات کی وجہ سے اسلام قبول کر لینے کے بعد صرف اپنے سابق مذہب اور دینِ اسلام پر اظہارِ ایمان کرتے تھے اور باقی انبیاء اور آسمانی کتب کو قبول نہیں کرتے تھے لیکن قرآن انھیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ تمام انبیاء اور آسمانی کتب کو باقاعدہ تسلیم کریں کیونکہ سب ایک ہی حقیقت کا تسلسل ہیں، سب کا ہدف ایک ہی ہے اور سب ایک ہی مبداء کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں (اگرچہ تعلیم کے درجوں کی مختلف کلاسوں کی طرح مراتب کا فرق موجود ہے اور ہر کوئی گذشتہ دین سے کامل تر دین کے ساتھ آیا ہے) اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے بعض کو تو قبول کر لیا جائے اور بعض کو نہ کیا جائے کیا ایک ہی حقیقت کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

اور کیا تعصبات حقائق پر پردہ ڈال سکتے ہیں ـــــــ لہٰذا آیت کہتی ہے :

اے ایمان لانے والو! خدا پر، اس کے پیغمبر (رسولِ اسلام) پر اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر نیز گذشتہ آسمانی کتب پر ایمان لے آؤ (یا ایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللّٰہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علیٰ رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل)۔

مذکورہ شانِ نزول سے قطع نظر آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو ظاہراً اسلام قبول کر چکے ہیں لیکن ابھی تک ایمان ان کی روح کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ یہاں انھیں دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ صمیم قلب سے مومن بن جائیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ روئے سخن ان تمام مومنین کی طرف ہو جو اجمالی طور پر خدا اور پیغمبر پر ایمان لا چکے ہیں لیکن اسلام کی جزئیات اور عقائد کی تفصیلات سے آشنا نہیں ہیں۔ یہاں قرآن انھیں حکم دیتا ہے کہ حقیقی مومنین کو چاہیے کہ وہ تمام انبیاء، گذشتہ کتب اور خدا کے فرشتوں پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان پر ایمان نہ لانے کا مطلب حکمتِ خداوندی کا انکار ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ جو حکیم ہے اس نے گذشتہ انسانوں کو بغیر رہبر و رہنما کے چھوڑ دیا ہو کہ وہ میدانِ حیات میں سرگرداں رہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جن فرشتوں پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا ہے ان سے مراد وحی لانے والے فرشتے ہیں کہ جن پر ایمان لانا انبیاء اور کتبِ آسمانی پر ایمان کے ساتھ لازم و ملزوم ہے یا پھر یہاں تمام فرشتے مراد ہیں کیونکہ جیسے ان میں سے بعض وحی و تشریع کے معاملے میں دخیل ہیں بعض عالمِ تکوین کی تدبیر پر بھی مامور ہیں اور ان پر ایمان لانا حکمتِ الٰہی پر ایمان لانے کا حصّہ ہے۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو ان حقائق سے غافل ہیں ارشاد ہوتا ہے : جو شخص خدا، ملائکہ، کُتبِ الٰہی، خدا کے فرستادہ انبیاء اور یوم آخرت کا انکار کرے تو وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے (ومن یکفر باللّٰہ و ملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر فقد ضل ضلٰلا بعیدا)۔ درحقیقت اس آیت میں یہ پانچ اصولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں مبداء، معاد، آسمانی کتب، انبیاء اور ملائکہ۔

ضلال بعید (دور کی گمراہی) یہ ایک لطیف تعبیر ہے یعنی ایسے لوگ اس طرح سے دور پھینک دیئے گئے ہیں کہ حقیقی شاہراہ کی طرف ان کی واپسی آسانی سے ممکن نہیں ہے۔

۱۳۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا ۝

۱۳۸۔ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

۱۳۹۔ اَلَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا ؕ

ترجمہ

۱۳۷۔ وہ لوگ جو ایمان لاکر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے اور دوبارہ کافر ہو گئے پھر اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی انھیں راہِ راست کی ہدایت کرے گا۔

۱۳۸۔ منافقین کو بشارت دو کہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

۱۳۹۔ جو لوگ اہلِ ایمان کی بجائے کفار کو اپنا دوست چن لیتے ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان سے عزت و آبرو حاصل کریں حالانکہ تمام عزتیں تو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم منافقین کا انجام

گذشتہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار دور کی گمراہی میں ہیں اب اسی مناسبت سے زیرِ نظر آیت میں سلسلہ کلام آگے بڑھتا ہے پہلی آیت میں ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر روز اپنے آپ کو ایک نئی شکل و صورت میں پیش کرتا ہے یہ لوگ ایک دن مومنین کی صف میں ہوتے ہیں، دوسرے دن کفار کے ساتھ، اگلے روز پھر اہلِ ایمان کے ساتھ ہوتے ہیں پھر خطرناک اور متعصب کافروں کی صفوں میں موجود ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ بُت عیار کی طرح ہر لمحہ ایک نیا روپ اختیار کرتے ہیں ہر روز ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں اور آخر کار کفر اور بے ایمانی کی حالت میں جان دے دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت ایسے اشخاص کے انجام کے بارے میں کہتی ہے: وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر میں بڑھ گئے خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور راہِ راست کی ہدایت نہیں کرے گا (ان الذین اٰمنوا ثم کفروا ثم اٰمنوا ثم کفروا ثم ازدادوا کفرًا لم یکن اللّٰہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا)۔

طرز و روش کا یہ تغیر، ہر روز رنگ و روپ کی یہ تبدیلی اور تلون مزاجی کا یہ عالم دراصل اسلامی اصولوں کی صحیح طور پر تحقیق نہ کرنے کا نتیجہ ہے اور یا منافقین اور اہل کتاب میں سے متعصب کفار کی سازش ہے تاکہ حقیقی مومنین کو متزلزل کیا جا سکے کیونکہ ان کے زعم میں ان کی یہ آمد و رفت حقیقی مومنین کے ایمان کو ڈانواں ڈول کر دے گی۔ جیسا کہ سورۂ آلِ عمران



آیۃ ۷۲ میں گذر چکا ہے۔

زیر بحث آیت میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہونے کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے آیت کا موضوع سخن صرف وہ لوگ ہیں جو شدت کفر کی حالت میں بالآخر اس دنیا سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں ایسے لوگ اپنے ایمان اور عمل کے پیش نظر بخشش کے لائق ہیں نہ ہدایت کے اہل مگر یہ کہ وہ اپنے معاملے میں تجدید نظر کر لیں۔

بعدازاں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ان منافقین کو بشارت دیجیے کہ دردناک عذاب ان کے لیے تیار ہے (بشر المنافقین بان لهم عذابا الیما)۔

"عذاب الیم" کے لیے "بشارت" یا تو ان کے لغو اور بے ہودہ افکار و نظریات کا استہزا ہے یا پھر "بشر" چہرہ کے معنی سے ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور ہر اس خبر کو بشارت کہتے ہیں جو انسان کے چہرے پر اثرانداز ہو اور اسے مسرور یا مغموم کر دے۔

آخری آیت میں ان منافقین کی یوں توصیف کی گئی ہے: وہ مومنین کی بجائے کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں (الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین)۔ پھر بتایا گیا ہے کہ اس میں ان کا ہدف اور مقصد کیا ہے: کیا وہ اس دوستی کے ذریعہ واقعی کوئی عزت و آبرو حاصل کرنا چاہتے ہیں (ایبتغون عندهم العزة) جبکہ تمام عزتیں خدا کے لیے مخصوص ہیں (فان العزة لله جمیعا) کیونکہ علم کا سرچشمہ ہمیشہ علم و قدرت ہوتا ہے اور جن کی قدرت کی کوئی حیثیت نہ ہو اور ان کا علم بھی ان کی قدرت جیسا ہو وہ کسی کو کیا صاحب عزت کر سکتے ہیں۔

یہ آیت تمام مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کے لیے چاہے وہ اقتصادی یا ثقافتی پہلو سے ہو یا سیاسی حوالے سے دشمنان اسلام کی دوستی تلاش نہ کریں بلکہ وہ ذات الٰہی پر بھروسہ کریں جو تمام عزتوں کا سرچشمہ ہے۔ دشمنان اسلام کی اپنی بھی کوئی عزت نہیں وہ دوسروں کو کیا دیں گے اور اگر ان کی بظاہر کچھ عزت ہو بھی تو وہ قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ جب بھی ان کے مفاد کا تقاضا ہوا وہ فوراً اپنے مخلص ترین اتحادیوں کو بھی چھوڑ کر اپنی راہ لیں گے اور ان کی یہ حالت ہو گی جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔ دور حاضر کی تاریخ بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

۱۴۰۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ
بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ
اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ
جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ



ترجمہ

۱۴۰۔ اللہ نے قرآن میں تم پر (یہ حکم) نازل کیا ہے کہ جب تم سنو کہ کچھ لوگ آیاتِ الٰہی کا انکار اور استہزاء کر رہے ہیں تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ کوئی اور گفتگو نہ کرنے لگیں ورنہ اس صورت میں تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔ خدا منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کر دے گا۔

شانِ نزول

ابن عباس سے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ بعض منافقین یہودی علماء کی بیٹھکوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ان میٹنگوں میں آیاتِ قرآنی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس کام کا بُرا انجام بتایا گیا۔

تفسیر

بُری مجلس میں نہ بیٹھو

سورہ انعام قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں سے ہے اس کی آیت ۶۸ میں صراحت سے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ:

اگر آپ دیکھیں کہ کچھ لوگ قرآنی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ناپسندیدہ باتیں کہتے ہیں تو ان سے اعراض کیجئے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ حکم نبی کریمؐ سے مخصوص نہیں بلکہ ایک عمومی حکم ہے البتہ اس میں خطاب پیغمبر سے کیا گیا ہے اس کا فلسفہ بھی بالکل واضح ہے کیونکہ یہ ایسے کاموں سے مقابلے کی ایک منفی صورت ہے زیر بحث آیت میں اس اسلامی حکم کی تاکید کی گئی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ: قرآن میں تمھیں پہلے حکم دیا گیا ہے کہ جب سنو کہ کچھ لوگ آیات قرآنی سے کفر کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس وقت تک ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک وہ اس کام سے صرف نظر کر کے دوسرا کام شروع نہ کریں (وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم اٰیٰت اللہ یکفر بہا ویستہزء بہا فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ)۔

اس کے بعد اس کام کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے: اگر تم ایسی مجالس میں شرکت کرو گے تو ان جیسے ہو جاؤ گے اور تمھارا انجام بھی ان جیسا ہوگا (انکم اذاً مثلہم)۔

تاکید مزید کے لیے فرمایا گیا ہے: ایسی میٹنگوں میں شرکت روحِ نفاق کی علامت ہے اور خدا منافقین اور کفار سب کو جہنم میں جمع کر دے گا (ان اللہ جامع المنٰفقین والکافرین فی جہنم جمیعاً)۔

چند اہم نکات

۱۔ مجلس گناہ میں شرکت ارتکابِ گناہ کی مانند ہے اگرچہ شریک ہونے والا خاموش ہی بیٹھا رہے کیونکہ ایسی خاموشی ایک طرح کی رضامندی اور عملی تائید ہے۔

۲۔ نہی عن المنکر اگر "مثبت" صورت میں ممکن نہ ہو تو کم از کم "منفی" صورت میں ہی انجام دینا چاہیے اس طرح سے کہ انسان گناہ کے ماحول اور گناہ کی مجلس سے ہی دور رہے۔



۳۔ جو لوگ سکوت اور ایسی مجالس میں شریک ہو کر عملی طور پر گناہ گاروں کی تشویق کا باعث بنتے ہیں ان کی سزا بھی ارتکاب گناہ کرنے والوں کی طرح ہے۔

۴۔ کفار کے ساتھ اس صورت میں نشست و برخاست جبکہ وہ آیات خداوندی کی توہین نہ کریں اور ان سے کوئی خطرہ بھی نہ ہو ممنوع نہیں ہے کیونکہ "حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ" کے جملہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام مباح ہے۔

۵۔ ایسے گنہ گاروں سے اچھا برتاؤ نفاق کی علامت ہے کیونکہ حقیقی مسلمان کسی ایسی مجلس میں ہرگز شرکت نہیں کر سکتا جس میں آیات خداوندی اور احکام الٰہی کی توہین ہو رہی ہو ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایک حقیقی مسلمان ایسی مجلس میں ہو اور نہ اعتراض کرے اور نہ اظہار ناپسندیدگی کے لیے محفل کو چھوڑے۔

۱۴۱۔ الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝

ترجمہ

۱۴۱۔ منافقین وہ ہیں جو ہمیشہ منتظر رہتے ہیں اور تمہارے نگران رہتے ہیں اگر تو تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے (لہٰذا ہم بھی افتخار، اعزاز اور مال غنیمت میں تمہارے شریک ہیں) اور اگر کفار کامیاب ہو جائیں تو انہیں کہتے ہیں کیا ہم نے تمہیں جنگ اور مومنین کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی (لہٰذا ہم تمہارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہیں) خدا تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اس نے ہرگز مومنین پر کافروں کے غلبے کی راہ نہیں بنائی۔

تفسیر

منافقین کی صفات

زیر نظر آیت اور اس کے بعد کی کچھ آیات میں منافقین کی صفات اور ان کے افکار پریشان کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: منافق وہ ہیں جو ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر پیش آنے والے واقعہ سے مفاد اٹھائیں اگر تو تمہیں کامیابی حاصل ہو جائے



توفوراً اہلِ ایمان کی صفوں میں آکھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے کیا ہماری بھاری امداد اس کامیابی میں تمھارے کام نہیں آئی لہٰذا ہم بھی ان تمام فوائد میں اور مادی و معنوی منافع میں تمھارے شریک اور حصّہ دار ہیں (الذین یتربصون بکم فان کان لکم فتح من اللہ قالوا الم نکن معکم)۔

لیکن اگر کامیابی اسلام کے دشمنوں کو ہوئی تو فوراً اپنے آپ کو ان کے قریب کر لیتے ہیں اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ ہم ہی تھے جو تمھیں مسلمانوں سے جنگ کرنے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اس لیے ہم بھی تمھاری ان کامیابیوں میں حصّہ دار ہیں (وان کان للکفرین نصیبٌ قالوا الم نستحوذ علیکم[1] ونمنعکم من المؤمنین)۔

اس طرح یہ لوگ اپنی موقع پرستی کے ذریعے چاہتے ہیں کہ مومنین کی کامیابی کی صورت میں افتخار و اعزاز پائیں یہاں تک کہ مالِ غنیمت میں بھی حصّہ دار بنیں اور ان پر احسان جتلائیں اور دوسری طرف کفار کی کامیابی پر بھی خوش ہوتے ہیں انھیں کفر میں پختہ تر کرتے ہیں، مسلمانوں کے خلاف ان کے حق میں جاسوسی کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کی راہ ہموار کرتے ہیں گویا وہ "رفیق قافلہ" بھی ہیں اور "شریک راہزن" بھی۔ وہ اپنی زندگی اسی دوہرے کھیل میں گزار دیتے ہیں۔

قرآن ایک مختصر سے جملے میں ایسے لوگوں کا انجام بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: آخر کار ایک دن آ ہی جائے گا جب پردے اُٹھ جائیں گے اور ان کے بُرے چہروں سے نقاب پلٹ دیے جائیں گے ہاں "قیامت کے دن تمھارے درمیان خدا فیصلہ کرے گا" (فاللہ یحکم بینکم یوم القیٰمۃ) لہٰذا حقیقی مومنین کو چاہیے کہ ان سے مرعوب نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: کبھی خدا مومنین پر کافروں کے تسلط کی راہ نہیں بناتا (ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا) کیا اس جملے سے مراد یہ ہے کہ منطق و استدلال کے لحاظ سے کفار کبھی مومنین پر غلبہ نہیں پائیں گے یا اس سے فوجی کامیابی یا ایسی کوئی اور کامیابی مراد ہے اس سلسلے میں ہم بعض پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

لفظ "سبیل" اصطلاح کے مطابق "نکرہ سیاق نفی میں" کے قبیل سے ہے جو کہ عمومیت کے معنی دیتا ہے لہٰذا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف منطق و استدلال سے بلکہ سیاسی، فوجی، ثقافتی، اقتصادی غرض کسی لحاظ سے بھی کفار اہلِ ایمان پر غالب نہیں آئیں گے آج اگر مختلف میدانوں میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مسلمان حقیقی مومن نہیں ہیں۔ آج مسلمان ایمان کے تقاضے، اپنی ذمہ داریاں، اپنا حقیقی طرزِ عمل اور اسلامی افکار سب کچھ فراموش کر چکے ہیں نہ ان میں اتحاد اور اخوت اسلامی کی کوئی خبر ہے نہ حقیقی معنی میں جہاد کرتے ہیں اور نہ وہ علم و آگہی کے حامل ہیں، حالانکہ

---

[1] "استحوذ" کا مادہ "حوذ" ہے یہ رانوں کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔ ساربان جب اونٹ کو تیز چلانا چاہتا ہے تو اس کے پیچھے ہو کر اس کی رانوں اور پشت پر مارتا ہے لہٰذا "استحواذ" چلانے اور متحرک کرنے کے حوالے سے تسلط و غلبہ کا مفہوم دیتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی اسی معنی میں ہے۔



اسلام نے ان سب پر حصولِ علم لمحہ ولادت سے لے کر لحظہ موت تک لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بعض فقہا نے حقوق اور حکم کے حوالے سے مختلف مسائل میں مومنین پر کفار کے عدم تسلّط کے لیے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ آیت کی عمومیت کے پیش نظر یہ بات زیادہ بعید نظر نہیں آتی (غور کیجیے گا)۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کی کامیابی کے لیے "فتح" کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ کفار کی کامیابی کے لیے لفظ "نصیب" استعمال ہوا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کفار کو کچھ کامیابیاں نصیب ہوں تو وہ محدود، وقتی اور ناپائیدار ہوں گی آخری فتح تو اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوگی۔

۱۴۲۔ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ○

۱۴۳۔ مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ○

ترجمہ

۱۴۲۔ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ انھیں دھوکا دیتا ہے (یعنی ان کا فریب باطل کر دیتا ہے) اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سستی اور کسالت کے ساتھ، لوگوں کے سامنے ریاکاری کرتے ہیں اور خدا کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔

۱۴۳۔ وہ بے ہدف افراد ہیں نہ اِن کی طرف مائل ہیں نہ اُن کی طرف (نہ اہل ایمان کی صف میں ہیں نہ کافروں کی قطار میں) اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے تمھیں کوئی راہ نہ ملے گی۔

تفسیر

منافقین کی پانچ صفات

۱۔ وہ اپنے منحوس مقاصد کی تکمیل کے لیے دھوکا اور فریب دہی کی راہ اختیار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ



خدا کو بھی دھوکا دے دیں۔ حالانکہ جب وہ ایسا کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں خود فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ ناچیز اور حقیر سرمایے کے حصول کے لالچ میں اپنا وجود اور انسانیت کا عظیم سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں (ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم)۔

مندرجہ بالا تفسیر "وھو خادعھم" کی واؤ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں واؤ حالیہ ہے۔

بعض بزرگوں سے ایک قِصّہ منقول ہے۔ ایک بزرگ پیشہ وروں سے کہتے تھے:

"ڈرو، کہیں غریب مسافر تمھیں دھوکا نہ دے دیں"۔

کسی نے کہا: وہ تو انجان اور سادہ لوح ہوتے ہیں اور ہم انھیں دھوکا دے سکتے ہیں۔

بزرگ نے کہا: میرا مقصد بھی یہی ہے کہ اس طرح دھوکا دے کر تم ناچیز سرمایہ تو حاصل کر بیٹھے ہو اور ایمان کا عظیم سرمایہ گنوا بیٹھتے ہو۔

۲۔ وہ خدا سے دور ہیں۔ اس سے راز و نیاز کی لذت سے محروم ہیں لہٰذا "جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سرتاپا کسالت، سستی اور بے حالی میں غرق ہوتے ہیں (واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ)۔

۳۔ وہ چونکہ خدا اور اس کے عظیم وعدوں پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا اگر کوئی عبادت یا کوئی نیک کام انجام بھی دیتے ہیں تو وہ بھی ریاکاری کے لیے نہ کہ خدا کے لیے (یراءون الناس)۔

۴۔ وہ اگر کوئی ذکر بھی کرتے ہیں یا خدا کو یاد کرتے ہیں تو صمیم قلب سے نہیں اور نہ آگاہی و بیداری سے اور اگر ہو بھی تو بہت ہی کم (و لا یذکرون اللہ الا قلیلاً)۔

۵۔ یہ لوگ سرگرداں اور بے ہدف جیتے ہیں ان کے پاس نہ زندگی کا کوئی پروگرام ہے نہ کوئی واضح راستہ۔ نہ وہ مومنین میں سے ہیں اور نہ کفار میں سے (مذبذبین بین ذٰلک لا الیٰ ھٰؤلاء و لا الیٰ ھٰؤلاء)۔

توجہ رہے کہ "مذبذب" اسمِ مفعول ہے اس کا مادہ "ذبذب" ہے یہ ایک مخصوص صدا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی چیز آویزاں ہوں، ہوا کی موجیں اسے حرکت دیں تو جو آواز اس ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے اسے "ذبذب" کہتے ہیں، بعد ازاں یہ لفظ متحرک اشیاء، سرگرداں اور بے ہدف لوگوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ منافقین کے بارے میں قرآن حکیم میں استعمال ہونے والی یہ لطیف ترین تعبیر ہے۔ ضمناً یہ تعبیر اس مطلب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ ایسا نہیں کہ منافقین کو پہچانا نہ جا سکے بلکہ ان کا یہ تذبذب ایک خاص آہنگ سے ہم رنگ ہوتا ہے جس کی طرف توجہ کرنے سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ منافقین ایک معلق اور آویزاں جسم کی طرح ہیں اور ذاتی طور پر ان کے بس میں کچھ نہیں یہ تو مختلف ہوائیں چلتی ہیں جو انھیں ادھر ادھر حرکت دیتی ہیں جدھر کو ہوا کا رُخ ہو ان کی حرکت بھی اُدھر کو ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں ان کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے اعمال کے باعث اللہ نے اپنا دستِ حمایت ان سے اٹھا لیا اور انھیں بے راہ رویوں میں گمراہ چھوڑ دیا ہے اور "جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے تمھیں کبھی راہِ نجات نہیں ملے گی" (و من یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلاً)۔



خدا کے گمراہ کرنے سے متعلق اور یہ کہ اس سے اختیار اور ارادے کی نفی نہیں ہوتی ـــــ تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرہ آیت ۲۶ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے۔

۱۴۴۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۚ أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَٰنًا مُّبِينًا ۝

۱۴۵۔ إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ فِى ٱلدَّرْكِ ٱلْأَسْفَلِ مِنَ ٱلنَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝

۱۴۶۔ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ وَأَصْلَحُوا۟ وَٱعْتَصَمُوا۟ بِٱللَّهِ وَأَخْلَصُوا۟ دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُو۟لَٰٓئِكَ مَعَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۱۴۴۔ اے ایمان والو! مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سہارا نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ (ایسا کرکے) اپنے خلاف بارگاہ الٰہی میں ایک واضح دلیل قائم کر لو۔

۱۴۵۔ (کیونکہ) منافقین تو دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہیں اور تمھیں ان کا ہرگز کوئی مددگار نہیں ملے گا (لہٰذا دشمنان خدا کی دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ یہ نفاق کی علامت ہے)۔

۱۴۶۔ مگر وہ جو توبہ کر لیں اور اصلاح و تلافی کر لیں اور خدا (کے لطف کے دامن) سے وابستہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کر لیں وہ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور خدا اہلِ ایمان کو اجرِ عظیم عطا کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں منافقوں اور کافروں کی کچھ صفات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان آیات میں پہلے تو مومنین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ مومنین کی بجائے کافروں (اور منافقوں) کو اپنا سہارا اور ولی نہ سمجھیں (یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المؤمنین) کیونکہ یہ قانون شکنی اور خدا سے شرک کے مترادف ہے اور عدالتِ الٰہی کے قانون کے



مطابق اس کی بہت سخت سزا ہے اسی لیے فرماتا ہے: کیا تم چاہتے ہو کہ بارگاہِ الٰہی میں اپنے خلاف ایک دلیل قائم کرلو (اتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا)[۱]۔

بعد والی آیت میں ان منافقین کی حالت واضح کی گئی ہے جن کی دوستی کا طوق غافل مسلمانوں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ یا پھر انھی کی حالت بیان کی گئی ہے جو اظہار اسلام کے باوجود نفاق کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تمھیں ان کا کوئی مددگار دکھائی نہ دے گا (ان المنٰفقین فی الدرک الاسفل من النار ولن تجد لھم نصیرا)[۲]۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں نفاق کفر کی بدترین اقسام میں سے ہے اور منافق خدا سے سب سے زیادہ دور ہیں اسی لیے ان کا ٹھکانا جہنم کا بدترین اور پست ترین طبقہ ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ انسانی معاشرے کو منافقین سے جو خطرات لاحق ہوتے ہیں ان کا کسی اور خطرے سے موازنہ نہیں کیا جا سکے گا۔ اظہار ایمان کی وجہ سے جو مقام اور تحفظ انھیں حاصل ہوتا ہے وہ اسے بے دفاع افراد کے خلاف بزدلانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور پشت کی جانب سے خنجر گھونپتے ہیں یہ بات مسلّم ہے کہ جو بزدل اور خطرناک دشمن دوستی کے روپ میں حملہ آور ہو وہ اس سے کہیں بدتر ہے جو کھلے بندوں دشمنی کا اعلان کرے اور اپنے آپ کو واضح طور پر پیش کرے۔ دراصل نفاق کا شیوہ گھٹیا، پست، بزدل، بے وقعت اور ہر لحاظ سے آلودہ افراد ہی اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ ایسے افراد بھی جو اس قدر آلودۂ گناہ ہیں چاہیں تو خدا کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کرلیں، مزید فرمایا: مگر یہ کہ ایسے لوگ توبہ کریں، اپنے اعمال کی اصلاح کریں (اور گذشتہ اعمال کی تلافی کریں)، لطف الٰہی سے متمسک ہوں اور اپنا دین و ایمان اللہ کے لیے خالص کریں (الا الذین تابوا واصلحوا واعتصموا باللہ واخلصوا دینھم للہ)۔ ایسے لوگ آخر کار نجات یافتہ ہو سکتے ہیں اور مومنین کے ساتھی بن سکتے ہیں (فاولٰئک مع المؤمنین) اور خدا تمام صاحبان ایمان کو اجرِ عظیم اور جزائے جزیل سے نوازے گا (وسوف یؤت اللہ المؤمنین اجرا عظیما)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ مومنین کے ہمراہ ہوں گے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ثابت قدم مومنین کا مقام ان سے برتر ہو گا وہ اصل ہیں اور یہ فرع۔ یہ تو پیچھے مومنین کے پرتو سے نور حاصل کریں گے۔

۱۔ "سُلطان" کا مادہ "سلاطہ" (بروزن "مقالہ") ہے جس کا معنی ہے دوسرے کو مقہور و مغلوب کرنے کی قدرت۔ خود لفظ "سلطان" اسم مصدر کا معنی رکھتا ہے اور ہر قسم کے تسلط کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی بنا پر "دلیل" کو بھی "سلطان" کہا جاتا ہے جو کہ ایک انسان کے دوسرے پر غلبہ کا باعث بنتی ہے بعض اوقات صاحبان قدرت کو بھی "سلطان" کہتے ہیں لیکن مندرجہ بالا آیت میں "سلطان" "دلیل و حجت" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ "درک" (بروزن "مرگ") دریا کی گہرائی کے گہرے ترین مقام کو کہتے ہیں نیز رسیوں کو گرہ دے کر دریا میں ڈالا جائے تو آخری رسی جو گہرائی تک جا پہنچے اسے دَرَک (بروزن فلک) کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب الفاظ کسی چیز کو پہچاننے اور اس تک پہنچ جانے کا مفہوم دیتے ہیں بعض اوقات تہ خانے کی سیڑھیوں کو بھی "درک" کہتے ہیں جب کہ چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو "درجہ" کہتے ہیں۔



دوسری بات جو قابل غور ہے یہ ہے کہ منافقین کا انجام بیان کرنے کے لیے انھیں دوزخ کا پست ترین طبقہ قرار دیا گیا ہے جبکہ مومنین کے بارے میں "اجرِ عظیم" کی بشارت دی گئی ہے جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے اور اس اجر کی عظمت لطفِ الٰہی سے وابستہ ہے۔

۱۴۷ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۱۴۷۔ خدا تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو (اور نعمتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرو) اور ایمان لے آؤ، خدا شکر گذار (قدر دان) اور آگاہ ہے (ان کے اعمال اور نیتوں کو جانتا ہے اور جو اچھا ہے اسے اچھی جزا دے گا)۔

تفسیر

خدا کی سزا انتقامی نہیں

گذشتہ آیات میں کافروں اور منافقوں کے لیے سخت سزاؤں کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں ایک اہم حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی طرف سے دردناک سزائیں اس بنا پر نہیں ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ گنہگار بندوں سے انتقام لے یا اپنی قدرت کا مظاہرہ کرے یا ان کی نافرمانی اور عصیان سے اسے کوئی نقصان پہنچا ہے جس کی وہ تلافی کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں تو کسی نقص اور کمی کا مظہر ہیں جبکہ خدا کی ذات ہر نقص اور کمی سے مبرّا ہے بلکہ یہ سب سزائیں خود انسانوں کے بُرے افکار و اعمال کا ردِ عمل اور نتیجہ ہیں، اسی لیے فرماتا ہے، اگر تم شکر گذاری کرو اور ایمان لے آؤ تو خدا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمھیں سزا دے (مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم و اٰمنتم)۔

شکر کا مفہوم یہ ہے کہ ہر نعمت کو اس طریقے سے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا جملے سے مراد یہ ہے کہ اگر تم ایمان لے آؤ اور عملِ صالح کرو، نعماتِ الٰہی کو مناسب طور پر استعمال کرو اور ان سے غلط فائدہ نہ اٹھاؤ تو بلاشبہ تھوڑی سی سزا بھی تمھارے دامن کو نہ چھوئے گی۔

تاکید مزید کے لیے کہتا ہے، خدا تمھارے اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے اور تمھارے نیک اعمال کے بدلے میں وہ بھی شاکر اور جزا دینے والا ہے (و کان اللہ شاکراً علیماً)۔



زیرِ نظر آیت میں "شکر" کو "ایمان" پر مقدم رکھا گیا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ انسان جب تک اس کی نعمتوں کو پہچان نہ لے اور شکر گذاری کے مقام تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک خود اسے نہیں پہچان سکتا۔ کیونکہ اس کی نعمتیں اس کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔ اسلامی عقائد کی کُتب میں بھی "وجوب معرفت الٰہی" کے لیے بعض لوگ "وجوب شکر منعم" کی دلیل پیش کرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ شکر گذاری انسانی فطرت ہے اور نعمتیں بخشنے والے کا شکر ادا کرنا واجب ہے لہٰذا اس نعمتیں عطا کرنے والے کی معرفت بھی واجب ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۴۸۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ○

۱۴۹۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ○

ترجمہ

۱۴۸۔ خدا پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص بُری باتیں کہے مگر یہ کہ جو ظلم و ستم سے مجبور ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۴۹۔ (لیکن) اگر نیکیوں کو آشکار کرو یا مخفی رکھو یا برائیوں سے صرف نظر کرو (تو تمہیں اس کی جزا دی جائے گی) خدا بخشنے والا اور قادر و توانا ہے (اور انتقام کی قدرت کے باوجود عفو و درگذر کرتا ہے)۔

تفسیر

اسلام کے چند اخلاقی احکام

ان دو آیتوں میں اسلام کے کچھ اخلاقی احکام بیان ہوئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے: خدا پسند نہیں کرتا کہ بدگوئی کی جائے یا بعض لوگوں کے عیب اور بُرے کام برملا بیان کیے جائیں (لا یحب اللّٰہ الجھر بالسوء من القول) کیونکہ خدا خود ستار العیوب ہے وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگوں کی پردہ دری کی جائے اور لوگوں کے عیب فاش کیے جائیں اور ان کی عزت و آبرو برباد کی جائے۔ علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کے عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزور اور مخفی پہلو ہوتے ہیں اگر یہ عیب ظاہر ہو جائیں تو پورے معاشرے میں بد اعتمادی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو جائے لہٰذا اجتماعی رشتوں کا استحکام اور



بشری تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ کسی صحیح مقصد کے بغیر کسی کے منفی اور کمزور پہلوؤں کا اظہار نہ ہو۔

ضمناً توجہ رہے کہ "سوء" سے مراد ہر طرح کی برائی اور قباحت ہے اور "جہر"، "من القول" سے مراد ہر قسم کا لفظی اظہار ہے چاہے وہ شکایت کی صورت میں ہو یا چغلی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جن آیات سے غیبت کی حرمت کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے ان میں زیر نظر آیت بھی شامل ہے لیکن آیت کا مفہوم غیبت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی بدگوئی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد بدگوئی کی استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر وہ شخص جو ظلم و ستم کے ہاتھوں مجبور ہو (الا من ظلم) ایسے لوگ حق رکھتے ہیں کہ اپنے دفاع کے لیے ظالم کے ظلم کی شکایت کریں یا واضح طور پر ظلم و ستم کی مذمت کریں اور ان پر تنقید کریں اور جب تک اپنا حق نہ لے لیں اور ظلم و ستم کا ازالہ نہ کر لیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں۔

درحقیقت یہ استثناء اس لیے ہے کہ کہیں مندرجہ بالا حکم سے ظالم اور ستمگر غلط فائدہ نہ اٹھائیں یا یہ حکم ظلم و ستم کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا بہانہ نہ بن جائے۔

واضح ہے کہ ایسے مواقع پر صرف ظالم کے ظلم اور مظلوم کے دفاع سے مربوط باتوں پر ہی اکتفا کیا جانا چاہیے۔

آیت کے آخر میں قرآن اپنی روش کے مطابق کہ کہیں کوئی مظلوم بن کر اس استثناء سے سوء استفادہ نہ کرے اور بلاوجہ لوگوں کے عیب بیان کرتا پھرے، فرماتا ہے: خدا باتوں کو سنتا اور نیتوں سے واقف ہے (و کان اللّٰہ سمیعًا علیمًا)۔

بعد والی آیت میں اس حکم کے نقطہ مقابل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا: اگر لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی حرج نہیں (جبکہ برائیاں استثنائی مواقع کے علاوہ مطلقاً چھپائی جانا چاہییں) نیز اگر برائیوں کے مقابلے میں لوگوں سے عفو و بخشش کی راہ اپناؤ تو بہتر ہے کیونکہ درحقیقت یہ الٰہی طرز عمل ہے کہ جو ہر قسم کے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنے اہل بندوں کے بارے میں عفو و بخشش سے کام لیتا ہے (ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللّٰہ کان عفوًا قدیرًا)۔

دوسری آیت دراصل دو پہلوؤں سے پہلی آیت کا نقطہ مقابل قرار دی جا سکتی ہے پہلا یہ کہ برائیوں کے اظہار کے مقابلے میں نیکیوں کا اظہار اور دوسرا جن پر ظلم و ستم ہوا ان کی طرف سے عفو و بخشش۔

ظالم سے درگذر اس کی تقویت کا سبب نہیں؟

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ستم گر سے درگذر حقیقت میں اس کے ظلم کی تائید نہیں اور کیا یہ کام اپنے ظلم کے جاری رہنے کے لیے تشویق و ترغیب کا باعث نہیں ہوگا اور کیا یہ عمل مظلوموں کے ذہنوں کو سُلا دینے والا نہیں ہے اور کیا منفی ردعمل پیدا نہیں کرے گا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عفو و درگذر کا اپنا محل و مقام ہے اور اظہار حق اور ظلم کے مقابلے کا موقع جدا ہے۔ اسی لیے احکام اسلامی میں ایک طرف ہے:

"لا تظلمون و لا تظلمون"



"نہ ظلم کرو اور نہ ظلم گوارا کرو" ———— (بقرہ ــــ ۲۷۹)

اور یہ بھی کہ:۔

کونا للظالم خصما و للمظلوم عونا

یعنی ——— ظالم کے دشمن ہو ، اور مظلوم کے ساتھی ۔ [۱]

نیز یہ بھی کہ:۔

فقاتلوا التی تبغی حتی تفیء الی امر اللہ

یعنی ——— ظالموں سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کے سامنے سرنگوں ہوجائیں ۔
(حجرات ——— ۹)

دوسری طرف عفو و درگذر اور بخشش کا حکم دیا گیا:

و ان تعفوا اقرب للتقوی

اور ——— اگر معاف کردو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب تر ہے ۔
(بقرہ ——— ۲۳۷)

یہ بھی فرمایا کہ:

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم

یعنی ——— معاف کردو اور درگذر سے کام لو، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہیں بخش دے۔ (نور ——— ۲۲)

ہو سکتا ہے کہ بعض کوتاہ نظر لوگوں کو ابتداء میں ان احکام میں تفاوت اور تضاد نظر آئے لیکن اسلامی مصادر اور کتب میں موجود احادیث کی طرف توجہ کی جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عفو و درگذر کا اپنا مقام ہے اور ظلم کی سرکوبی کے لیے مقابلے کا ایک الگ موقع و محل ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ عفو و درگذر اس موقع کے لیے ہے جہاں قدرت اور دشمن پر کامیابی حاصل ہو اور دشمن آخری شکست سے دوچار ہوجائے یعنی جہاں دشمن کی طرف سے کوئی نیا خطرہ محسوس نہ ہوتا ہو۔ اس موقع پر عفو و درگذر ایک طرح سے اصلاحی اور تربیتی اقدام ہے اور یہ طرز عمل دشمن کو اپنے طرز عمل پر نظر ثانی پر آمادہ کرے گا۔ تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے مواقع کا تذکرہ موجود ہے حضرت امیرالمومنینؑ کا یہ فرمان اس نقطہ نظر پر شاہد ہے، آپؑ نے فرمایا:

"اذا قدرت علی عدوك فاجعل العفو عنه شكرا للقدرة عليه"

جب دشمن پر کامیابی حاصل کر لو تو عفو و بخشش کو اس کامیابی کی زکوٰۃ اور شکر کا ذریعہ قرار دو۔ [۲]

---

[۱] نہج البلاغہ ، وصیت نامہ نمبر ۴۷
[۲] نہج البلاغہ ، کلمات قصار ، کلمہ ۱۰



دوسری طرف ایسے مواقع جہاں دشمن کا خطرہ ابھی باقی ہو اور احتمال ہو کہ درگذر کرنا اسے جرأت دے گا اور اس کی حوصلہ افزائی کرے گا یا یہ کہ عفو و بخشش یہاں ظلم کی تائید شمار ہو گی تو اسلام ایسی بخشش اور معافی کی کبھی اجازت نہیں دیتا اور ایسے مواقع پر رہبرانِ اسلام نے کبھی عفو و بخشش کی راہ نہیں اپنائی۔

۱۵۰۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ

۱۵۱۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا

۱۵۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۧ

ترجمہ

۱۵۰۔ جو لوگ خدا اور پیغمبروں کا انکار کرتے ہیں اور ان میں تبعیض اور فرق روا رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی راہ منتخب کریں۔

۱۵۱۔ وہ پکے کافر ہیں اور کفار کے لیے ہم نے ذلت آمیز سزا فراہم کر رکھی ہے۔

۱۵۲۔ (لیکن) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے انھیں عنقریب جزا دیں گے، خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

انبیاء میں فرق نہیں ہے

ان آیات میں کفار اور مومنین کی حالت بیان کی گئی ہے اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے یہ آیات گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں منافقین کا ذکر تھا۔



پہلے تو ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو انبیاءِ الٰہی میں فرق روا رکھتے ہیں۔ بعض کو حق پر سمجھتے ہیں اور بعض کو باطل پر۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں کے کافر اور منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق روا رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض پر تو ایمان رکھتے ہیں اگرچہ بعض کو قبول نہیں کرتے۔ اپنے گمان میں وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں یہی حقیقی کافر ہیں (ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ و یقولون نؤمن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذٰلک سبیلا اولٰئک ھم الکافرون حقا)۔

یہ جملہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی حالت بیان کر رہا ہے یہودی حضرت عیسٰیؑ کو نہیں مانتے اور یہودی اور عیسائی دونوں حضرت پیغمبر اسلامؐ کو نہیں مانتے حالانکہ ان کی اپنی کتابوں کے مطابق ان پیغمبروں کی نبوت ثابت شدہ ہے۔ حقائق کو قبول کرنے میں اس تبعیض کا سرچشمہ ہوا و ہوس اور جاہلانہ تعصبات ہیں اور بعض اوقات بے وجہ کا حسد اور تنگ نظری سدِ راہ ہوتی ہے یہ طرزِ عمل دراصل خدا پر اور انبیاء پر ایمان نہ لانے کی نشانی ہے کیونکہ ایمان یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اپنی طبیعت اور میلان کے مطابق ہو اسے تسلیم کر لیا جائے اور جو مزاج اور ہوس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے یہ تو ایک طرح کی نفس پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔ حقیقی ایمان تو یہ ہے کہ انسان حقیقت کو قبول کرے چاہے اس کے میلانِ طبع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو لہٰذا قرآن ایسے افراد کو مندرجہ بالا آیت میں کافر قرار دیتا ہے اگرچہ وہ خدا پر اور بعض انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں (ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ ....

اس لیے جن چیزوں پر وہ اظہارِ ایمان کرتے ہیں اسے بھی بے وقعت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس ایمان کا سرچشمہ جستجوئے حق نہیں ہے۔

آخر میں انھیں سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے کفّار کے لیے ذلّت آمیز اور رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے (واعتدنا للکفرین عذابا مھینا)۔ اس میں عذاب کو "مُہِین" (ذلّت آمیز) قرار دیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے انبیاء میں تبعیض اور فرق روا رکھ کے دراصل ان میں سے بعض کی توہین کی ہے لہٰذا ان کی سزا ان کے عمل کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔

گناہ اور سزا میں تناسب

سزا بعض اوقات "عذاب الیم" کی شکل میں ہوتی ہے مثلاً کوڑے لگانا اور بدنی تکلیف پہنچانا۔ بعض اوقات رُسوا کن ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کے لباس پر کیچڑ اچھالنا وغیرہ۔ کبھی شور و شین سے مملو عذابِ عظیم کی صورت میں۔ مثلاً کچھ لوگوں کی موجودگی میں سزا دینا اور بعض اوقات سزا کا اثر وجودِ انسانی پر گہرا ہوتا ہے اور ایک مُدّت تک باقی رہتا ہے جسے عذابِ شدید کہتے ہیں۔ مثلاً طویل المدت قید بامشقت اور دیگر سزائیں۔

واضح ہے کہ عذاب کی ان میں سے کوئی بھی نوعیت گناہ کی نوعیت کی مناسبت سے ہے اسی لیے بہت سی آیاتِ قرآنی میں ظالموں کی سزا "عذابِ الیم" قرار دی گئی ہے کیونکہ بندگانِ خدا پر دردناک ظلم کرنے سے یہی سزا مناسبت رکھتی ہے



جن کا گناہ توہین آمیز ہے ان کی سزا بھی ذلت آمیز ہے۔ اس طرح جو لوگ بڑے اور شدید گناہ کرتے ہیں ان کی سزا بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں کا مقصد مطلب کو ذہن نشین کرانا ہے ورنہ اس جہان کی سزاؤں کا قیاس اُس جہان کی سزاؤں پر نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد مومنین کی کیفیت اور انجام کا ذکر ہے، فرمایا: وہ لوگ جو خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اس طرح حق کے سامنے اپنے جذبۂ تسلیم اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہر طرح کے ناروا تعصب کے مقابلے میں اپنے قیام کا ثبوت دیتے ہیں خدا بہت جلد انھیں جزا دے گا (والذین امنوا باللہ ورسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولٰئک سوف یؤتیھم اجورھم)۔

البتہ پیغمبروں پر ایمان لانا اور عملاً انھیں تسلیم کر لینا اس بات کے منافی نہیں کہ ان میں سے بعض کو بعض سے افضل مانا جائے کیونکہ ان کی ماموریت اور ذمہ داریوں کے فرق کے لحاظ سے انکے مراتب میں فرق یقینی ہے۔ مقصد بیان یہ ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے اور انھیں عملاً تسلیم کرنے میں ہم کوئی فرق نہ کریں۔

آیت کے آخر میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ مومنین پہلے ایسے تعصبات اور تفریق کے قائل رہے ہیں، یا دوسرے گناہوں کے مرتکب رہے ہیں تو اب اگر وہ اپنے ایمان کو خالص کر کے خدا کی طرف لوٹ آئیں تو خدا انھیں بخش دے گا اور خدا ہمیشہ سے بخشنے والا اور مہربان ہے (وکان اللہ غفورًا رحیمًا)۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ زیر نظر آیات میں انبیاء میں تبعیض و تفریق کے قائل لوگوں کو حقیقی کفار قرار دیا گیا ہے لیکن جو سب پر ایمان لائے ہیں انھیں حقیقی مومن نہیں کہا گیا بلکہ صرف مومن کہا گیا ہے شاید فرق اس بنا پر ہو کہ حقیقی مومن وہ ہیں جو ایمان کے علاوہ عمل کے لحاظ سے بھی بالکل پاک اور صالح ہوں۔ اس بات کی شاہد وہ آیات ہیں جو سورۂ انفال کی ابتداء میں آئی ہیں جن میں خدا پر ایمان لانے کے بعد مومنین کی صفات میں ایک مثبت اور زندہ سلسلہ اعمال بیان کیا گیا ہے ان میں اخلاقی، اجتماعی اور ایمانی رشد کے علاوہ نماز، زکوٰۃ اور توکل بر خدا کی صفات بھی شامل ہیں اور اس کے بعد فرماتا ہے:

اولٰئک ھم المؤمنون حقًّا

یہ ہیں پکے اور حقیقی مومن۔ (انفال ——— ۴)

۱۵۳۔ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَقَدْ سَاَلُوْا
مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ
بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا
عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝



۱۵۴۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا
غَلِيظًا ○

ترجمہ

۱۵۳۔ اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (ایک ہی مرتبہ) آسمان سے ایک کتاب ان پر نازل کر دو (حالانکہ یہ تو ایک بہانہ ہی ہے) انھوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بہت بڑا سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے۔ اسی ظلم کی وجہ سے بجلی نے انھیں آلیا تھا۔ پھر انھوں نے ان واضح دلائل کے باوجود جو ان کے لیے آئے تھے (سامری کے) گو سالہ کو (خدا کے طور پر) منتخب کر لیا پھر بھی ہم نے انھیں معاف کر دیا اور موسیٰ کو ہم نے واضح برتری عطا کی۔

۱۵۴۔ اور ہم نے کوہِ طور ان کے اوپر بلند کیا اور اسی حالت میں ان سے عہد و پیمان لیا اور ان سے کہا کہ (توبہ کے طور پر بیت المقدس کے) دروازے سے خضوع کے ساتھ آؤ (نیز ہم نے ان سے کہا کہ ہفتہ کے روز تجاوز نہ کرو (اور کاروبار سے ہاتھ کھینچ لو) اور (ان تمام باتوں کے بارے میں) ہم نے ان سے محکم عہد و پیمان لیا۔

شانِ نزول

تفسیر تبیان، مجمع البیان اور روح المعانی میں ان آیات کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ کچھ یہودی پیغمبر اسلام کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ اگر تم اللہ کے پیغمبر ہو تو اپنی آسمانی کتاب ایک ہی دفعہ ہمارے سامنے پیش کرو جیسا کہ موسیٰ تورات کو اکٹھا لے کر آئے تھے۔

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ سازی

آیات میں پہلے اہلِ کتاب (یہودیوں) کے تقاضے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (دیکھا) ایک کتاب آسمان سے ان پر نازل کرو (یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتابًا من السمآء)۔



اس میں شک نہیں کہ ان کی اس فرمائش میں حسنِ نیّت شامل نہ تھی کیونکہ کُتب آسمانی کے نزول کا مقصد ارشاد، ہدایت اور تربیت ہے۔ بعض اوقات یہ ہدف آسمانی کُتب کے یکجا نازل ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی تدریجی تنزیل اس مقصد کے لیے زیادہ مددگار ہوتی ہے لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ پیغمبر سے دلیل کا مطالبہ کریں اور اعلیٰ وارفع تعلیمات کی فرمائش کریں نہ یہ کہ آسمانی کُتب کے نزول کی کیفیت معیّن کریں لہٰذا اس کے بعد خدا نے ان کے عدمِ حسنِ نیّت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے پیغمبرؐ کی تسلّی کے لیے یہودیوں کی سابقہ ہٹ دھرمی، عناد اور بہانہ جوئی کا تذکرہ کیا ہے جو وہ اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰؑ بن عمران سے کرتے رہے تھے فرمایا: انھوں نے موسیٰ سے اس سے بڑی اور زیادہ عجیب چیزوں کی خواہش کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے (فقد سألوا موسی اکبر من ذٰلک فقالوا ارنا اللہ جھرۃ)۔

یہ عجیب و غریب اور غیر منطقی فرمائش تھی جس سے بُت پرستوں کا سا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کو جسم میں اور محدود دیکھنے کا تقاضا کر رہے تھے اور بلاشبہ اس کی وجہ ہٹ دھرمی اور عناد تھی ان کے اسی ظلم کے باعث صاعقۂ آسمانی نے انھیں آلیا (فاخذتھم الصّٰعقۃ بظلمھم)۔

اس کے بعد ان کے ایک اور بُرے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے "گوسالہ پرستی"، فرمایا: انھوں نے ان معجزات اور واضح دلائل کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود بچھڑے کو اپنا معبود قرار دے دیا (ثم اتخذوا العجل من بعد ما جاءتھم البیّنٰت)۔

ان تمام چیزوں کے باوجود اس لیے کہ وہ صحیح راستے کی طرف لوٹ آئیں اور ہٹ دھرمی اور عناد کی سواری سے اتر پڑیں ارشاد فرمایا: پھر بھی ہم نے انھیں بخش دیا اور موسیٰ کو برتری عطا کی اور واضح حکومت بخشی۔ نیز سامری اور بچھڑا پرستوں کی بساط الٹ دی (فعفونا عن ذٰلک واٰتینا موسٰی سلطانًا مبینًا)۔

وہ پھر بھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور مرکبِ غرور سے نیچے نہ اُترے اسی لیے ہم نے کوہِ طور کو ان کے سروں پر متحرک کر دیا اور اسی حالت میں ان سے پیمان لیا اور ان سے کہا کہ اپنے گناہوں کی توبہ کے طور پر بیت المقدس کے دروازے سے خضوع و خشوع کے ساتھ داخل ہو جاؤ نیز انھیں تاکید کی کہ ہفتے کے روز کسب و کار سے دست کش ہو جاؤ اور تجاوز کی راہ نہ لو نیز اس دن دریائی مچھلیوں کا شکار نہ کرو کہ جو اس دن حرام ہے اور ان تمام چیزوں کے بارے میں ہم نے ان سے سخت عہد و پیمان لیا" لیکن انھوں نے ان میں سے کسی بھی تاکیدی عہد کو پورا نہیں کیا[1] (ورفعنا فوقھم الطور بمیثاقھم وقلنا لھم ادخلوا الباب سجدًا وقلنا لھم لا تعدوا فی السبت واخذنا منھم میثاقًا غلیظًا)۔

تو کیا یہ لوگ اس تاریک ماضی کے ہوتے ہوئے تم سے اپنے اس تقاضے میں سچے ہو سکتے ہیں؟ اگر یہ سچ کہتے ہیں تو پھر اپنی آسمانی

---

[1] کوہِ طور کے یہودیوں کے سروں پر مسلط ہونے کے بارے میں اور یہ کہ ایسا زلزلے کے زیرِ اثر تھا یا کسی اور عامل کی وجہ سے اور اسی طرح یہودیوں کے سابقہ بُرے اعمال کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں بحث کی جا چکی ہے۔ (صفحہ ۲۲۴ اردو ترجمہ دیکھیے)

کتب میں آخری پیغمبر کی صریح نشانیوں کے بارے میں عمل کیوں نہیں کرتے اور انھوں نے تمھارے بارے میں ان کھلی نشانیوں سے چشم پوشی کیوں اختیار کر رکھی ہے۔

دو اہم نکات

۱۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اعمال تو پہلے یہودیوں سے مربوط تھے پیغمبر اسلامؐ کے معاصر یہودیوں کا ان سے کیا واسطہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے بڑوں کے اعمال پر معترض نہیں تھے بلکہ ان سے موافق نظریئے کا اظہار کرتے تھے اس لیے سب ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں۔

۲۔ مندرجہ بالا آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہودی مدعی تھے کہ تورات یکبارگی نازل ہوئی ہے تو یہ کوئی مسلم بات نہیں ہے شاید اس توہم کا سبب وہ دس فرامین ہیں، جنھیں دس وصیتیں کہا جاتا ہے جو کہ اکٹھی تختیوں کی صورت میں حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے۔ جبکہ تورات کے دیگر احکام کے یکجا نازل ہونے کے بارے میں کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

۱۵۵۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

۱۵۶۔ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝

۱۵۷۔ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا
قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا
قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝

۱۵۸۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

ترجمہ

۱۵۵۔ وہ اس بنا پر کہ انھوں نے اپنا عہد توڑ دیا، آیاتِ الٰہی کا انکار، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور وہ (بطورِ تمسخر) کہتے تھے کہ

ہمارے دلوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے (اور ہم انبیاء کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے)، (لہٰذا وہ بارگاہِ الٰہی سے دھتکارے گئے) جی ہاں! خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے لہٰذا تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ باقی ایمان نہیں لائیں گے (اور یہ وہ ہیں جو راہِ حق پر چلتے ہیں اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے)

۱۵۶۔ نیز ان کے کفر کے باعث اور اس عظیم تہمت کی وجہ سے جو انھوں نے مریم پر لگائی ہے۔

۱۵۷۔ اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا ہے اور نہ سولی پر لٹکایا ہے مگر یہ کہ معاملہ ان پر مشتبہ ہوگیا اور جنھوں نے اس کے قتل کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کے متعلق شک میں ہیں اور اس کا علم نہیں رکھتے اور صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور انھوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا۔

۱۵۸۔ بلکہ خدا اسے اپنی طرف لے گیا اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

یہودیوں کی کچھ اور کارستانیاں

ان آیات میں بنی اسرائیل کی کچھ اور کارستانیوں، قانون شکنیوں، عداوتوں اور انبیاءِ الٰہی سے دشمنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں ان میں سے ایک گروہ کی پیمان شکنی، کفر اور قتل انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے انھیں پیمان شکنی کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا یا اپنی بعض پاکیزہ نعمتوں کو ان پر حرام قرار دے دیا (فبما نقضھم میثاقھم.....)۔[1]

اس عہد شکنی کے بعد انھوں نے آیات الٰہی کا انکار کیا اور مخالفت کا راستہ اختیار کیا (وکفرھم بایات اللّٰہ) اور انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک اور بڑے جرم کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ یہ کہ راہِ حق کے ہادیوں یعنی انبیاء کو بلا جواز قتل کیا (وقتلھم الانبیاء بغیر حق)۔

وہ خلافِ حق اعمال میں اس قدر جسارت مند اور بے باک تھے کہ انبیاء کی گفتگو کا مذاق اڑاتے تھے اور انھیں صراحت سے

---

[1] "فبما نقضھم" قواعدِ ادب کے اعتبار سے جار مجرور ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا کوئی عامل ہو ممکن ہے اس کا عامل "لعناھم" (ہم نے ان پر لعنت کی) محذوف و مقدور ہے یا "حرمنا علیھم......" (ہم نے ان پر حرام کر دیا) ہو جو آیہ ۱۶۰ میں ہے اس بنا پر جو کچھ درمیانی کلام میں آیا ہے وہ جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے جو ایسے مواقع پر کلام کی خوبی اور زیبائی کا باعث ہوتا ہے۔



کہتے تھے: ہمارے دلوں پر تو پردہ ڈال دیا گیا ہے جو تمھاری دعوت کو سننے اور اسے قبول کرنے میں حائل ہے (وقولھم قلوبنا غلف)۔ یہاں قرآن مجید مزید کہتا ہے: جی ہاں! ان کے دلوں پر واقعی مُہر لگادی گئی ہے، اب کوئی حق بات ان میں جا گزیں نہیں ہوسکتی لیکن اس کا عامل ان کا اپنا کفر اور بے ایمانی ہے اس لیے تھوڑے سے افراد جو ایسی ہٹ دھرمیوں میں نہیں پڑتے وہی ایمان لائیں گے باقی نہیں (بل طبع الله علیھا بکفرھم فلا یؤمنون الا قلیلا)۔

ان کی قانون شکنیاں صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں وہ کفر کی راہ میں اتنے تیز دوڑتے ہیں کہ انھوں نے مریم جیسی پاک دامن خاتون اور خدا کے ایک عظیم پیغمبر کی والدہ جو حکم خدا سے بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی تھی، پر بہت بڑی تہمت لگائی (وبکفرھم وقولھم علی مریم بھتانا عظیما)۔ یہاں تک وہ قتل انبیاء پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم نے عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا (وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول الله) شاید مسیح کو رسول اللہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے۔ وہ قتل عیسیٰ کے بارے میں اپنے دعوے میں جھوٹے تھے انھوں نے ہرگز مسیح کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر لٹکایا۔ بلکہ ایک اور شخص کو جو اُن سے شباہت رکھتا تھا اشتباہ میں سُولی پر لٹکا دیا (وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم)۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: مسیح کے بارے میں اختلاف کرنے والے خود شک میں تھے اور اپنی کہی ہوئی بات پر ایمان نہیں رکھتے تھے وہ صرف تخمینا اور اندازے کی پیروی کرتے تھے (وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالھم بہ من علم الا اتباع الظن)۔ اس بارے میں کہ انھوں نے کس بات میں اختلاف کیا مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے اختلاف حضرت مسیح کی اصل حیثیت اور مقام کے بارے میں کیا تھا ایک گروہ جناب مسیح کو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور بعض یہودیوں کی طرح انھیں پیغمبر ہی نہیں سمجھتے تھے اور یہ سب کے سب اشتباہ میں تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے قتل کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہو بعض کہتے ہیں کہ وہ قتل ہوگئے ہیں اور بعض کہتے کہ وہ قتل نہیں ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی اپنی بات پر مطمئن نہیں تھا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے مدعی انھیں نہ پہچاننے کی وجہ سے شک میں ہوں اور وہ یہ ہے کہ جسے انھوں نے قتل کیا تھا وہ مسیح ہی تھے یا ان کی جگہ کوئی اور شخص تھا۔

اس پر قرآن تاکیداً کہتا ہے انھوں نے قطعًا اسے قتل نہیں کیا بلکہ خدا اسے اپنی طرف اٹھالے گیا اور خدا قادر و حکیم ہے (وما قتلوہ یقینا بل رفعہ الله الیہ وکان الله عزیزا حکیما)۔

مسیحؑ قتل نہیں ہوئے

زیرِ نظر آیت میں قرآن کہتا ہے: مسیح قتل نہیں ہوئے اور نہ سولی پر چڑھے بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہوگیا اور انھوں نے خیال کیا کہ انھیں سولی پر لٹکا دیا ہے حالانکہ یقیناً انھوں نے انھیں قتل نہیں کیا۔

موجودہ چاروں اناجیل (متی، لوقا، مرقس اور یوحنا) میں حضرت مسیح کو سولی پر لٹکائے جانے اور ان کے قتل کا ذکر ہے۔



یہ بات چاروں انجیلوں کے آخری حصّوں میں تشریح وتفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ آج کے عام مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو قتل مسیحؑ اور انھیں مصلوب کیا جانا موجودہ مسیحیت کے اہم ترین بنیادی مسائل میں سے سب کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو ایسا پیغمبر نہیں مانتے جو مخلوق کی ہدایت، تربیت اور ارشاد کے لیے آیا ہو بلکہ وہ انھیں خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں جس کا اس دنیا میں آنے کا اصلی ہدف ہی خدا ہونا ہے اور اپنی قربانی کے عوض نوعِ بشر کے گناہوں کا سودا کرنا ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اس لیے آئے تاکہ ہمارے گناہوں کا فدیہ بن جائیں وہ سولی چڑھے اور قتل ہوئے تاکہ نوعِ بشر کے گناہوں کو دھو ڈالیں اور عالمین کو سزا سے نجات دلائیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ راہِ نجات مسیحؑ سے رشتہ جوڑنے اور ان کے مصلوب ہونے کا عقیدہ رکھنے میں منحصر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مسیحیت کو "مذہبِ نجات" یا "مذہب خدا" کہتے ہیں اور مسیح کو "ناجی" یا "فادی" کہتے ہیں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی صلیب کا نشان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں، اور صلیب ان کا شعار ہے اسی کی وجہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔

یہ تھا حضرت مسیحؑ کی سرنوشت کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدے کا خلاصہ۔ لیکن کوئی مسلمان بھی اس میں شک نہیں رکھتا کہ یہ عقیدہ باطل ہے اس کی وجوہات یہ ہیں:

۱۔ حضرت مسیحؑ دیگر انبیاء کی طرح ایک پیغمبر تھے نہ وہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے۔ خدا یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شبیہ و نظیر مثل و مانند اور بیوی بیٹا نہیں ہے۔

۲۔ گناہوں کا فدیہ بننا بالکل غیر منطقی بات ہے ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور ذمّہ دار ہے اور راہ نجات خود انسان کا اپنا ایمان اور عمل صالح ہے۔

۳۔ گناہ گار کے فدیہ کا عقیدہ فساد، تباہی اور آلودگی کی ترغیب و تشویق کرتا ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن خصوصیت سے مسیحؑ کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے حالانکہ ظاہراً ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فدیے اور امت کے گناہ خریدنے کے بے ہودہ اور فضول عقیدے کی سختی سے سرکوبی کی جائے اور عیسائیوں کو اس خرافاتی عقیدے سے نکالا جائے تاکہ وہ نجات کے لیے اپنے اعمال کو درست کریں نہ کہ عقیدۂ صلیب کا سہارا لیں۔

۴۔ بہت سے قرائن ایسے موجود ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیئے جانے کے عقیدے کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً:

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ چاروں انجیلیں جو حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتی ہیں سب کی سب حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے لکھی گئی ہیں اور اس بات کا مسیحی مورخ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب مسیحؑ کے شاگرد دشمنوں کے حملے کے وقت بھاگ گئے تھے اور اناجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں[1]۔ لہٰذا انھوں نے مسیحؑ کے مصلوب ہونے کے بارے میں عوام میں گردش کرتی ہوئی افواہ یا شہرت سنی اور وہیں سے

---

[1] "اُس وقت تمام شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے" (انجیل متی باب ۲۶ جملہ ۵۶)



یہ بات حاصل کی اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا کہ حالات ایسے پیش آئے کہ مسیح کی جگہ دوسرا شخص اشتباہ میں پکڑ لیا گیا۔

ب۔ دوسرا عامل جو یہ امکان ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسٰی کی بجائے اشتباہ میں دوسرا شخص پکڑا گیا ہو یہ ہے کہ شہر کے باہر جستیمانی باغ میں جو لوگ جناب عیسٰی کو گرفتار کرنے کے لیے گئے وہ رومی لشکر کا ایک دستہ تھا یہ لوگ چھاؤنی میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مشغول تھے یہ لوگ نہ یہودیوں کو پہچانتے تھے نہ وہاں کی زبان اور نہ آداب و رسوم جانتے تھے اور نہ ہی یہ لوگ حضرت عیسٰی کو ان کے شاگردوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

ج۔ اناجیل کے مطابق حملہ رات کے وقت حضرت عیسٰی کی رہائش گاہ پر ہوا اس صورت میں تو اور بھی آسان ہے کہ تاریکی میں اصل انسان نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کی بجائے گرفتار ہو جائے۔

د۔ تمام انجیلوں کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتار شدہ شخص نے رومی حاکم پیلاطس کے سامنے خاموشی اختیار کی اور اس کی گفتگو کے جواب میں اپنے دفاع کے لیے بہت کم ہی کچھ کہا۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عیسٰی اپنے آپ کو خطرے میں دیکھیں اور اپنے بیانِ رسا، قوت گویائی اور شجاعت و شہامت کے باوجود اپنا دفاع نہ کریں۔

تو کیا اس سے یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی جگہ پکڑا گیا ہو اور دہشت و اضطراب کا ایسا شکار ہوا ہو کہ اپنے دفاع میں کچھ کہہ بھی نہ سکا ہو۔ قوی احتمال یہ ہے کہ وہ اسخریوطی نامی یہودی تھا جس نے حضرت مسیح سے خیانت کی اور ان کے خلاف جاسوس کا کردار ادا کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ جناب عیسٰی سے بہت شباہت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ موجودہ اناجیل میں ہے کہ اسخریوطی یہودی اس واقعے کے بعد دیکھا نہیں گیا اور اناجیل ہی کے مطابق اس نے خودکشی کر لی تھی[1]

ہ۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیح کے شاگرد اناجیل کی شہادت کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے، ظاہر ہے کہ دوسرے دوست احباب بھی اس دن چھپ گئے ہوں گے اور دور سے حالات پر نظر رکھے ہوں گے۔ لہٰذا گرفتار شدہ شخص رومی فوجیوں کے محاصرے میں تھا اور اس کے دوستوں میں سے کوئی اس کے گرد موجود نہیں تھا۔ اس لیے کون سے تعجب کی بات ہے کہ اشتباہ ہو گیا ہو۔

س۔ اناجیل میں ہے کہ جس شخص کو تختہ دار پر لٹکانے کا حکم دیا گیا اس نے تختہ دار پر خدا سے شکایت کی۔

تو نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ دیا اور کیوں مجھے قتل ہونے کے لیے دشمن کے ہاتھ میں دے دیا[2]

لہٰذا اگر حضرت مسیح دنیا میں اس لیے آئے تھے کہ وہ سولی پر لٹکائے جائیں اور نوعِ انسانی کے گناہوں کا فدیہ ہو جائیں تو پھر ایسی ناروا باتیں انھیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔ یہ جملہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص نہایت کمزور، ڈرپوک اور عاجز و ناتواں تھا اسی لیے ایسی باتیں کر رہا تھا ورنہ مسیح ہوتے تو ایسی باتیں ہرگز نہ کرتے[3]

---

[1] انجیل متی باب ۲۷، جملہ ۶
[2] "..... عیسٰی نے بلند آواز سے پکار کر کہا ..... ایلی ! ایلی ! لما سبقتنی یعنی ..... الٰہی ! الٰہی ! تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا (متی باب ۲۷، جملہ ۴۶ - ۴۷)
[3] مندرجہ بالا چند قرائن کے لیے کتاب "قربان صلیب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔



س۔ مسیحوں کے نزدیک قابلِ قبول چار انجیلوں کے علاوہ موجودہ بعض اناجیل مثلاً انجیل برنابا میں واضح طور پر حضرت عیسٰیؑ کے مصلوب ہونے کی نفی کی گئی ہے[1]۔ یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ عیسٰی نام کے دو شخص تھے ایک عیسٰی کو سولی دی گئی تھی اور دوسرے کو نہیں دی گئی تھی اور دونوں میں پانچ سو سال کا فاصلہ تھا[2]۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ قرائن مجموعی طور پر حضرت مسیحؑ کے قتل اور صلیب دیئے جانے کے بارے میں قرآن کے دعوٰیٔ اشتباہ کو واضح کرتے ہیں۔

۱۵۹۔ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ

ترجمہ

۱۵۹۔ کوئی اہلِ کتاب ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قابلِ ملاحظہ ہے:۔

۱۔ آیت کہتی ہے: کوئی اہلِ کتاب نہیں مگر یہ کہ وہ مسیح پر "اپنی موت" سے پہلے ایمان لے آئے گا (وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به قبل موته)۔

اور یہ وقت وہ ہوگا جب انسان موت کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا رابطہ اس جہان سے کمزور پڑ جاتا ہے اور بعد والے جہان سے قوی ہو جاتا ہے، پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جاتے ہیں، بہت سے حقائق اسے نظر آنے لگتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس موقع پر اس کی حقیقت میں آنکھیں مقامِ مسیحؑ کو دیکھتی ہیں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتی ہیں۔ جو اس کے منکر تھے اب مومن ہو جاتے ہیں اور جو اسے خدا سمجھتے تھے اب اپنے اشتباہ کو جان لیتے ہیں۔

یہ ایمان فرعون اور دیگر ایسے لوگوں کا سا ایمان ہے جو عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اپنی بربادی کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر اظہارِ ایمان کرتے ہیں ایسا ایمان انھیں کوئی فائدہ نہیں دیتا لہٰذا کس قدر اچھا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۳۴

[2] المیزان ج ۲ صفحہ ۳۴۵



ایسے حساس لمحے پر ایمان لائیں جبکہ ایمان انھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ابھی ایمان لے آئیں اور مومن بن جائیں جب ایمان ان کے لیے فائدہ مند بھی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق " قبل موتہ " کی ضمیر اہلِ کتاب کے بارے میں ہے۔

۲۔ دوسری تفسیر کے مطابق تمام اہلِ کتاب حضرت مسیحؑ پر " ان کی موت " سے پہلے ایمان لے آئیں گے، یہودی ان کی نبوت قبول کرلیں گے اور عیسائی ان کی الوہیت کے عقیدے سے دست کش ہوجائیں گے یہ اس وقت ہوگا جب اسلامی روایات کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے موقع پر حضرت عیسٰیؑ آسمان سے اتریں گے اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے، یہود و نصاریٰ بھی انھیں دیکھیں گے اور ان پر اور حضرت مہدی علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے۔

واضح رہے کہ حضرت مسیحؑ کا دین گذشتہ زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور اب ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دینِ اسلام کی پیروی کریں جس کے جاری اور نافذ کرنے والے حضرت مہدی علیہ السلام ہوں گے۔

اس تفسیر کے مطابق "قبل موتہ" کی ضمیر کا تعلق حضرت مسیحؑ سے ہے نہ کہ اہلِ کتاب سے۔ بہت سی اسلامی کتب میں یہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

کیف انتم اذا نزل فیکم ابن مریم و امامکم منکم۔

اس وقت تمھارا کیا حال ہوگا جب فرزندِ مریم تم میں نازل ہوگا اور تمھارا امام و پیشوا خود تم میں سے ہوگا۔ [1]

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں شہر بن حوشب سے منقول ہے:

ایک دن حجاج نے کہا: قرآن میں ایک آیت ہے جس نے مجھے تھکا دیا ہے اور میں اس کے معنی میں ڈوبا رہتا ہوں۔

شہر نے کہا: کون سی آیت ہے، اے امیر!؟

حجاج نے کہا: و ان من اھل الکتاب .... کیونکہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کو قتل کرتا ہوں لیکن ایسے ایمان کی کوئی نشانی ان میں نہیں دیکھتا۔

شہر نے کہا: "تم آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں کرتے ہو"

حجاج بولا: کیسے؟ آیت کی صحیح تفسیر کیا ہے؟

شہر نے جواب دیا: مراد یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ اس دنیا کے ختم ہونے سے پہلے اتریں گے اور کوئی یہودی یا غیر یہودی ایسا باقی نہیں رہے گا جو حضرت عیسٰیؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے۔ عیسٰیؑ، حضرت مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

---

[1] تفسیر المیزان کے مطابق یہ حدیث مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن بیہقی میں موجود ہے۔



حجاج نے یہ بات سنی تو کہنے لگا: "وائے ہو تم پر، یہ تفسیر کہاں سے لائے ہو؟"
شہر نے کہا: محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام سے میں نے یہ تفسیر سُنی ہے۔
حجاج کہنے لگا:- واللہ جئت بہا من عین صافیہ (یعنی ـــــ بخدا صاف وشفاف سرچشمہ سے لایا ہے)[1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: قیامت کے دن حضرت مسیح ان پر گواہ ہوں گے (و یوم القیٰمۃ یکون علیہم شہیداً)۔ حضرت مسیح کی ان کے خلاف گواہی سے مراد یہ ہے کہ وہ گواہی دیں گے کہ میں نے تبلیغ رسالت کی اور انھیں کبھی اپنی الوہیت کی دعوت نہیں دی بلکہ پروردگار کی ربوبیت کی دعوت دی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت، ۱۱۷ کے مطابق حضرت مسیح قیامت کے دن اپنی گواہی اپنی اس زندگی کے دوران کے بارے میں دیں گے جب وہ اپنی اُمّت میں موجود تھے لیکن اس کے بعد کی ذمہ داری قبول نہیں کریں گے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:-

وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم وانت علی کل شیء شہید۔

یعنی ـــــ (حضرت عیسیٰ کہیں گے) جب تک میں ان کے درمیان تھا تو ان پر شاہد اور ناظر تھا لیکن جب تو نے ان میں سے مجھے اٹھالیا تو تُو ان پر نگران ہے اور تو ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے۔

لیکن زیر بحث آیت میں ہے کہ حضرت مسیح قیامت کے دن ان سب کے بارے میں گواہی دیں گے چاہے وہ ان کے زمانے میں تھے یا نہیں تھے۔

دونوں آیات پر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت حضرت مسیح کی طرف سے تبلیغ رسالت اور الوہیت کی نفی کے بارے میں گواہی سے متعلق ہے جبکہ سورۂ مائدہ کی آیت، ۱۱۷ اُن کے عمل کے بارے میں گواہی سے مربوط ہے۔
اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰ ان تمام لوگوں کے خلاف گواہی دیں گے جنھوں نے ان کی الوہیت کا عقیدہ رکھا، چاہے وہ آپ کے زمانے میں تھے یا اس کے بعد اور کہیں گے کہ میں نے انھیں ہرگز ایسی کسی چیز کی دعوت نہیں دی تھی۔ لیکن سورہ مائدہ کی آیت، ۱۱۷ کہتی ہے کہ وہ کہیں گے کہ میں نے انھیں صحیح اور کافی و وافی تبلیغ رسالت

---

[1] تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۴۲۶



کی ہے جب تک میں ان کے درمیان موجود تھا تو عملاً ان کے انحراف کو روکتا رہا لیکن میرے بعد یہ ہوا کہ وہ میری الوہیت کے قائل ہوگئے اور انھوں نے انحراف کا راستہ اختیار کیا ان دنوں میں ان کے درمیان نہ تھا کہ ان کے اعمال کا گواہ ہوں اور یہ کہ انھیں اس سے روکتا۔

۱۶۰۔ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ

۱۶۱۔ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

۱۶۲۔ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۧ

ترجمہ

۱۶۰۔ اس ظلم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا نیز راہ خدا سے بہت زیادہ روکنے کی بنا پر کچھ پاکیزہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں ہم نے حرام قرار دے دیں۔

۱۶۱۔ اور (اسی طرح) ان کی سود خوری (بھی)، جبکہ انھیں اس سے منع کر دیا گیا تھا اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی وجہ سے اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۱۶۲۔ لیکن ان میں وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں اور وہ جو ایمان لائے ہیں، ان تمام چیزوں پر جو تم پر نازل ہوئی ہیں اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان لا چکے ہیں اور وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں ہم جلد ہی ان سب کو اجر عظیم دیں گے۔

تفسیر

یہودیوں میں سے صالح اور غیر صالح افراد کا انجام

گذشتہ آیات میں یہودیوں کی قانون شکنی کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں ان کے کچھ اور ناشائستہ اعمال کا ذکر کرنے کے بعد ان سزاؤں کا تذکرہ ہے جو ان کے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں ان کے دامن گیر ہوئیں اور ہوں گی۔

پہلے ارشاد فرمایا: اس ظلم و ستم کی وجہ سے جو یہودیوں نے کیا اور لوگوں کو راہِ خدا سے باز رکھنے کی وجہ سے کچھ پاک و پاکیزہ چیزیں ہم نے ان پر حرام کر دیں اور انھیں ان سے استفادہ سے محروم کر دیا (فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرًا)۔

نیز اس بنا پر کہ وہ سُود کھاتے تھے حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور اسی طرح لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے ان کے یہی کام ان کی اس محرومیت کا سبب بنے (واخذھم الربٰوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل)۔

اس دنیاوی سزا کے علاوہ ہم انھیں اخروی سزاؤں میں مبتلا کریں گے اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے (واعتدنا للکافرین منھم عذابًا الیمًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **یہودیوں کے لیے طیّبات کی حرمت:** طیبات کی حرمت سے مراد وہی ہے جس کی طرف سورہ انعام آیۂ ۱۴۶ میں اشارہ ہوا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

> ہم نے یہودیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے ہر جانور جس کا سم پھٹا ہوا نہ ہو ان پر حرام قرار دے دیا۔ نیز گائے اور بھیڑ بکری کی چربی بھی کہ جس سے انھیں لگاؤ تھا ان پر حرام کر دی مگر اس کا وہ حصہ جو جانور کی پشت یا آنتوں کے اطراف میں ہو یا ہڈی کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

لہٰذا مذکورہ حُرمت تحریم تشریعی و قانونی تھی، تحریم تکوینی نہ تھی۔ یعنی یہ نعمتیں طبعی اور فطری طور پر تو ان کے پاس تھیں، لیکن شرعًا انھیں ان کے کھانے سے روک دیا گیا تھا۔

موجودہ تورات کے سفر لاویان کی گیارہویں فصل میں ان میں سے کچھ چیزوں کی حرمت کا ذکر موجود ہے لیکن یہ بات اس میں نہیں کہ یہ حُرمت سزا کے طور پر تھی[1]

---

[1] تفسیر نمونہ جلد سوم کی طرف رجوع کیجیے (دیکھیے صفحہ ۲۹ اردو ترجمہ)



۲۔ کیا یہ حُرمت عمومی تھی ؟ یہ حُرمت ظالم لوگوں کے لیے ہی تھی یا سب کے لیے ــــــــ اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت اور سُورہ انعام کی آیت ۱۴۶ کے ظاہری مفہوم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تحریم عمومی تھی کیونکہ آیت میں "لھم" کہا گیا ہے جبکہ اخروی سزا کے لیے " للکافرین منھم " آیا ہے، یعنی ان میں سے کافروں کے لیے، لہٰذا ظالموں کے لیے تو یہ حرمت سزا کے طور پر تھی جبکہ نیک لوگ جو کم تعداد میں تھے ان کے لیے آزمائش اور انضباط کے پہلو سے تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ تحریم فقط ستمگروں کے لیے تھی اور بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے تفسیر برہان میں سورۂ انعام کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں امام صادق علیہ السّلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

> بنی اسرائیل کے حکّام اور رؤسا فقیر اور نادار لوگوں کو پرندوں کے گوشت اور جانوروں کی چربی کھانے سے روکتے تھے۔ خدا نے ان کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے ان چیزوں کو خود ان پر حرام قرار دے دیا[1]

۳۔ سود کی حُرمت قبل از اسلام سے ہے : اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سود کی حُرمت اسلام ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ گذشتہ قوموں میں بھی حرام تھا اگرچہ موجودہ تحریف شدہ تورات میں اس کی حرمت برادران دینی میں حرام شمار کی گئی ہے[2]

یہودیوں میں سے اہل ایمان

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے جس کا قرآن نے بارہا اظہار کیا ہے اور وہ یہ کہ قرآن اگر یہودیوں کی مذمت کرتا ہے تو یہ نسلی اور گروہی جھگڑے کے حوالے سے نہیں ہے۔ اسلام کسی قوم و قبیلے کی مذمت قوم اور قبیلے کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اس مذمت کا ہدف صرف آلودۂ گناہ اور منحرف لوگ ہوتے ہیں اسی لیے اس آیت میں یہودیوں میں سے صاحبِ ایمان اور پاک دامن افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی تعریف کی گئی ہے اور انھیں اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے قرآن کہتا ہے : لیکن یہودیوں میں سے وہ لوگ جو علم و دانش میں راسخ ہیں، خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لے آئے ہیں ہم بہت جلد انھیں اجر عظیم سے نوازیں گے (لکن الراسخون فی العلم منھم و المؤمنون یؤمنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک و المقیمین الصلوٰۃ و المؤتون الزکوٰۃ و المؤمنون باللہ و الیوم الاٰخر اولٰئک سنؤتیھم اجرًا عظیمًا[3])۔

---

[1] تفسیر برہان ج ۱ ص ۵۵۹

[2] تورات، سفر تثنیہ فصل ۲۳ جملہ ۱۹، ۲۰۔ برادران دینی سے ظاہراً اولاد حضرت اسماعیلؑ مراد ہے (مترجم)

[3] "الراسخون فی العلم" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۲۵۵ (اردو ترجمہ) میں تفصیلی وضاحت کی جاچکی ہے۔



یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے بڑے لوگوں میں ایک جماعت اسلام کے ظہور اور اس کی حقانیت کو دیکھتے ہوئے دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی اور دل وجان سے اس کی حمایت کی۔ یہ لوگ پیغمبر اسلامؐ اور باقی مسلمانوں کے لیے قابل احترام قرار پائے۔

۱۶۳۔ اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ
وَاَوۡحَيۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَ
الۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ ۚ وَاٰتَيۡنَا
دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۝

۱۶۴۔ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ
عَلَيۡكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۝

۱۶۵۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ
الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۝

۱۶۶۔ لٰـكِنِ اللّٰهُ يَشۡهَدُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكَ اَنۡزَلَهٗ بِعِلۡمِهٖ ۚ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ يَشۡهَدُوۡنَ ؕ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ۝

ترجمہ

۱۶۳۔ ہم نے تم پر وحی کی جس طرح کہ نوح اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی کی تھی نیز ابراہیم، اسماعیل، اسحاق یعقوب (بنی اسرائیل میں سے) اسباط، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی کی اور (جیسے) داؤد کو ہم نے زبور دی۔

۱۶۴۔ اور وہ پیغمبر جن کی سرگذشت ہم تمہیں پہلے بیان کر چکے ہیں اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ہم نے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسٰی سے کلام کیا۔



۱۶۵ - وہ پیغمبر کہ جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے تاکہ لوگوں کے لیے ان پیغمبروں کے بعد خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے (اور سب پر اتمام حجت ہوجائے) اور خدا توانا و حکیم ہے۔

۱۶۶ - لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے وہ اس نے اپنے علم کی رُو سے نازل کیا ہے اور فرشتے (بھی) گواہی دیتے ہیں اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہودی انبیاء میں فرق کرتے تھے بعض کی تصدیق کرتے تھے اور بعض کی تردید کرتے تھے۔ زیر نظر آیات میں دوبارہ انھیں جواب دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے، ہم نے تجھ پر وحی نازل کی جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد والے انبیاء پر وحی بھیجی تھی اور جیسے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، وہ پیغمبر جو اولادِ یعقوب میں سے تھے عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی نازل کی تھی اور داؤدؑ کو زبور دی تھی (انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وعیسٰی وایوب و یونس وھٰرون وسلیمٰن و اٰتینا داؤد زبورا) لہٰذا ان بزرگ انبیاء میں کیوں تفریق کرتے ہو جب کہ سب کے سب ایک ہی راستے کے مسافر ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت کے مخاطب عرب کے مشرکین اور بت پرست ہوں جو پیغمبر اسلامؐ پر نزولِ وحی پر تعجب کرتے تھے، آیت کہتی ہے کہ اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، کیا پہلے پیغمبروں پر وحی نازل نہیں ہوئی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ انبیاء جن پر وحی نازل ہوئی وہ یہی نہیں تھے بلکہ دوسرے پیغمبر کہ جن کا ذکر تم سے پہلے کیا جا چکا ہے اور وہ پیغمبر کہ جن کا قصہ ابھی تک بیان نہیں ہوا۔ سب کی یہی ماموریت تھی اور ان پر بھی وحی نازل ہوتی رہی (ورسلا قد قصصناھم علیک من قبل و رسلا لم نقصصھم علیک) اور اس سے بالاتر یہ کہ خدا نے موسیٰ سے کلام کیا (وکلم اللہ موسٰی تکلیما)۔

لہٰذا رشتہ وحی تو ہمیشہ سے نوعِ بشر میں تھا اور کیسے ممکن ہے کہ ہم نوعِ انسانی کو بغیر راہبر و راہنما کے چھوڑ دیں، اور پھر ان کے لیے جوابدہی اور ذمہ داری کے بھی قائل ہوں؟ لہٰذا ہم نے "ان پیغمبروں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا قرار دیا تاکہ خدا کی رحمت اور ثواب کا لوگوں کو امیدوار بنائیں اور اس کی سزاؤں سے ڈرائیں تاکہ اس طرح ان پر اتمام حجت ہوجائے اور ان کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے" (رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل)۔

خدا نے ان رہبروں کو بھیجنے کا پروگرام نہایت باریک بینی سے منظم اور جاری کیا ہے ایسا کیوں نہ ہو جبکہ "وہ تمام چیزوں پر توانائی رکھتا ہے اور حکیم (بھی) ہے" (وکان اللہ عزیزا حکیما) اس کی حکمت سبب بنتی ہے



کہ یہ کام عملی صورت اختیار کرے اور اس کی قدرت راہ ہموار کرتی ہے کیونکہ ایک صحیح پروگرام اگر انجام پذیر نہ ہو تو اس کی وجہ یا عدم حکمت ہو گی یا عدم قدرت ـــــــ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نقص خدا کی ذات پاک میں نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی اور تسلّی کے لیے کہتا ہے: اگر یہ لوگ تیری نبوّت و رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ خدا نے جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کا گواہ ہے (لکن اللہ یشھد بما انزل الیک) البتہ اس مقصد کے لیے تمھارا انتخاب بلاوجہ نہیں تھا بلکہ تمھاری اصلیت کو جانتے ہوئے اس نے یہ آیات تم پر نازل کی ہیں (انزلہ بعلمہ)۔

ممکن ہے یہ جملہ ایک اور مفہوم کا بھی حامل ہو اور وہ یہ کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس کا سرچشمہ علم الٰہی کا دریائے بے کنار ہے اور اس کے مضامین شاہد ہیں کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اس لیے تمھارے دعویٰ کی صداقت کی گواہی خود متن آیات میں ثبت ہے اور کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا وہ علم الٰہی کے بغیر ایک ایسی کتاب لے کر آئے جو اعلیٰ ترین تعلیمات، فلسفوں، قوانین، اخلاقی احکام اور اجتماعی پروگرام پر مشتمل ہو۔

آخر میں مزید فرماتا ہے: نہ صرف خدا تمھاری حقانیت کی گواہی دیتا ہے بلکہ فرشتگان الٰہی بھی گواہی دیتے ہیں، اگرچہ خدا کی گواہی کافی ہے (والملٰئکۃ یشھدون وکفیٰ باللہ شھیدًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **اسلام تمام ادیان کی خوبیوں کا امتزاج ہے:** بعض مفسرین "انا اوحینا الیک کما اوحینا..." ....الخ" کے جملے سے یہ استفادہ کرتے ہیں کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر سے یہ نکتہ کہے کہ تمھارے دین میں تمام خصوصیات اور امتیازات جمع ہیں جو گذشتہ ادیان میں تھے ـــــــ گویا

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یعنی ـــــــ جو خوبیاں ان سب میں الگ الگ ہیں وہ تجھ اکیلے میں جمع ہیں

بعض روایات اہلِ بیتؑ میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مفسرین نے بھی دراصل انھی روایات سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے [1]

۲۔ **آسمانی کتب کی اقسام:** مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ زبور آسمانی کتب میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو دی تھی۔ یہ بات اس امر کے منافی نہیں جو مسلّم اور مشہور ہے کہ نئی شریعت کے حامل اور صاحب کتاب اولوالعزم پیغمبر پانچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ آیات قرآنی اور روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبرانِ الٰہی پر نازل ہونے والی

---

[1] تفسیر صافی ص ۱۳۹، تفسیر برہان ج ۱ ص ۴۲۰ اور تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۵۰۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔



آسمانی کتب دو طرح کی ہیں۔

پہلی قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں احکام تشریعی تھے اور جو نئی شریعت کا اعلان کرتی تھیں اور وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں جو کہ پانچ اولوالعزم پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔

دوسری قسم۔ ان کتب کی ہے جن میں کوئی نئے احکام نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں پند و نصائح، رہنمائی، وصیتیں اور دعائیں ہوتی تھیں۔ زبور بھی اسی طرح کی کتاب ہے۔ "مزامیر داؤد" یا "زبور داؤد" جو کہ عہد قدیم کی کتب میں شمار ہوتی ہے اس حقیقت پر شاہد ہے اگرچہ یہ کتاب بھی عہد قدیم و جدید کی دیگر کتب کی طرح تحریف و تغییر سے محفوظ نہیں رہی لیکن پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی حد تک وہ اپنی شکل و صورت میں باقی ہے یہ کتاب ایک سو پچاس فصلوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک کو مزمور کہتے ہیں اس کی تمام فصلیں پند و نصائح اور دعا و مناجات پر مشتمل ہیں۔

حضرت ابوذر سے ایک روایت میں منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ انبیاء کی تعداد کتنی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ایک لاکھ چوبیس ہزار۔

میں نے عرض کیا: ان میں سے رسول کتنے تھے؟

آپؐ نے فرمایا: تین سو تیرہ، اور باقی صرف نبی تھے۔

ابوذر کہتے ہیں میں نے پوچھا: آسمانی کتابیں جو ان پر نازل ہوئیں وہ کتنی تھیں؟

آپؐ نے فرمایا: وہ ایک سو چار کتابیں ہیں، جن میں سے دس کتابیں آدم پر، پچاس کتابیں شیث پر، تیس کتابیں ادریس پر اور دس کتابیں ابراہیم پر (جو کل سو ہوئیں) اور تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید۔[1]

۳۔ **اسباط سے کیا مراد ہے:** اسباط جمع ہے سبط (بروزن سَبَد) کی جس کا مطلب ہے، بنی اسرائیل کے قبائل، لیکن یہاں مقصود وہ پیغمبر ہیں جو ان قبائل میں مبعوث ہوئے تھے۔[2]

۴۔ **انبیاء پر نزول وحی کی کیفیت:** انبیاء پر نزول وحی کی کیفیت مختلف تھی کبھی نزول وحی کے فرشتے کے ذریعے وحی آتی، کبھی دل میں الہام کے ذریعے سے اور کبھی آواز سنائی دیتی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ فضا میں یا اجسام میں صوتی لہریں پیدا کر دیتا اور اس طرح سے اپنے پیغمبر سے گفتگو کرتا، ان میں سے کہ جنہیں واضح طور پر یہ امتیاز حاصل ہوا ایک حضرت موسیٰ بن عمران تھے جو کبھی شجرہ وادیِ ایمن سے صوتی لہریں سنتے اور کبھی کوہ طور سے انھیں آواز سنائی دیتی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں حضرت موسیٰؑ کا جداگانہ تذکرہ شاید ان کے اسی امتیاز کی وجہ سے ہو۔

❖ ❖ ❖

---

[1] مجمع البیان ج ۱۰ صفحہ ۴۷۶

[2] "اسباط" کے بارے میں تفصیلی وضاحت، تفسیر نمونہ جلد اوّل میں کی جاچکی ہے (دیکھیے اردو ترجمہ ص ۳۴۴)



۱۶۷۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًۢا
بَعِیۡدًا ۝

۱۶۸۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ ظَلَمُوۡا لَمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَ لَا لِیَہۡدِیَہُمۡ
طَرِیۡقًا ۝

۱۶۹۔ اِلَّا طَرِیۡقَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی
اللّٰہِ یَسِیۡرًا ۝

ترجمہ

۱۶۷۔ جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور انھوں نے (لوگوں کو) راہ خُدا سے روکا ہے وہ دُور دراز کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

۱۶۸۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور (اپنے اوپر اور دوسروں پر) ظلم کیا خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا اور انھیں کسی راستے کی ہدایت نہیں کرے گا۔

۱۶۹۔ مگر جہنم کے راستے کی کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بے ایمان افراد اور اہلِ ایمان کے بارے میں متعدد مباحث گزر چکے ہیں۔ ان آیات میں ایک اور گروہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بدترین قسم کا کفر انتخاب کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی گمراہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر بھی ظلم و ستم روا سمجھتے ہیں اور دوسروں پر بھی کیونکہ نہ وہ خود راہِ ہدایت پر چلتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی راہِ ہدایت پر نہ چلیں۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور لوگوں کے راہِ خدا میں قدم اٹھانے میں حائل ہوتے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی کا شکار ہیں (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ قد ضلوا ضلٰلا بعیدًا)۔

یہ لوگ جادۂ حق سے اس لیے دُور ترین ہیں، کیونکہ یہ ضلالت و گمراہی کے مبلغ ہیں اور بہت بعید نظر آتا ہے کہ ایسے لوگ اس راہ سے دست بردار ہو جائیں کہ جس کی طرف وہ خود دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کفر کے ساتھ ہٹ دھرمی اور عناد کو بھی ملا لیا ہے اور بے راہ روی کی طرف قدم اٹھایا ہے کہ جو راہِ حق سے بہت دُور ہے۔



اگلی آیت میں مزید کہتا ہے: جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ظلم کیا ہے (انھوں نے حق پر بھی ظلم کیا ہے کہ جو چیز اس کے شایانِ شان تھی اسے انجام نہیں دیا اور اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے کہ خود کو سعادت سے محروم کر دیا ہے اور وہ گمراہی میں جا پڑے ہیں، نیز دوسروں پر بھی ظلم کیا ہے کہ انھیں راہِ حق سے روکا ہے) ایسے افراد کو پروردگار کی مغفرت میسّر نہیں آئے گی اور خدا انھیں راہِ جہنم کے علاوہ کسی اور راستے کی راہنمائی نہیں کرے گا (ان الذین کفروا وظلموا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم طریقاً الا طریق جھنم) اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے (خالدین فیھا ابداً) انھیں جاننا چاہیے کہ خدائی تہدید اور دھمکی عمل پذیر ہو کے رہے گی کیونکہ خدا کے لیے یہ کام آسان ہے اور وہ اس پر قدرت رکھتا ہے (وکان ذٰلک علی اللہ یسیراً)۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات ایسے کفار اور ان کی سزا کے بارے میں خاص تاکید کرتی ہیں ایک طرف ان کی گمراہی کو ضلال بعید کہا گیا ہے اور دوسری طرف " لم یکن اللہ " سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں بخش دینا مقامِ خداوندی کے لائق نہیں ہے اور تیسری طرف "خلود" اور "ابداً" سے اس پر مزید تاکید کی گئی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ خود گمراہ ہونے کے علاوہ دوسروں کو گمراہ کرنے میں کوشاں رہتے تھے اور اس پر ان کی جوابدہی بہت عظیم ہو گئی تھی۔

۱۷۰۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

ترجمہ

۱۷۰۔ اے لوگو! (جس) پیغمبر (کے انتظار میں تم تھے وہ) پروردگار کی طرف سے حق کے (پروگرام کے ساتھ) تمھارے پاس آگیا ہے اس پر ایمان لے آؤ کہ اس میں تمھارا فائدہ ہے اور اگر کافر ہو جاؤ (تو خدا کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خدا کے لیے ہے اور اللہ دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں غیر مومن افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور اس کے نتیجے کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف تعبیرات جو انسان میں اشتیاق پیدا کریں ان میں سب موجود ہیں تمام لوگوں کو اس بلند مقصد کی ترغیب دی گئی ہے۔



پہلے فرمایا گیا ہے: اے لوگو! وہی پیغمبر کہ جس کے تم منتظر تھے اور جس کے بارے میں گذشتہ آسمانی کتب میں نشاندہی کی جاچکی ہے وہ دین حق لے کر تمہاری طرف آچکا ہے (یا یہا الناس قد جاءکم الرسول بالحق)۔[1]

اس کے بعد فرمایا: یہ پیغمبر اس ذات کی طرف سے آیا ہے جس نے تمہاری پرورش و تربیت اپنے ذمّہ لے رکھی ہے (من ربکم) پھر مزید فرمایا: اگر ایمان لے آؤ تو تمہارے فائدے میں ہے اس سے تم کسی دوسرے کی خدمت نہیں کروگے بلکہ یہ خود تمہاری اپنی خدمت ہوگی (فاٰمنوا خیرًا لکم) اور آخر میں فرمایا: یہ خیال نہ کرو کہ اگر تم نے راہِ کفر اختیار کی تو اس سے خدا کو کوئی نقصان ہوگا، ایسا نہیں ہے کیونکہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں (و ان تکفروا فان للّٰہ ما فی السمٰوٰت و الارض) علاوہ ازیں چونکہ خدا عالم اور حکیم ہے اس نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں، اور جو پروگرام ترتیب دیئے ہیں سب میں حکمت اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں اور تمہارے فائدے میں ہیں (و کان اللّٰہ علیمًا حکیمًا) لہٰذا اگر اس نے انبیاء اور پروگرام بھیجے ہیں تو یہ اس لیے نہیں کہ اسے ضرورت تھی بلکہ اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے۔ اس لیے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کیا یہ مناسب ہے کہ تم راہِ ایمان کو چھوڑ کر راہِ کفر پر گامزن ہوجاؤ۔

۱۷۱۔ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ
اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ
اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ٘ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ۫ وَ لَا
تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ
اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ
وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ۠

ترجمہ

۱۷۱۔ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو (اور زیادہ روی) نہ کرو اور حق کے سوا خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ مسیح

---

[1] ظاہراً "الرسول" کی الف لام عہد کی اور اس پیغمبر کی طرف اشارہ ہے جس کے وہ انتظار میں تھے نہ صرف یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین بھی کیونکہ وہ اہلِ کتاب سے اس ضمن میں کچھ مطالب سن چکے تھے اور وہ بھی منتظر تھے۔

[2] طرق اہلِ بیتؑ سے منقول بعض روایات میں حق کی تفسیر "ولایت حضرت علیؑ" سے کی گئی ہے اور جیسا کہ بارہا کہا جاچکا ہے ایسی تفسیر میں واضح مصداق کو بیان کیا جاتا ہے ورنہ آیت اس معنی میں منحصر نہیں ہوتی۔



عیسٰی بن مریم صرف خدا کے فرستادہ اور اس کا کلمہ (اور مخلوق) ہیں کہ جنھیں اس نے مریم کی طرف القا کیا اور وہ اس کی طرف سے (شائستہ) روح تھے۔ اس لیے خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور نہ یہ کہو کہ (خدا) تین ہیں۔ اس بات سے رُک جاؤ کہ یہ (بات) تمھارے فائدے میں نہیں ہے۔ خدا تنہا معبود یگانہ ہے۔ وہ منزہ ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو (بلکہ) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اس کا ہے اور ان کی تدبیر و سرپرستی کے لیے خدا کافی ہے۔

تفسیر

خیالی تثلیث

اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں کفار اور اہلِ کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ۔ مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انھیں اس عظیم انحراف کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلے انھیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو (یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی الله الا الحق)۔

آسمانی ادیان سے انحراف میں ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ لوگوں نے پیشواؤں اور راہنماؤں کے بارے میں غلو سے کام لیا۔ انسان چونکہ اپنے آپ سے لگاؤ رکھتا ہے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ اپنے رہبروں کو بھی ان کے اصل مقام سے بلند تر بنا کر پیش کرے تاکہ اس طرح اس کی اپنی عظمت میں اضافہ ہو۔ بعض اوقات لوگ اس ہولناک بھول میں اس لیے پھنس جاتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ پیشواؤں کے بارے میں غلو ان سے عشق اور لگاؤ کی نشانی ہے۔ غلو کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ مذہب کی اصلی بنیاد یعنی خدا پرستی اور توحید کو خراب کر دیتا ہے اسی لیے غالیوں کے بارے میں اسلام کا رویہ نہایت شدید اور سخت ہے اور عقائد و فقہ کی کُتب میں غالیوں کو کفار کی بدترین قسم قرار دیا گیا ہے۔

تثلیث اور الوہیتِ مسیحؑ کا ابطال

اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں:۔

۱۔ عیسٰیؑ مریم کے بیٹے ہیں: قرآنِ حکیم میں عیسٰی کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے (انما المسیح عیسی ابن مریم) یعنی عیسٰی صرف مریم کے بیٹے ہیں یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح بھی دیگر انسانوں کی طرح رحمِ مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گذرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، دودھ پیا اور آغوشِ مادر میں پرورش پائی



یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا متمول و محکوم ہو وہ خدائے ازلی و ابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ "انما" جو زیر بحث آیت میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسیٰ کا باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف مریم کا بیٹا ہے۔

۲۔ عیسیٰ خدا کے رسول ہیں: عیسیٰ خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں (رسول اللہ) عیسیٰ کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں، سب کی سب انسانی ہدایت کے لیے ان کی نبوت و رسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

۳۔ عیسیٰ خدا کا کلمہ ہیں: عیسیٰ خدا کا کلمہ ہیں جو مریمؑ کی طرف القا ہوا (و کلمته القاها الی مریم) قرآن کی چند آیات میں عیسیٰ کو کلمہ کہا گیا ہے یہ تعبیر مسیح کے مخلوق ہونے کی طرف اشارے کے لیے ہے جیسے ہمارے کلمات، ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں، اسی طرح عالم آفرینش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندرونی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات و صفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقاتِ عالم بھی خدا کی صفاتِ جمال و جلال کو واضح کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لیے لفظ "کلمة" استعمال کیا گیا ہے (مثلاً کہف ۱۰۹ اور لقمان ۲۹) البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں۔ حضرت عیسیٰ آفرینش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقامِ رسالت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے۔

۴۔ عیسیٰ روح ہیں: حضرت عیسیٰ روح ہیں جنھیں خدا نے پیدا کیا ہے (و روح منه) یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدمؑ کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ایک معنیٰ کے لحاظ سے تمام نوعِ انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیحؑ اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

بعض لوگوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں اس تعبیر سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عیسیٰ خدا کا جزو ہیں اور "منه" اس کیلئے دلیل ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر "من" تبعیض کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اصطلاح کے مطابق یہ "من" نشویه ہے۔ جو کسی چیز کی پیدائش کا سرچشمہ اور منشاء بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ تواریخ میں ہے کہ ہارون رشید کا ایک عیسائی طبیب تھا اس نے ایک روز علی بن حسین واقدی سے مناظرہ کیا، واقدی علماءِ اسلام میں سے تھا۔

طبیب نے کہا: تمھاری آسمانی کتاب میں ایک آیت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحؑ خدا کا جزو ہیں پھر اس نے زیر بحث آیت کی تلاوت کی۔



واقدی نے فوراً قرآن کی یہ آیت تلاوت کی:

و سخر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعاً منہ

یعنی ـــــــ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لیے مسخر کیا گیا ہے
اور یہ سب اس کی طرف سے ہے[1]۔

اور مزید کہا:

اگر "من" جزو بتانے کے لیے ہے تو پھر اس آیت کے مطابق آسمانوں و زمین کے تمام موجودات خدا کا جزو ہیں۔

یہ بات سن کر عیسائی طبیب فوراً مسلمان ہو گیا۔ ہارون رشید اس واقعے سے بہت خوش ہوا اور اس نے واقدی کو بہت انعام دیا[2]۔

علاوہ ازیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ عیسائی حضرات والد کے بغیر حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت آدمؑ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اس مخصوص خلقت کو کوئی بھی ان کی الوہیت کی دلیل نہیں سمجھتا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو تو اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے (فاٰمنوا باللہ و رسلہ ولا تقولوا ثلاثۃ انتھوا خیراً لکم)۔

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ خدا ہی معبود یکتا ہے (انما اللہ الٰہ واحد) یعنی تم اس بات کو مانتے ہو کہ تثلیث کے ہوتے ہوئے بھی خدا اکیلا اور یگانہ ہے۔ حالانکہ اگر اس کا بیٹا ہو تو وہ اس کا شبیہ ہوگا، تو پھر یکتائی کا کوئی معنی نہیں رہے گا۔ کیسے ممکن ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو جبکہ وہ بیوی اور بیٹے کی احتیاج کے نقص، جسم اور عوارض جسم کے نقص سے مبرا و منزہ ہے (سبحانہ ان یکون لہ ولد)۔

علاوہ ازیں وہ ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمان و زمین میں ہیں سب اس کی مخلوق ہیں اور وہ ان کا خالق ہے اور مسیح بھی ان کی مخلوق میں سے ایک ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ ان کے لیے ایک استثنائی حالت کا قائل ہوا جائے۔ کیا ممکن ہے کہ مملوک و مخلوق اپنے خالق و مالک کا بیٹا بن جائے (لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض) خدا صرف ان کا خالق و مالک ہے بلکہ ان کا مدبر، محافظ، رزاق اور سرپرست بھی ہے (وکفیٰ باللہ وکیلاً)۔

اصولی طور پر وہ خدا جو ازلی و ابدی ہے اور ازل تا ابد تمام مخلوقات کی سرپرستی اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے اسے بیٹے کی کیا

---

[1] جاثیہ ۱۳ (القرآن)

[2] تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۸۴



ضرورت ہے، کیا وہ ہماری طرح ہے کہ اپنی موت کے بعد جانشینی کے لیے بیٹے کی خواہش رکھتا ہو۔

تثلیث ــــــ عیسائیت کی سب سے بڑی کجروی

عیسائیت جن الخرافات اور کجرویوں کا شکار ہے ان میں سے تثلیث سے بدتر کوئی نہیں۔ وہ تصریح سے کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں اور یہ بھی کہ اس کے باوجود وہ ایک اور یکتا ہے یعنی وہ وحدت کو بھی حقیقی سمجھتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ اس بات نے عیسائیت کے محققین کے لیے ایک بہت بڑی مشکل پیدا کر دی ہے اگر خدا کی یکتائی کو مجازی اور تثلیث کو حقیقی سمجھتے تو بھی ایک بات تھی اور اگر توحید کو حقیقی مان لیتے اور تثلیث کو مجازی، پھر بھی معاملہ آسان تھا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں کو حقیقی اور واقعی سمجھتے ہیں۔

اس آخری دور میں عیسائیوں کی طرف سے بے خبر لوگوں کو بعض تبلیغی تصانیف دی گئی ہیں، جن میں انھوں نے تثلیث مجازی کا ذکر کیا ہے یہ اصل میں ریاکاری ہے جو مسیحیت کے اصلی منابع و کتب اور ان کے علماء کے حقیقی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسیحی ایک غیر معقول مطلب سے دوچار ہیں۔ کیونکہ ۱ = ۳ کو تو ایک ابجد پڑھنے والا بچہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو وہ عموماً کہتے رہتے ہیں کہ اس مسئلے کا تعلق میزانِ عقل سے نہیں بلکہ جذبۂ عبادت اور دل سے ہے۔

یہیں سے منطق و عقل سے مذہب کی لاتعلقی کا معاملہ شروع ہوتا ہے اور مسیحیت کو اس خطرناک وادی میں کھینچ لے جاتا ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ مذہب عقلی پہلو نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف قلبی تعبدی پہلو رکھتا ہے یہاں سے علم اور مذہب کی بے گانگی سامنے آتی ہے اور موجودہ مسیحیت کی منطق سے دونوں کا تضاد واضح ہوتا ہے۔ کیونکہ علم کہتا ہے کہ تین کا عدد ہرگز ایک کے عدد کے مساوی نہیں ہے لیکن موجودہ مسیحیت کہتی ہے کہ مساوی ہے۔

تثلیث کے بارے میں چند اہم نکات

۱۔ اناجیل میں عقیدۂ تثلیث نہیں ہے: موجودہ کسی انجیل میں بھی مسئلہ تثلیث کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، اسی لیے عیسائی محققین کا نظریہ ہے کہ تثلیث کا سرچشمہ اناجیل میں مخفی اور غیر واضح ہے۔

ایک امریکی مصنف مسٹر ہاکس کہتا ہے:

> لیکن مسئلہ تثلیث عہدِ عتیق اور عہدِ جدید میں مخفی اور غیر واضح ہے[1]

جیسا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مسئلہ تثلیث تقریباً تیسری صدی کے بعد عیسائیوں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بدعت ہے جو ایک طرف سے غلو کی بنا پر اور دوسری طرف سے عیسائیوں کے دیگر اقوام سے میل جول کی بنا پر حقیقی مسیحیت میں داخل ہو گئی۔

بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث اصولی طور پر ہندوؤں کی سہ گانہ پرستی جسے "ثالوث ہندی"

---

[1] قاموس مقدس ص ۳۴۵ طبع بیروت

کہتے ہیں ، سے لی گئی ہے۔[1]

۲۔ عقیدۂ تثلیث خلاف عقل ہے : تثلیث خصوصاً تثلیث در وحدت (یعنی ۔ ایک ہوتے ہوئے تین) ایک ایسا مطلب ہے جو بالکل نامعقول اور بداہت عقلی کے خلاف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دین کبھی عقل و علم سے جدا نہیں ہو سکتا۔ حقیقی علم حقیقی مذہب سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتا ہے اور یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں یہ بات کہ مذہب کو تعبد ہونے کے ناتے قبول کر لیا جائے بہت ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی مذہب کے اصول قبول کرنے میں عقل کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور تعبد ہونے کے حوالے سے ہی اسے قبول کر لیا جائے تو پھر اس مذہب اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا ۔ اس موقع پر پھر کون سی دلیل ہے کہ کہا جائے کہ انسان کو خدا پرست ہونا چاہیے نہ کہ بت پرست اور یونہی پھر کیوں آخر مسیحی اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، لیکن دوسرے مذاہب نہ کریں اور وہ کون سی خصوصیات ہیں جو وہ مسیحیت کے لیے سمجھتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ لوگ اس کی طرف آئیں یہ سب سوالات اس بات کی دلیل ہیں کہ مذہب کو منطق کے ذریعے پہچانا جائے اور یہ بات اس دعویٰ کے بالکل خلاف ہے کہ جس کے مطابق وہ مسئلہ تثلیث میں مذہب کو عقل سے جدا کرتے ہیں۔

بہرحال مذہب کی بنیادوں کو توڑنے کے لیے اس سے بدتر کوئی بات نہیں کہ ہم کہیں کہ مذہب عقلی و منطقی پہلو نہیں رکھتا بلکہ تعبد ہونے کے حوالے سے اختیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ خدا ہر لحاظ سے یکتا ہے : توحید کی بحث میں بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں جو ذاتِ خدا کی یکتائی اور یگانگی کو ثابت کرتی ہیں اور ہر طرح کی دوگانگی ، سہ گانگی یا تعدد کی نفی کرتی ہیں ۔ خدا ایک ہی ہے جو لامتناہی وجود ہے ، جو علم ، قدرت اور توانائی کے لحاظ سے ازلی و ابدی اور غیر محدود ہے ہم جانتے ہیں کہ لامتناہی وجود میں تعدد اور دوگانگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ اگر دو کو لامتناہی فرض کریں تو دونوں ہی محدود ہوں گے کیونکہ پہلا وجود دوسرے کی قدرت و توانائی اور ہستی کا فاقد ہے اور دوسرا وجود اسی طرح پہلے وجود اور اس کے امتیازات و خصوصیات کا فاقد ہے یعنی پہلے وجود کا اپنا وجود اور امتیازات ہیں اور دوسرے کا اپنا وجود اور امتیازات اس بنا پر پہلا وجود بھی محدود ہوگا اور دوسرا بھی ۔ واضح تر الفاظ میں اگر دو وجود تمام جہات سے لامتناہی فرض کر لیے جائیں تو یقیناً پہلا " لامتناہی " وجود جب دوسرے " لامتناہی " وجود کی حد تک پہنچے گا تو وہ تمام ہو جائے گا اور دوسرا " لامتناہی " وجود جب پہلے " لامتناہی " وجود کی حد تک پہنچے گا تو وہ بھی تمام ہو جائے گا ۔ لہٰذا دونوں محدود اور متناہی ہوں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذاتِ خدا جو ایک لامتناہی وجود ہے اس میں ہرگز تعدد نہیں ہو سکتا ۔ اسی لیے اگر ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ذاتِ خدا تین اقنوم یا تین ذاتوں سے مرکب ہے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ تینوں محدود ہوں نہ کہ غیر محدود اور لامتناہی۔

علاوہ ازیں ہر مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہے اور اس کا وجود ان کے وجود کا معلول ہے ذاتِ خدا میں بھی ترکیب ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ محتاج اور معلول ہو حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بے نیاز ہے اور عالم ہستی کی پہلی علت ہے ۔

---

[1] بیسویں صدی کے دائرۃ المعارف (فرید وجدی) کے مادہ ثالوث کی طرف رجوع کریں ۔ ہندوؤں کے تین خدا برہما ، فیشنو اور سیفا تھے ۔



۴۔ خدا انسانی لباس میں کیونکر ممکن ہے : ان سب باتوں سے قطع نظر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ذات خدا انسانی روپ میں ظاہر ہو اور اسے جسم، مکان، غذا اور لباس وغیرہ کی احتیاج پیدا ہو جائے۔ خدائے ازلی و ابدی کو ایک انسان کے جسم میں محدود کرنا اور اسے مادرِ رحم میں جنین کی حالت میں سمجھنا بدترین تہمتوں میں سے ہیں جو ذاتِ مقدسِ الٰہی سے وابستہ کی جائیں۔ اسی طرح خدا کی طرف بیٹے کی نسبت دینا ایک غیر منطقی اور بالکل نامعقول بات ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا کے لیے مختلف عوارض جسمانی کا قائل ہوا جائے یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے مسیحیت کے ماحول میں پرورش نہیں پائی اور بچپن سے اسے ان موہوم اور غلط تعلیمات کی عادت نہیں ہے وہ فطرت وعقل کے خلاف یہ باتیں سن کر کڑھنے لگتا ہے خود عیسائی "باپ خدا" اور "بیٹا خدا" جیسی باتیں سن کر اس لیے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ وہ بچپن سے ان غلط مفاہیم سے مانوس ہو چکا ہوتا ہے۔

۵۔ پرفریب تشبیہیں : اس دور میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض مسیحی مبلغین بے خبر لوگوں کو غافل رکھنے کیلیے پُرفریب مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً وحدت در تثلیث (یعنی تین ہوتے ہوئے ایک) کو کُرہ آفتاب۔ اس کا نور اور اس کی حرارت سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی یہ تین چیزیں ہیں اس کے باوجود ایک حقیقت ہیں۔ اسی طرح وہ اسے ایسے وجود سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا عکس تین آئینوں میں پڑ رہا ہو باوجودیکہ وہ ایک ہی وجود ہے پھر بھی تین وجود نظر آتے ہیں۔ اسی طرح وہ مثلث کی مثال دیتے ہیں جس کے تین زاویے ہوتے ہیں لیکن اگر ان زاویوں کو اندر کو بڑھائیں تو ایک ہی نقطے تک جا پہنچتے ہیں۔

تھوڑے سے غور وفکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان مثالوں کا زیر بحث مسئلے سے کوئی ربط نہیں۔ مسلّم ہے کہ کرہ آفتاب اور اس کا نور دو چیزیں ہیں نور قرمزی رنگ سے مافوق لہروں کو کہتے ہیں وہ سائنسی نقطہ نظر سے حرارت سے مختلف ہے جو کہ امواج مادونِ قرمز ہیں اگر انھیں ایک کہا جائے تو یہ غلط فہمی اور مجاز سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

اس سے زیادہ واضح جسم اور آئینوں کی مثال ہے کیونکہ جو عکس آئینوں میں پڑتا ہے وہ انعکاسِ نور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور مسلّم ہے کہ روشنی کا انعکاس خود جسم کے علاوہ چیز ہے اس لیے انھیں ایک چیز نہیں کہا جا سکتا اور جس نے بھی کسی سکول میں طبیعات (PHYSICS) کی پہلی کتاب پڑھی ہو وہ یہ بات جانتا ہے۔

مثلث والی مثال بھی ایسی ہے۔ مثلث کے زاویے یقیناً متعدد ہوتے ہیں اور مثلث کے اندرونی طرف بڑھتے جانے سے زاویے جب ایک نقطے میں بدل جاتے ہیں تو اس کا مثلث سے کوئی تعلق نہیں۔

باعث تعجب ہے کہ بعض مشرقی عیسائی توحید در تثلیث کے نظریے کو صوفیاؑ کی وحدتِ وجود کی منطق پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر واضح ہے کہ اگر کوئی شخص وحدتِ وجود کے غلط اور انحرافی عقیدے کو قبول بھی کرے تو بھی اسے چاہیے کہ اس عالم کے تمام موجودات کو ذاتِ خدا کا جزو سمجھے بلکہ اس کا عین تصور کرے اس لیے اس میں سے تثلیث کا تو کوئی مطلب نہیں نکلتا بلکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام موجودات اس کا جزو یا مظہر قرار پائیں گی۔ لہٰذا مسیحیت کی تثلیث کا وحدتِ وجود سے کوئی ربط نہیں اگرچہ اپنے مقام پر صوفیوں کے وحدت الوجود کا نظریہ بھی باطل ہو چکا ہے۔

لہ صوفیوں کے نظریہ وحدت الوجود سے مراد وحدت موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ ہستی بس ایک ہے جو مختلف چیزوں میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ ہستی ایک خدا ہے۔



۶۔ ایک اور اشتباہ :۔ بعض اوقات کچھ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم جو عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہتے ہیں تو یہ اسی طرح ہے، جیسے تم امام حسینؑ کو ثار اللہ و ابن ثارہ (خون خدا اور فرزند خون خدا) کہتے ہو یا بعض روایات میں حضرت علیؑ کو "ید اللہ" (اللہ کا ہاتھ کہا گیا ہے)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کہ بعض نے "ثار" کا معنی خون کیا ہے کیونکہ لفظ "ثار" عربی میں کبھی بھی "خون" کے معنی میں نہیں آیا بلکہ اس کا معنی ہے "خون بہا" عربی میں خون کے لیے "دَم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس لیے "ثار اللہ" کا مطلب ہے "اے وہ شخص جس کا خون بہا اللہ سے تعلق رکھتا ہے اور وہی تیرا خونبہا لے گا" یعنی تو کسی ایک خاندان سے تعلق نہیں رکھتا کہ تیرا خون بہا اس خاندان کا سربراہ لے اور نہ ہی تو کسی ایک قبیلے سے تعلق رکھتا ہے کہ سربراہِ قبیلہ تیرا خون بہا لے، تو عالم انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اور تیرا تعلق تو عالم ہستی اور خدا کی ذاتِ پاک سے ہے۔ لہٰذا تیرا خون بہا اسے لینا چاہیے؛ اسی طرح تو علی ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے جو شہید راہِ خدا تھے اور ان کا خون بہا بھی خدا ہی کو لینا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ اگر کسی عبارت میں مردانِ خدا کے لیے "ید اللہ" یا اسی طرح کا کوئی لفظ آیا ہے تو یہ تشبیہ، کنایہ اور مجاز کے طور پر ہے۔ کیا کوئی حقیقی عیسائی اس بات پر تیار ہے کہ مسیح کے لیے ابن اللہ کہنے کو ایک طرح کا مجاز اور کنایہ قرار دے۔ مسلماً ایسا نہیں ہے کیونکہ مسیحیت کی اصلی کتب اور مصادر میں انھیں خدا کا حقیقی بیٹا قرار دیا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ صفت مسیح کے ساتھ مخصوص ہے کسی اور کے لیے ایسا نہیں ہے۔

یہ جو عیسائیوں کی بعض سطحی تبلیغاتی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ وہ "ابن اللہ" کو کنایہ اور تشبیہ قرار دیتے ہیں یہ زیادہ تر عوام کو فریب دینے کے لیے ہے اس کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل عبارت کی طرف توجہ کریں۔ یہ عبارت قاموس کتاب مقدس کے مؤلف نے لفظ "خدا" کے ضمن میں تحریر کی ہے:

> اور "ابن اللہ" ہمارے نجات دہندہ اور فدیہ بننے والے کا ایک لقب ہے جو اس کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں بولا جا سکتا، مگر ایسے مقام پر کہ جہاں قرائن سے معلوم ہو کہ مقصد خدا کا حقیقی بیٹا ہے[1]

۱۷۲۔ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ○

۱۷۳۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ

---

[1] قاموس مقدس ص ۳۴۵، طبع بیروت



يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

ترجمہ

۱۷۲۔ مسیح اس سے ہرگز پہلو تہی اور انکار نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ اس کے مقرب فرشتے (اس کا انکار کرتے ہیں) اور جو اس کی عبودیت اور بندگی سے پہلو تہی کرے اور تکبر کرے، بہت جلد وہ ان سب کو اپنی طرف محشور کرے گا (اور انھیں قیامت میں اٹھائے گا)۔

۱۷۳۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیے ان کی پوری جزا انھیں دے گا اور اپنے فضل و بخشش سے انھیں مزید دے گا۔ لیکن جنھوں نے پہلو تہی کی اور تکبر کیا انھیں دردناک سزا دے گا اور وہ خدا کے علاوہ اپنے لیے کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں پائیں گے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ان آیات کے سلسلے میں ایک شانِ نزول روایت کی ہے۔ روایت یہ ہے:

نجران کے کچھ عیسائی پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا:-

آپ ہمارے پیشوا پر کیوں تنقید کرتے ہیں؟

پیغمبر اسلام نے فرمایا: میں نے ان پر کون سا عیب لگایا ہے؟

وہ کہنے لگے:- آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

عیسٰیؑ خدا کے بندے ہیں

اگرچہ زیر نظر آیات کی مخصوص شانِ نزول ہے۔ اس کے باوجود وہ گذشتہ آیات سے مربوط ہیں جن میں الوہیت مسیحؑ کی نفی اور مسئلہ تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے۔

پہلے تو ایک اور پہلو سے الوہیت مسیحؑ کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم عیسٰیؑ کی الوہیت کا کیسے عقیدہ رکھتے ہو، جبکہ



نہ عیسیٰ پروردگار کی بندگی سے پہلو تہی کرتے ہیں نہ خدا کے مقرب فرشتے اس سے پہلو تہی کرتے ہیں (لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً للّٰہ ولا الملئکۃ المقربون) مسلّم ہے کہ جو شخص خود عبادت کرنے والا ہو اس کے معبود ہونے کا کوئی معنی نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنی ہی عبادت کرے یا یہ کہ عابد و معبود اور بندہ و خدا ایک ہی ہوں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے ایک حدیث مروی ہے آپؑ نے کچھ عیسائیوں کو جو حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے مدعی تھے مغلوب کرنے کے لیے ان کے ایک بزرگ جاثلیق سے فرمایا: عیسیٰؑ کی باقی باتیں تو اچھی ہیں ان میں صرف ایک عیب تھا اور وہ یہ کہ وہ زیادہ عبادت نہیں کرتے تھے۔

وہ عیسائی جھنجلا اٹھا اور امام سے کہنے لگا: آپ کتنی غلط بات کہہ رہے ہیں۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ وہ سب سے زیادہ عبادت گذار تھے۔

امام نے فوراً فرمایا: وہ کس کی عبادت کرتے تھے؟ کیا خدا کے علاوہ کسی کی عبادت کرتے تھے؟ لہٰذا خود تیرے اعتراف کے مطابق وہ خدا کے بندے، مخلوق اور اس کی عبادت کرنے والے تھے، نہ کہ معبود اور خدا تھے۔

وہ عیسائی خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے، جو لوگ پروردگار کی عبادت اور بندگی سے پہلو تہی کریں اور اس کی وجہ تکبر ہو تو خدا ان سب کو قیامت کے دن حاضر کرے گا اور ہر ایک کو مناسب جزا دے گا (ومن یستنکف عن عبادتہ و یستکبر فسیحشرھم الیہ جمیعًا)

اس دن اہلِ ایمان اور نیک عمل کرنے والوں کو ان کی مکمل جزا دے گا اور اپنے فضل و رحمت سے اس پر اضافہ کرے گا اور جنھوں نے بندگی سے انکار کیا اور راہِ تکبر اختیار کی وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور خدا کے سوا انھیں کوئی سرپرست، حامی اور مددگار نہیں ملے گا (فاما الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فیوفیھم اجورھم و یزیدھم من فضلہ واما الذین استنکفوا واستکبروا فیعذبھم عذابًا الیمًا ولایجدون لھم من دون اللّٰہ ولیا ولا نصیرًا)۔

دو اہم نکات

۱۔ **استنکفوا اور استکبروا:** استنکاف کا معنی ہے کسی چیز سے امتناع اور کسی سے پرے ہٹ جانا۔ اس لیے یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے لیکن "استکبروا" کہہ کر اسے محدود کر دیا گیا ہے کیونکہ خدا کی بندگی سے پہلو تہی اور امتناع کبھی جہل و نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی تکبر، خود بینی اور سرکشی کی بنا پر، اگرچہ یہ دونوں بُرے ہیں لیکن دوسرا گناہ بدتر ہے۔

۲۔ **ملائکہ انکارِ عبادت نہیں کرتے:** ملائکہ کے انکارِ عبادت نہ کرنے کا تذکرہ یا تو اس لیے ہے کہ عیسائی تین معبودوں کے قائل تھے (باپ، بیٹا اور روح القدس، یا دوسرے لفظوں میں باپ خدا، بیٹا خدا اور دونوں کے درمیان واسطہ) اس لیے اس آیت میں

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۳۵۲



قرآن چاہتا ہے کہ دوسرے معبودوں یعنی مسیح اور روح القدس فرشتہ ہر دو کی نفی کی جائے تاکہ ذات پروردگار کی توحید ثابت ہو جائے یا پھر یہ اس بناء پر ہے کہ آیت میں عیسائیوں کے شرک کا جواب دیتے ہوئے عرب بُت پرستوں کے شرک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو فرشتوں کو خدا کی اولاد اور پروردگار کا جزو سمجھتے تھے یہ انھیں بھی ایک جواب ہے۔

ملائکہ کے بارے میں ان دونوں بیانات کی طرف توجہ کرنے سے اس بحث کی گنجائش نہیں رہتی کہ کیا زیر نظر آیت انبیاء پر ملائکہ کی افضلیت پر دلالت کرتی ہے یا نہیں، کیونکہ آیت تو تثلیث کے تیسرے اقنوم یا مشرکین عرب کے معبودوں کی نفی کے لیے ہے نہ کہ ملائکہ کی مسیح پر فضیلت بیان کرنے کے لیے ہے۔

۱۷۴۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا ○

۱۷۵۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ○

ترجمہ

۱۷۴۔ اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے لیے واضح دلیل آئی اور ہم نے واضح نور تمھاری طرف بھیجا۔

۱۷۵۔ رہے وہ لوگ جو خدا پر ایمان لے آئے اور اس (آسمانی کتاب) سے وابستہ ہوئے بہت جلد ان سب کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

نورِ مبین

سابقہ آیات میں توحید اور تعلیمات انبیاء سے اہل کتاب کے انحراف کی بحث تھی۔ اب ان دو آیتوں میں آخری بات کہی گئی ہے اور راہِ نجات کو مشخص و معین کر دیا گیا ہے پہلے تو اس عالم کے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: اے لوگو! تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ایک پیغمبر آیا ہے کہ جس کے پاس واضح دلائل و براہین موجود ہے اور اسی طرح اس کے ساتھ ایک نور آشکار بھیجا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے جو تمھاری راہ سعادت کو روشن کرتا ہے (یا ایها الناس قد جاء کم برهان من ربکم و انزلنا الیکم نورًا مبینًا)۔

بعض علماء کے نظریئے کے مطابق "برہان" "برہ" (بر وزن "فرح") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے سفید ہونا



اور چونکہ واضح استدلال سننے والے کے لیے حق کے چہرے کو آشکار، نورانی اور سفید کر دیتا ہے لہٰذا اسے برہان کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں اور قرائن بھی گواہی دیتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت میں برہان سے مراد پیغمبر اسلامؐ کی ذاتِ بابرکات ہے اور نور سے مراد قرآنِ مجید ہے جبکہ دوسری آیات میں بھی اسے نُور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تفسیر نورالثقلین، علی بن ابراہیم اور مجمع البیان میں طرق اہلِ بیتؑ سے کئی ایک احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ لفظ برہان پیغمبر اکرمؐ کے لیے ہے اور نور سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ یہ تفسیر اوپر بیان کی گئی تفسیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ نور کا بیان وسیع مفہوم ہو، جس میں قرآن بھی شامل ہو اور امیرالمومنین علیؑ بھی جو کہ قرآن کے محافظ، مفسّر اور مدافع ہیں۔

بعد والی آیت میں اس بُرہان اور نور کی پیروی کے نتیجے کا ذکر ہے: باقی رہے وہ جو خدا پر ایمان لائے اور انھوں نے اس آسمانی کتاب سے تمسک کیا، بہت جلد وہ انھیں اپنی وسیع رحمت میں داخل کرے گا اور اپنے فضل و رحمت سے ان کی جزائیں اضافہ کرے گا اور انھیں صراطِ مستقیم اور راہِ راست کی طرف ہدایت کرے گا (فاما الذین امنوا باللّٰہ واعتصموا بہ فسیدخلہم فی رحمۃ منہ و فضل و یہدیہم الیہ صراطاً مستقیماً)۔

۱۷۶۔ یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ع

ترجمہ

۱۷۶۔ تجھ سے (بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں) سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا تمھارے لیے کلالہ (بہن بھائی) کا حکم بیان کرتا ہے۔ اگر ایک مرد مر جائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے چھوڑے ہوئے مال سے آدھا (بطور میراث) لے گی اور (اگر بہن مر جائے اور اس کا وارث صرف ایک بھائی ہو تو) وہ اس بہن کا سارا مال میراث میں لے گا۔ اس صورت میں کہ (متوفی کی) کوئی اولاد نہ ہو اور اگر (متوفی کی) دو بہنیں باقی ہوں تو وہ مال کا دو تہائی لیں گی اور اگر بہن بھائی اکٹھے ہوں تو (تمام مال اس طرح سے تقسیم کریں گے کہ) ہر مذکر کے لیے مؤنث کے حصے سے دوگنا ہوگا۔ خدا تمھارے لیے (اپنے احکام) بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)



اور خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین جابر بن عبداللہ انصاری سے اس آیت کی شانِ نزول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

میں بہت سخت بیمار ہوگیا تھا تو پیغمبر میری عیادت کے لیے تشریف لائے اور وہیں وضو کیا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا۔ میں چونکہ موت کی فکر میں تھا، پیغمبر سے عرض کیا، میری وارث فقط میری بہنیں ہیں، ان کی میراث کس طرح ہوگی؟

اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جسے آیتِ فرائض کہتے ہیں۔

بعض کے نظریئے کے مطابق احکامِ اسلام کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی یہ آخری آیت ہے۔[1]

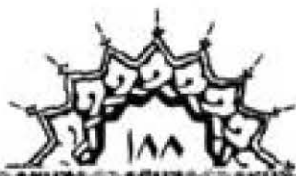
تفسیر

زیرِ نظر آیت میں بھائی بہنوں کی میراث کی مقدار بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ اس سورہ کے اوائل میں آیت ۱۲ کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بہنوں اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں قرآن حکیم میں دو آیتیں ہیں۔ ایک وہی آیت ۱۲۔ دوسری یہ آیت جو سورہ نساء کی آخری آیت ہے اگرچہ دونوں آیات میراث کی مقدار کے بارے میں مختلف ہیں لیکن جیسا کہ سورہ کی ابتداء میں بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ان میں ہر ایک بہنوں اور بھائیوں کی الگ الگ قسم کے بارے میں ہے۔ آیت ۱۲، مادری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن زیرِ بحث آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ عام طور پر بھی تو کچھ لوگ متوفی سے بالواسطہ ربط رکھتے ہیں۔ ان کی میراث کی مقدار اسی واسطے سے ہوتی ہے یعنی مادری بہن بھائی ماں کے حصے کے حساب سے لیتے ہیں جو کہ ایک تہائی ہے اور پدری یا مادری پدری بہن بھائی باپ کی میراث والا حصہ لیتے ہیں جو کہ دو تہائی ہے۔ آیت ۱۲ چونکہ بہن بھائیوں کی میراث کے متعلق ایک تہائی حصے کے بارے میں ہے اس لیے یہ ان کے بارے میں ہے جو صرف ماں کی طرف سے متوفی کے ساتھ مربوط ہیں جبکہ زیرِ بحث آیت دو تہائی حصے کے بارے میں ہے لیکن یہ ان بہن بھائیوں سے متعلق ہے جو باپ سے یا ماں باپ دونوں سے مربوط ہیں۔ علاوہ ازیں آئمہ اہل بیتؑ سے مروی روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں بہرحال اب اگر ایک تہائی یا دو تہائی میراث بھائی یا بہن سے متعلق ہے تو باقی ماندہ مال قانونِ اسلام کے مطابق دیگر ورثہ میں تقسیم ہوگا اب جبکہ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ان دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہم ان احکام کی تفسیر شروع کرتے ہیں جو اس آیت میں آئے ہیں۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) صراط مستقیم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں سورۂ حمد کی تفسیر کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے (اردو ترجمہ ص ۳۰)

[1] تفسیر صافی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔



توجہ رہے کہ یہ آیت کلالہ (بہن بھائی) کے بارے میں سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئی ہے[1]۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے، تم سے اس بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ خدا کلالہ (بھائی بہن) کے بارے میں تمہارے لیے حکم بیان کرتا ہے (یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ) اس کے بعد چند احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بہن بھائی کی میراث کے چند احکام

۱۔ جب کوئی مرد دنیا سے چلا جائے اس کی کوئی اولاد نہ ہو فقط ایک بہن ہو تو اس کی آدھی میراث اس ایک بہن کو ملیگی (ان امرؤا ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلھا نصف ما ترک)۔

۲۔ اگر کوئی عورت مر جائے، اس کی اولاد نہ ہو اس کا بس ایک بھائی ہو (جو پدری ہو یا مادری پدری ہو) تو اس کی ساری میراث اس کے اس اکیلے بھائی کو ملے گی (وھو یرثھا ان لم یکن لھا ولد)۔

۳۔ اگر کوئی شخص دنیا سے چلا جائے اور دو بہنیں پیچھے چھوڑ جائے تو وہ اس کی دو تہائی میراث لیں گی (فان کانتا اثنتین فلھما الثلثان مما ترک)۔

۴۔ اگر مرنے والے شخص کی چند بہنیں اور چند بھائی ہوں (جو دو سے زیادہ ہوں) تو وہ اس کی تمام میراث آپس میں تقسیم کرینگے اس طرح سے کہ ہر بھائی کا حصہ ایک بہن سے دوگنا ہوگا (وان کانوا اخوۃ رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین)۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا یہ حقائق تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور سعادت کی راہ پا لو اور (یقیناً) جس راستے کی خدا نشاندہی کرتا ہے وہی صحیح اور حقیقی راستہ ہے، کیونکہ وہ ہر چیز سے دانا ہے (یبین اللہ لکم ان تضلوا[2] واللہ بکل شیء علیم)۔

یہ بات بنا کہے نہ رہ جائے کہ زیرِ نظر آیت میں بہن بھائیوں کی میراث اس صورت میں بیان کی گئی ہے جبکہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اس میں کوئی بات نہیں آئی۔ لیکن اس سورہ کی ابتدائی آیات کے مطابق ماں باپ ہمیشہ اولاد کے یعنی میراث کے پہلے طبقے کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس مقام کے لیے ہے جب نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ۔

"سورۂ نساء" کی تفسیر اختتام کو پہنچی۔

---

[1] کلالۃ کے لغوی معنی کیا ہیں اور یہ کہ بہن بھائیوں کو کلالۃ کیوں کہتے ہیں ..... اس کے بارے میں سورہ نساء آیت ۱۲ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے (ص ۲۱۴ اردو ترجمہ جلد ۳)

[2] "ان تضلوا" یہاں "ان لا تضلوا" کے معنی میں ہے یعنی لفظ "لا" مقدر ہے۔ ایسی تعبیرات قرآن میں اور عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔



سورۂ مائدہ

★ — مدنی ہے

★ — اس کی ۱۲۰ آیات ہیں

سورۂ مائدہ کے مضامین

یہ سورت مدنی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی ۱۲۰ آیتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ سورت سورۂ فتح کے بعد نازل ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق یہ ساری سورت حجۃ الوداع میں اور مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی[1]

یہ سورت معارف، عقائدِ اسلامی اور احکامِ دینی پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں پیغمبر اکرمؐ کے بعد کے لیے مسئلہ ولایت و رہبری، عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث، قیامت و معاد کے کچھ مسائل اور انبیاء سے ان کی امتوں کے بارے میں پرسش کے معاملات ہیں۔

دوسرے حصے میں ایفائے عہد کا مسئلہ، عدالتِ اجتماعی کا معاملہ، عادلانہ شہادت اور قتل نفس کی حرمت کا حکم ہے۔ (اسی مناسبت سے آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ ہے جبکہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تھا) اسی طرح کچھ حلال و حرام غذاؤں کی وضاحت ہے کچھ وضو اور تیمم کے احکام ہیں۔

اس کا نام "مائدہ"[2] اس لیے ہے کیونکہ حضرت عیسٰیؑ کے انصار کے لیے مائدہ کے نزول کی داستان اسی سورت کی آیت ۱۱۴ میں بیان کی گئی ہے۔

---

[1] المنار ج ۶ ص ۱۱۶۔ توجہ رہے کہ کسی سورت کے مدنی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت پیغمبرؐ کے بعد نازل ہوئی ہو اگرچہ سورت کا نزول شہر مدینہ میں نہ ہوا ہو۔

[2] مائدہ دراصل اس برتن (طشت) کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جائے۔



سورۂ مائدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَـكُمۡ بَهِيۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ
اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحۡكُمُ
مَا يُرِيۡدُ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار پورے کرو۔ چوپائے (اور چوپایوں کے جنین) تمھارے لیے حلال کر دیے گئے ہیں مگر وہ جو تم سے بیان کیے جائیں گے (ان کے سوا جن کی استثناء کی جائے گی) اور احرام کے وقت شکار کو حلال نہ سمجھو اور خدا جو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) حکم کرتا ہے۔

تفسیر

ایفائے عہد ضروری ہے

جیسا کہ اسلامی روایات اور بڑے بڑے مفسرین کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، سورۃ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی آخری سورت ہے (یا آخری سورتوں میں سے ہے)۔ تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا:

"سورۂ مائدہ رحلتِ پیغمبرؐ سے دو یا تین ماہ پہلے نازل ہوئی [1]"

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۳۰

توجہ رہے کہ اس سورہ میں وضو، تیمم وغیرہ کے احکام اس کے آخری ہونے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ایسے بہت سے احکام تکرار و تاکید کا پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بعض احکام سورۂ نساء میں بھی ہیں۔



یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سورہ ناسخ ہے منسوخ نہیں، یہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بات اس بات کے منافی نہیں جو اس تفسیر کی دوسری جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۱ کے ذیل میں کی گئی ہے۔ وہاں اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ روایات کے مطابق مذکورہ آیت پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔ یہاں گفتگو سورہ کے بارے میں ہے اور وہاں بات ایک آیت کے متعلق تھی۔

اس سورہ میں اس کے خاص موقع کے وجہ سے مفاہیم اسلامی بیان کیے گئے ہیں دین سے متعلق آخری پروگراموں کا تذکرہ ہے۔ اس میں اُمت کی رہبری اور پیغمبر اسلامؐ کی جانشینی کا ذکر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ کا آغاز عہد و پیمان کے لازمی ایفا کے حکم سے ہوتا ہے۔

پہلے جملے میں فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کے ساتھ وفا کرو (یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ) یہ اس لیے ہے تاکہ اہل ایمان کے لیے ان پیمانوں اور وعدوں کا ایفا ضروری قرار دیا جائے جو وہ خدا سے پہلے باندھ چکے ہیں یا جن کے متعلق اس سورہ میں اشارہ ہوا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی مسافر اپنے رشتہ داروں اور رہبر و کاروں سے وداع ہوتے ہوئے آخری لمحوں میں تاکید کرتا ہے کہ میری وصیتوں اور نصیحتوں کو بھول نہ جانا اور جو قول و قرار تم نے میرے ساتھ باندھے ہیں ان کے وفادار رہنا۔

توجہ رہے کہ "عقود" "عقد" کی جمع ہے۔ "عقد" دراصل ایک محکم چیز کے اطراف کو جمع کرنے کے معنی میں ہے اسی مناسبت سے رسی کے دو سروں کو یا دو رسیوں کو ایک دوسرے سے گرہ لگانے کو "عقد" کہتے ہیں بعد ازاں اس حسی معنی سے معنوی مفہوم پیدا ہو گیا اور ہر قسم کے عہد و پیمان کو "عقد" کہا جانے لگا۔ البتہ بعض فقہا نے تصریح کی ہے کہ عہد کی نسبت عقد کا مفہوم محدود ہے کیونکہ عقد ایسے پیمان کو کہتے ہیں جو بہت مستحکم ہو نہ کہ ہر عہد و پیمان کو۔ لہٰذا اگر بعض روایات میں اور مفسرین کی بعض تحریروں میں عقد اور عہد ایک ہی مفہوم میں آئے ہیں تو یہ ہماری بیان کردہ بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ مقصد ان دو الفاظ کی اجمالی تفسیر کا بیان کرنا تھا نہ کہ اس کی جزئیات کا تذکرہ منظور تھا۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اصطلاح کے مطابق "العقود" "جمع محلی بہ الف لام" ہے جو عمومیت کے لیے ہوتی ہے اور جملہ بھی بالکل مطلق ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت ہر طرح کے عہد و پیمان کے وفا کرنے کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ چاہے یہ محکم عہد و پیمان انسان کا انسان کے ساتھ ہو یا انسان کا خدا کے ساتھ ہو۔ اس طرح یہ تمام خدائی اور انسانی اور سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، تجارتی، ازدواجی وغیرہ عہد و پیمان پر محیط ہے اور اس کا ایک مکمل وسیع مفہوم ہے۔ اس کی نظر تمام انسانی پہلوؤں پر ہے، چاہے ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا عمل سے، وہ فطری عہد و پیمان ہوں یا توحیدی۔ اور چاہے ان کا تعلق ان معاہدوں سے ہو جو لوگ زندگی کے مختلف مسائل میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

تفسیر روح المعانی میں راغب کے حوالے سے منقول ہے کہ وضع و کیفیت کے لحاظ سے طرفین میں ہونے والے عقد کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی عقد خدا اور بندے کے درمیان ہوتا ہے کبھی انسان اور اس کے نفس کے مابین ہوتا ہے اور کبھی عقد انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے[1] (البتہ عقد کی یہ تینوں قسمیں طرفین کے مابین میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں

---

[1] تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں



انسان خود اپنے ساتھ عہد و پیمان باندھتا ہے وہاں وہ اپنے آپ کو دو اشخاص کی طرح فرض کرتا ہے)۔

بہرحال آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں وہ عہد و پیمان بھی آجاتے ہیں جو مسلمان غیر مسلموں سے باندھتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **ایک فقہی قاعدہ:** یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حقوقِ اسلامی سے بحث کرتی ہیں۔ فقہی مباحث میں اول سے آخر تک اس سے استدلال کیا جاتا ہے اس سے ایک اہم فقہی قاعدہ معلوم ہوتا ہے جسے "اصالۃ اللزوم فی العقود" کہتے ہیں۔ یعنی ہر قسم کا عہد و پیمان جو کچھ چیزوں کے بارے میں ہو یا دو افراد کے درمیان کچھ کاموں کے متعلق ہو، اس کا اجراء اور اس پر عمل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

یہاں تک کہ جیسے بعض محققین کہتے ہیں کہ مختلف قسم کے معاملات، شراکتیں، کاروبار اور قراردادیں جو ہمارے زمانے میں موجود ہیں اور سابقہ دور میں نہیں تھیں یا آنے والے دور میں عقلاء میں معرضِ وجود میں آئیں گی اور صحیح اصولوں کی بنیاد پر ہوں گی، یہ قاعدہ سب پر محیط ہے اور یہ آیت سب کے بارے میں ہے (البتہ ان کلی ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے جن کا اسلام معاہدوں کے بارے میں حکم دیتا ہے)۔

اس آیت میں ایک فقہی قاعدہ کے طور پر استدلال کرنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ پیمانِ الٰہی جو خدا اور بندوں کے درمیان باندھے گئے ہیں یا وہ مسائل جو رہبری اور اُمت کی قیادت سے مربوط ہیں کہ جن کا پیمان پیغمبرؐ کے ذریعے لوگوں سے لیا گیا ہے اس میں شامل نہیں بلکہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دو طرفہ عہد و پیمان کی وفا اور تکمیل اس وقت تک ضروری ہے جب تک کوئی ایک طرف اسے توڑ نہ دے لیکن اگر ایک طرف سے اسے توڑ دیا جائے تو پھر دوسری طرف پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ وہ اسے وفا کرے، اور ایسا معاملہ عقد و پیمان کے مفہوم سے ساقط ہو جاتا ہے۔

۲۔ **ایفائے عہد کی اہمیت:** عہد و پیمان کی وفا کا مسئلہ جو زیرِ بحث آیت میں بیان ہوا ہے، اجتماعی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس کے بغیر کوئی اجتماعی ہم کاری اور تعلق ممکن نہیں ہے اور اگر انسان اسے ہاتھ سے دے بیٹھے تو اجتماعی زندگی اور اس کے ثمرات کو عملی طور پر کھو بیٹھتا ہے۔ اسی بنا پر اسلامی مصادر اور کتب میں اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ شاید بہت کم کوئی اور چیز ہو جسے اس قدر وسعت سے بیان کیا گیا ہو کیونکہ اس کے بغیر تو معاشرہ ہرج مرج اور عدم اطمینان کا شکار ہو جائے گا، جو نوعِ انسانی کے لیے سب سے بڑی اجتماعی مصیبت ہے۔

نہج البلاغہ میں مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

فانہ لیس من فرائض اللّٰہ شیء الناس اشد علیہ اجتماعا مع تفرق اھوائھم وتشتت اراءھم من تعظیم الوفاء بالعھود، وقد لزم ذلك المشرکون فیما بینھم دون المسلمین لما استوبلوا



من عواقب الغدر۔
دنیا بھر کے لوگوں میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایفائے عہد کی طرح کسی اور امر پر اتفاق نہیں ہے۔ اسی لیے تو زمانہ جاہلیت کے بُت پرست بھی اپنے عہد و پیمان کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ عہد شکنی کے دردناک انجام کو جان چکے تھے۔[2]

امیرالمومنینؑ ہی سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان اللّٰہ لا یقبل الا العمل الصالح ولا یقبل اللّٰہ الا الوفاء بالشروط والعھود۔

خدا اپنے بندوں سے عمل صالح کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا اور (اسی طرح) خدا شرائط اور عہد و پیمان کے (بارے میں بھی) ایفاء کے علاوہ کچھ قبول نہیں کرتا۔[2]

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

لا دین لمن لا عھد لہ[3]

جو شخص اپنے عہد و پیمان کا وفادار نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔

لہٰذا ایفائے عہد ایک ایسی بات ہے جس میں افرادِ انسانی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے چاہے طرف مقابل مسلمان ہو یا کوئی غیر مسلم۔ اصطلاح کے مطابق یہ انسانی حقوق میں سے ہے نہ کہ برادرانِ دینی کے حقوق میں سے۔

ایک حدیث میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ثلاث لم یجعل اللّٰہ عزوجل لاحد فیھن رخصۃ، اداء الامانۃ الی البر والفاجر، والوفاء بالعھد للبر والفاجر، و بر الوالدین بر ین کانا او فاجرین۔

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی مخالفت کی خدا نے کسی شخص کو اجازت نہیں دی: ۱۔ امانت کی ادائیگی ہر شخص کو چاہے وہ نیک ہو یا بد ۲۔ ایفائے عہد ہر کسی سے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا اور ۳۔ ماں باپ سے حسنِ سلوک چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے۔[4]

یہاں تک کہ ایک روایت میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

اگر کوئی شخص اشارے سے بھی کوئی عہد اپنے ذمے لے لے تو اسے وفا کرنا چاہیے۔

---

[1] نہج البلاغہ، حضرت علیؑ کے خطوط میں سے خط نمبر ۵۳

[2] سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ ۲۹۴

[3] بحار جلد ۱۶ صفحہ ۱۴۴

[4] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۱۶۲

اس روایت کا متن یہ ہے :

اذا اومی احد من المسلمین او اشار الی احد من المشرکین فنزل علی ذٰلك فھو فی امان ۔[1]

عہد و پیمان کے بارے میں حکم پر گفتگو ہو چکی جو کہ تمام احکام اور خدائی پیمانوں پر محیط ہے اِس کے بعد احکام اسلام کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے ان میں سے پہلا حکم کچھ جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں ہے، فرمایا گیا ہے : چوپائے (اوران کے جنین) تمھارے لیے حلال کیے گئے ہیں (احلت لکم بھیمة الانعام) ۔ "انعام" جمع ہے "نعم" کی، جس کا معنی ہے اونٹ، گائے اور گوسفند[2]

"بھیمة" کا مادہ "بھمة" (بروزن "تھمة") ہے ۔ اس کا معنی ہے "محکم اور سخت پتھر" اور ہر چیز جس کا ادراک مشکل ہو اسے "مبھم" کہتے ہیں اور وہ تمام جانور جو بول چال نہیں سکتے انھیں بھیمة کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی آواز میں ابہام ہوتا ہے ۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ چوپایوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں درندے اور پرندے شامل نہیں ہوتے چونکہ حیوانات کے جنین (جو مادہ جانور کے پیٹ میں ہوتے ہیں) بھی ایک قسم کا ابہام رکھتے ہیں ۔ اس لیے انھیں بھی "بھیمة" کہا جاتا ہے ۔

اس بنا پر "بھیمة الانعام" کا حلال ہونا یا تو تمام چوپایوں کے لیے ہے (البتہ وہ جانور مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر بعد کی آیت میں آئے گا) یا ان بچوں کے حلال ہونے کے معنی میں ہے جو حلال گوشت جانوروں کے شکم میں ہوں (وہ بچے کہ جنکی خلقت پوری ہو گئی ہے اور کھال اور بال ان پر اگ آئے ہیں)[3]

کچھ جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں پہلے سے مشخص تھا مثلاً اونٹ، گائے اور گوسفند، لہٰذا ممکن ہے کہ اس آیت میں ان کی جنین کی حلیت کی طرف اشارہ ہو لیکن جو بات آیت کے معنی سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے یعنی ایسے جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں بھی ہے اور ان کی جنین کے حلال ہونے سے متعلق بھی ہے اور اگر ایسے جانوروں کا حکم پہلے سے بھی معلوم تھا تب بھی یہاں مستثنیٰ قرار دیے جانے والے جانوروں کے حکم سے پہلے مقدمے کے طور پر اس حکم کا تکرار کیا گیا ہے ۔ اس جملے کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس حکم کا ربط ایفائے عہد کے لازمی ہونے سے اس بنا پر تھا کہ ایفائے عہد ایک کلی بنیاد ہے ۔ یہ کلی بنیاد

---

[1] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۵۰

[2] "نعم" اگر مفرد کی صورت میں استعمال ہو تو "اونٹ" کا معنی دیتا ہے لیکن جمع کی شکل میں ہو تو اونٹ، گائے اور گوسفند بھی اس کے مفہوم میں آجاتے ہیں (مفردات راغب، مادہ "نعم") ۔

[3] اگر "بھیمة" کا معنی آیت میں "حیوانات" ہو تو "انعام" کے ساتھ اس کی اضافت، اضافت بیانیہ کہلائے گی اور اگر "جنین" کے معنی میں ہو تو اس کی اضافت، اضافت لامیہ ہوگی ۔



احکام الٰہی پر اس لحاظ سے ایک تاکید ہے کہ احکام الٰہی بھی خدا کے بندوں سے عہد و پیمان کی ایک قسم ہے اس کے بعد پھر کچھ احکام بیان کیے گئے ہیں جن میں بعض جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کا ذکر ہے اور بعض جانوروں کے گوشت کے حرام ہونے کا ذکر ہے۔

پھر آیت میں چوپایوں کے گوشت کی حرمت کے بارے میں دو استثنائی حکم ہیں: ان جانوروں کے گوشت کا استثناء ہے جن کی تحریم عنقریب تمہارے لیے بیان کی جائے گی (الا ما یتلی علیکم) اور حالت احرام میں بھی شکار کرنا حرام ہے (یعنی .... حج کے مناسک یا عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے باندھے گئے احرام کی حالت میں شکار کرنا حرام ہے) (غیر محلی الصید و انتم حرم)[1]

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا جو حکم چاہتا ہے، صادر کرتا ہے ——— یعنی۔ خدا چونکہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور ہر چیز کا مالک ہے لہذا جو حکم بندوں کی مصلحت میں ہو اور حکمت اس کی متقاضی ہو اسے جاری کر دیتا ہے (ان اللہ یحکم ما یرید)

۲۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۲۔ اے ایمان والو! شعائرِ خداوندی (اور مراسمِ حج کو محترم سمجھو اور ان کی مخالفت) کو حلال قرار نہ دو اور نہ ہی حرام مہینہ کو اور نہ بغیر نشانی والی قربانیوں کو اور نہ نشانیوں والی کو اور نہ وہ کہ جنھیں خانۂ خدا کے قصد سے پروردگار کے فضل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لاتے ہو اور جب تم حالتِ احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمہارے لیے کوئی منع نہیں ہے اور وہ گروہ جو مسجد الحرام کی طرف (حدیبیہ کے سال) تمہارے آنے میں حائل ہوا تھا۔

[1] البتہ "الا ما یتلی علیکم" جملہ استثنائیہ ہے اور "غیر محلی الصید" کم کی ضمیر سے حال ہے جو معنی کے لحاظ سے استثناء کا نتیجہ دیتا ہے۔



اس کی دشمنی تمھیں تجاوز پر نہ اُبھارے اور (ہمیشہ) نیکی اور پرہیزگاری کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور (ہرگز) گناہ اور تجاوز کی راہ میں ساتھ نہ دو اور خدا سے ڈرو، جس کی سزا سخت ہے۔

تفسیر

ایک آیت میں آٹھ احکام

اس آیت میں چند اہم اسلامی احکام بیان ہوئے ہیں یہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والے آخری احکامات میں سے ہیں یہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر حج اور خانۂ خدا کی زیارت سے مربوط ہیں احکام یہ ہیں:

۱۔ سب سے پہلے اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ شعائر خداوندی کو نہ توڑو اور ان کی حُرمت کا خیال رکھو (یاایھا الذین اٰمنوا لا تحلوا شعائر اللہ)۔

اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے کہ شعائر اللہ سے کیا مراد ہے لیکن اس آیت کے دوسرے حصوں سے اس کی مناسبت سے اور اس کے سالِ نزول (دس ہجری) جو پیغمبر اکرمؐ کے حجۃ الوداع کا سال تھا، کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعائر سے مراد مناسک حج اور حج کا پروگرام ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سب کا احترام کریں اس تفسیر کا شاہد یہ ہے کہ قرآن میں لفظ شعائر عام طور پر مراسم حج کے بارے میں استعمال ہوا ہے[1]

۲۔ حرام مہینوں کا احترام کرو اور ان مہینوں میں جنگ وجدال سے احتراز کرو (و لا الشھر الحرام)۔

۳۔ وہ قربانیاں جو حج کے لیے لاتے ہو چاہے وہ نشانی کے بغیر (ھدی[2]) ہوں یا نشانی والی (قلائد[3]) ہوں، انھیں حلال نہ سمجھو اور انھیں رہنے دو کہ وہ قربان گاہ تک پہنچ جائیں اور وہاں قربان ہوں (و لا الھدی و لا القلائد)۔

۴۔ خانۂ خدا کے تمام زائرین کو ان عظیم اسلامی مراسم کے لیے پوری آزادی ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں افراد، قبائل، خاندانوں اور زبانوں کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے اس لیے جو لوگ خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، حتیٰ کہ جو تجارتی فائدے کے لیے زیارت بیت اللہ کے قصد سے آتے ہیں ان سے بھی کوئی مزاحمت نہ کی جائے چاہے وہ تمھارے دوست ہوں یا دشمن، بس اتنا کافی ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور خانۂ خدا کے زائر ہیں، یہی ان کے مامون ومحفوظ

---

[1] بقرہ ۱۵۸ اور حج ۳۲، ۳۶

[2] "ھدیٰ" جو "ھدیۃ" کی جمع ہے، اس کا مطلب ہے وہ چوپائے جو قربانی کے طور پر خانہ خدا کے لیے "اھداء" کیے جاتے ہیں۔

[3] "قلائد" جو "قلادۃ" کی جمع ہے، اس کا معنی ہے وہ چیز جو انسان یا کسی جانور کے گلے میں ڈالی جائے یہاں اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو مراسم حج میں قربانی کے لیے لائے جاتے ہیں اور ان پر کوئی علامت اور نشانی لگا دی جاتی ہے۔



ہونے کے لیے کافی ہے (ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلاً من ربھم و رضواناً)۔

بعض مفسرین اور فقہا کا نظریہ ہے کہ یہ جملہ عام ہے یہاں تک کہ غیر مسلموں پر بھی محیط ہے یعنی اگر مشرکین بھی خانہ خدا کی زیارت کے قصد سے آئیں تو ان کی بھی مزاحمت نہ کی جائے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سُورہ توبہ جس کے متعلق مشہور ہے کہ نو ہجری میں نازل ہوئی اس کی آیۃ ۲۸ میں مشرکین کے مسجد الحرام کی طرف آنے سے منع کیا گیا ہے اور سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ کی آخری عمر دس ہجری میں نازل ہوئی اور شیعہ سنی روایات کے مطابق اس کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں ہوا لہٰذا یہ تفسیر صحیح نہیں ہے اور حق یہی ہے کہ یہ حکم مسلمانوں سے مخصوص ہے۔

۵۔ شکار کی حرمت زمانہ احرام کے لیے ہے اس لیے فرمایا گیا ہے: جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمہارے لیے جائز ہے (و اذا حللتم فاصطادوا)۔

۶۔ زمانہ جاہلیت کے بت پرست (حدیبیہ کے موقع پر) خانہ خدا کی زیارت میں تم سے مزاحم ہوئے اور انہوں نے تمہیں خانہ خدا کی زیارت کے مناسک انجام نہیں دینے دیئے۔ اس واقعہ کو اس بات کا سبب نہیں بننا چاہیے کہ ان کے اسلام لے آنے کے بعد پرانی دشمنی کو زندہ کرو اور خانہ خدا کی زیارت میں ان کے لیے رکاوٹ بنو (و لا یجرمنکم شنئان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا)[1]

یہ حکم اگرچہ خانہ خدا کی زیارت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن حقیقت میں اس سے ایک عمومی قانون معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو کینہ پرور نہیں ہونا چاہیے اور جو حوادث گذشتہ دور میں گزر چکے ہوں انھیں اپنے ذہن پر سوار نہیں کرلینا چاہیے اور ان کے انتقام کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔

دیکھا جائے تو ہر معاشرے کے نفاق اور تفرقہ بازی کے علل و اسباب میں سے ایک یہی وجہ ہے یہ اسلامی حکم جو کہ اس وقت نازل ہوا جبکہ پیغمبر اسلامؐ کی حیات کا آفتاب آستانہ غروب پر تھا مسلمانوں کے درمیان نفاق کی آگ کو بھڑکنے سے روکنے کے لیے نازل ہوا۔ اس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۷۔ اس کے بعد بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: بجائے اس کے کہ تم اپنے پرانے دشمن اور موجودہ دوستوں سے انتقام کے لیے ایک ہو جاؤ۔ تمہیں چاہیے کہ نیکی اور تقویٰ کی راہ میں ایک دوسرے سے دستِ تعاون بڑھاؤ۔ نہ یہ کہ گناہ اور تجاوز میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگو (وتعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان)۔

۸۔ آیت کے آخر میں گذشتہ احکام کو محکم کرنے کے لیے اور ان کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیزگاری اختیار کرو اور حکم خدا کی نافرمانی سے بچو۔ کیونکہ خدا کا عذاب اور اس کی سزائیں بڑی سخت ہیں (و اتقوا اللہ ان اللہ

---

[1] اہل لغت اور مفسرین کے کلمات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ "جَرَم" (بروزن "کَرَم") اصل میں درخت سے غیر مناسب پھل توڑنے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ہر اس کام کے لیے استعمال ہونے لگا جو ناخوش آیند ہو نیز ناپسندیدہ کام کے لیے کسی کو اکسانے کے مفہوم میں بھی بولا جانے لگا۔ اس لیے یہاں "لا یجرمنکم" "لا یحملنکم" کے معنی میں ہے یعنی "تمہیں غلط کام پر نہ اکسائے"۔

شدید العقاب)۔

نیکی میں ساتھ دینا ضروری ہے

زیر نظر آیت میں تعاون کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اسلامی احکام کی ایک عمومی بنیاد ہے جو تمام اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس کے مطابق تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں لیکن باطل مقاصد، غلط اعمال اور ظلم وستم میں تعاون اور ہمکاری بالکل ممنوع ہے، چاہے ان کا مرتکب قریبی دوست یا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔

یہ اسلامی قانون بالکل اس قانون کے برعکس ہے جو زمانہ جاہلیت کے عرب میں بلکہ آج کے دور جاہلیت میں بھی رائج و حاکم ہے ــــ جاہلیت کا قانون یہ ہے کہ ــــ انصر اخاك ظالما او مظلوما ــــ

یعنی اپنے بھائی (یا دوست اور ہم پیمان) کی حمایت اور مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

اس زمانے میں اگر ایک قبیلے کے کچھ لوگ کسی دوسرے قبیلے کے بعض افراد پر حملہ کرتے تھے تو قبیلہ کے باقی افراد ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور اس تحقیق کی زحمت گوارا نہ کرتے کہ حملہ عادلانہ تھا یا ظالمانہ۔ یہ قانون بین الاقوامی سطح پر آج بھی حکم فرما ہے اور اکثر ایک معاہدے میں منسلک ممالک یا جن کے مفادات مشترک ہیں اہم عالمی معاملات میں ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں اور قانون عدالت کا بالکل پاس نہیں کرتے اور ظالم و مظلوم کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ اسلام نے اس قانون جاہلیت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے اسلام کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تعاون اور ہمکاری صرف نیک، اچھے اور اسلامی کاموں میں کرنا چاہیے نہ کہ گناہ، تعدی اور ظلم میں۔

یہ بات جالبِ نظر ہے کہ "برّ" اور "تقویٰ" دونوں الفاظ مندرجہ بالا آیت میں ایک ساتھ آئے ہیں ان میں سے ایک لفظ اثباتی پہلو رکھتا ہے جو کہ مفید افعال واعمال کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا لفظ نفی کا پہلو رکھتا ہے جو کہ غلط کاموں سے رک جانے کی طرف اشارہ ہے۔ گویا تعاون و ہمکاری نیکیوں کی طرف دعوت دینے میں بھی ہونا چاہیے اور برائیوں کا مقابلہ کرنے میں بھی۔

فقہ اسلامی میں اس قانون سے حقوق سے متعلق مسائل معلوم کیے جاتے ہیں۔ اسی کی مدد سے چند ایک ایسے معاملات اور تجارتی معاہدوں کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ جو گناہ کی کمک اور مدد کا پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً شراب سازی کے کارخانے کے لیے انگور بیچنا یا حق وعدالت کے دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا یا کام کی کسی جگہ کو غیر شرعی اور خلافِ شریعت معاملات اور کاروبار کے لیے کرایے پر دینا (البتہ ان احکام کے بارے میں کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں بیان کی گئی ہیں)۔

اگر یہ اسلامی بنیاد تمام معاشروں میں فراہم ہو جائے اور لوگ شخصی، نسلی اور قرابتی تعلق کو پیش نظر رکھے بغیر ان لوگوں کا ساتھ دیں جو مثبت اور اصلاحی کاموں کے لیے قدم بڑھاتے ہیں اور ظالم اور تجاوز کرنے والے لوگ چاہے کسی طبقے سے ہوں ان کا ساتھ نہ دیں تو بہت سی اجتماعی خرابیاں اور مشکلیں دور ہو جائیں۔ اسی طرح اگر دنیا کی حکومتیں بین الاقوامی سطح پر ظالم اور تجاوز کرنے والے



شخص یا حکومت سے تعاون نہ کریں تو تعدی، تجاوز، زیادتی، استعمار اور استثمار دنیا سے ختم ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض حکومتیں تجاوز کرنے والوں اور ستم گروں کی حمایت کرنے لگتی ہیں اور ان سے مفادات رکھنے والے کھلے بندوں انھیں حمایت کا یقین دلاتے ہیں لہٰذا موجودہ حالات میں بہتری کی توقع نہیں کی جانا چاہیے۔

اسلامی روایات میں اس سلسلے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند ایک روایات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

اذا کان یوم القیٰمة نادی مناد این الظلمة؟ واعوان الظلمة؟ واشباه الظلمة؟ حتی من بری لهم قلمًا ولاق لهم دواتًا، قال، فیجتمعون فی تابوت من حدید ثم یرمی بهم فی جهنم۔

جب قیامت بپا ہو گی تو منادی ندا کرے گا:

کہاں ہیں ظالم؟

کہاں ہیں ظالموں کے مددگار؟

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو ظالموں سے مشابہ بنایا تھا؟

حتّٰی کہ ان لوگوں کو بھی پکارا جائے گا جنھوں نے ان ظالموں کے لیے قلم تراشا یا ان کی دوات میں صوف ڈالا [1] —— ان سب کو لوہے کے ایک صندوق میں ڈال کر اکٹھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا [2]

۲۔ صفوان جمال، امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کے اصحاب میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں: میں آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے فرمایا: تمھارے تمام کام اچھے ہیں سوائے ایک کام کے۔

میں نے عرض کیا: آپ پر قربان جاؤں وہ کون سا کام ہے؟

امامؑ نے فرمایا: تو اپنے اونٹ اس شخص (یعنی ...... ہارون) کو کرایہ پر دیتا ہے۔

میں نے عرض کیا: بخدا عیاشی، ہوس بازی اور حرام شکار کے لیے تو کرایہ پر نہیں دیتا، صرف اس (مکّہ کے) سفر کیلیے دیتا ہوں۔ پھر میں خود بھی اونٹوں کے ساتھ نہیں جاتا اپنے کسی بیٹے یا کسی اور شخص کو ان کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

امامؑ نے فرمایا: صفوان! کیا ان سے کرایہ لیتے ہو؟

میں نے عرض کیا: جی ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اس وقت تک زندہ رہیں اور اپنے منصب پر باقی رہیں جب تک تمھارا کرایہ ادا نہ کریں۔

---

[1] "لیقہ" عربی زبان میں کپڑے کے اس ٹکڑے یا ریشم کی روئی کو کہتے ہیں، جو دوات میں ڈالی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے اندر سیاہی کو جذب کرلے اور اسے بہہ جانے سے روکے۔

[2] وسائل الشیعہ، جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۱



میں نے کہا: جی ہاں۔

آپ نے فرمایا: جو ان کی بقاء کی خواہش رکھے وہ انھی میں سے ہے اور جو ان میں سے ہو وہ جہنم کی آگ میں جائے گا۔

صفوان کہتے ہیں: میں فوراً گیا اور اپنے تمام اونٹ بیچ ڈالے۔ یہ خبر ہارون کو ہوئی تو اس نے مجھے بلوا بھیجا اور مجھ سے کہنے لگا: صفوان! میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے اونٹ بیچ ڈالے ہیں۔

میں نے کہا: میں بوڑھا ہوگیا ہوں، میرے بیٹے اور دوسرے لوگ ان کی صحیح دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔

ہارون بولا: یہ بات نہیں۔ میں جانتا ہوں تمھیں کس شخص نے اس کا حکم دیا ہے، ہاں موسیٰ بن جعفرؑ نے تمھیں یہ حکم دیا ہے۔

میں نے کہا: میرا موسیٰ بن جعفرؑ سے کیا واسطہ؟

ہارون بولا: چھوڑو اس بات کو۔ واللہ تمھاری گذشتہ نیکیاں نہ ہوتیں تو میں تمھاری گردن اڑانے کا حکم دیتا۔[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

یا علی کفر باللہ العلی العظیم من ھذہ الامۃ عشرۃ .... و بایع السلاح من اھل الحرب۔

اے علی! اس اُمت کے دس گروہ خدا کے منکر ہوگئے ہیں .... اور ایک وہ ہے جو اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچتا ہے جبکہ وہ مسلمانوں سے حالت جنگ میں ہوں۔[2]

۳۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ
اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا
أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۚ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا
بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا
تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۱، صفحہ ۱۳۲

۲۔ وسائل الشیعہ ج ۱۲ صفحہ ۷۱،



فِیْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۳۔ مُردار کا گوشت، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح ہوں، وہ جانور جن کا گلا گھونٹ دیا جائے اور تشدّد کر کے انھیں مار دیا جائے، وہ جانور جو بلندی سے گر کر مر جائیں، وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مرجائیں اور درندہ جانور کے شکار کا باقی ماندہ مگر یہ کہ (بر موقع اس جانور کے پاس جا پہنچیں اور اسے ذبح کرلیں اور وہ جانور جو کسی بُت کے اوپر (یا اس کے سامنے) ذبح کیے جائیں (سب کے سب) تم پر حرام ہیں اور (اسی طرح) قسمت آزمائی کے لیے مخصوص تیر کی لکڑیوں سے جانور کا گوشت تقسیم کرنا۔ یہ تمام اعمال فسق اور گناہ ہیں۔ آج کے دن کفار تمھارے دین (کے زوال) سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے (میری مخالفت سے) ڈرو۔ آج کے روز میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے لیے (ہمیشہ رہنے والے) دین کے طور پر قبول کر لیا لیکن وہ لوگ کہ بھوک کی حالت میں جن کا ہاتھ کسی اور کھانے تک نہ پہنچے اور وہ گناہ کی طرف مائل بھی نہ ہوں (تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ ممنوع گوشت میں سے کھالیں) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

اس سُورہ کی ابتداء میں چوپایوں کا گوشت حلال ہونے کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں جن کے بارے میں استثناء ہے ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ زیرِ بحث آیت میں دراصل وہی استثنائی حکم ہے جس کے بارے میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں گیارہ چیزوں کے حرام ہونے کا ذکر ہے ان میں سے بعض کے حرام ہونے کا حکم قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی آیا ہے یہاں ان کا تکرار تاکید کے طور پر ہے۔

۱۔ پہلے فرماتا ہے: مردار تم پر حرام کیا گیا ہے (حرمت علیکم المیتة)۔

۲۔ اسی طرح خون بھی حرام ہے (و الدم)۔

۳۔ سؤر کا گوشت بھی حرام ہے (و لحم الخنزیر)۔

۴۔ اور وہ جانور جو زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق بتوں کے نام پر اور اصولی طور پر غیر خدا کے نام پر ذبح کیے جائیں،



ان کا گوشت بھی حرام ہے (وما اھل لغیر اللہ بہ)۔

ان چار چیزوں کی تحریم اور اس کے فلسفہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں (اردو ترجمہ ص ۴۱۴)۔

۵۔ نیز وہ جانور بھی کہ جن کا گلا گھونٹ دیا جائے، حرام ہیں۔ چاہے خود بخود ایسا ہو یا پھندے کے سبب ہو یا کوئی انسان ایسا کام انجام دے (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ بعض اوقات کسی جانور کو دو لکڑیوں یا درخت کی دو شاخوں میں سختی سے دباتے تھے یہاں تک کہ وہ مر جاتا تھا اور پھر اس کا گوشت استعمال کرتے تھے) (والمنخنقۃ)۔

بعض روایات میں ہے کہ خاص طور پر مجوسی ایسا کرتے تھے کہ جانور کا گلا گھونٹ کر مارتے اس کے بعد اس کا گوشت کھاتے لہٰذا ممکن ہے کہ آیت کا ان کے اس طریقے کی طرف بھی اشارہ ہو۔[1]

۶۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو تشدّد اور مار پیٹ سے مر جائیں یا بیماری کی وجہ سے مر جائیں (والموقوذۃ)۔[2]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ عربوں میں رواج تھا کہ وہ بعض جانوروں کو بتوں کی خاطر اس قدر مارتے کہ وہ مر جاتے، اور وہ اسے ایک طرح کی عبادت سمجھتے تھے۔[3]

۷۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو بلندی سے گر کر مر جائیں (والمتردیۃ)۔

۸۔ نیز وہ جانور جو سینگ مارنے سے مر جائیں ان کا گوشت بھی حرام ہے (والنطیحۃ)۔

۹۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو درندوں کے حملے کی وجہ سے مر جائیں (وما اکل السبع)۔

ان آخر والے پانچ قسم کے جانوروں کے گوشت کی حرمت کا ایک فلسفہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان سے کافی مقدار میں خون نہیں نکلتا۔ کیونکہ جب تک گردن کی اصلی رگیں نہ کاٹی جائیں اس وقت تک خون کی کافی مقدار نہیں نکلتی اور ہم جانتے ہیں کہ خون طرح طرح کے جراثیم کا مرکز ہوتا ہے اور جانور کے مرتے ہی سب سے پہلے خون میں بدبو پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے گوشت میں ایک طرح کا زہریلا پن زیادہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ذبح کرنے میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور قبلہ رُو ہو کر ذبح کیا جاتا ہے اس طرح سے جو معنوی پہلو پیدا ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا صورتوں میں نہیں ہے۔

لیکن اگر جانور کے مرنے سے پہلے ان تک پہنچ جائیں اور آداب اسلامی کے مطابق اسے ذبح کر لیں اور اس کا خون کافی مقدار میں نکل آئے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ اسی لیے مندرجہ بالا مواقع کی حرمت کے بعد فرمایا گیا ہے: (الا ما ذکیتم)۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ استثناء صرف آخری قسم یعنی "وما اکل السبع" کے بارے میں ہے، لیکن اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ تمام قسموں کے بارے میں ہے اور یہی بات زیادہ قرین حقیقت ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ۔ ج ۱۶ صفحہ ۲۷۲

[2] "موقوذۃ" کا مادہ ہے "وقذ" (بروزن "نقض") یہ ایسی سخت مار پیٹ کے معنی میں ہے جو موت تک پہنچا دے یا سخت بیماری جو جانور کو موت کے کنارے لے جائے بعض اوقات ایسا تشدد اور ایسی بیماری کو بھی "وقذ" کہتے ہیں جو موت تک نہ پہنچائے بہرحال اس آیت میں پہلا معنی ہی مراد ہے۔

[3] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



ممکن ہے سوال کیا جائے کہ جب آیت کی ابتداء میں " میتۃ " کہہ دیا گیا ہے تو پھر ان مواقع کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اور کیا یہ سب " میتۃ " کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہی اور شرعی لحاظ سے " میتۃ " کا ایک وسیع مفہوم ہے اس لحاظ سے جو بھی حیوان شرعی طریقے سے ذبح نہ ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن لغت میں عموماً " میتۃ " اس جانور کو کہتے ہیں جو خود بخود مر جائے اس لیے مندرجہ بالا مواقع " میتۃ " کے لغوی معنی میں داخل نہیں ہیں اور نہیں تو کم از کم اس کا احتمال ہے کہ داخل نہ ہوں ۔ لہٰذا ان کی صراحت کی ضرورت تھی ۔

۱۰۔ زمانہ جاہلیت میں بت پرستوں نے کچھ پتھر خانہ کعبہ کے گرد نصب کر رکھے تھے ان کی کوئی خاص شکل و صورت نہ تھی ۔ انھیں " نصب " کہتے تھے ۔ ان کے سامنے قربانی کرتے تھے اور قربانی کا خون ان پر مل دیتے تھے ان کے اور دیگر بتوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ دیگر بتوں کی کوئی مخصوص شکل ہوتی تھی لیکن " نصب " کی کوئی خاص صورت نہ ہوتی تھی ۔ اسلام نے زیر نظر آیت میں ایسی قربانی کے گوشت کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے (و ما ذبح علی النصب) واضح ہے کہ ایسے گوشت کی حرمت اخلاقی اور معنوی پہلو رکھتی ہے نہ کہ مادی اور جسمانی ۔ درحقیقت یہ " و ما اھل لغیر اللہ بہ " کی اقسام میں سے ہے ۔

۱۱۔ جانوروں کی ایک اور طرح کی حرمت بھی زیر نظر آیت میں آئی ہے اور وہ ہے قسمت آزمائی کے طور پر ذبح ہونے والے جانور ۔ ہوتا یہ تھا کہ دس آدمی آپس میں شرط لگاتے تھے اور ایک جانور خرید کر اسے ذبح کر دیتے تھے پھر تیر کی دس لکڑیاں جن میں سے سات پر " کامیاب " اور تین پر " ناکام " لکھا ہوتا تھا ایک مخصوص تھیلے میں رکھ دیتے تھے پھر قرعہ اندازی کی صورت میں ان دس آدمیوں میں سے ایک ایک کے نام پر ایک تیر باہر نکالتے جن سات لکڑیوں پر " کامیاب " لکھا ہوتا وہ جس جس کے نام نکلتیں اسے دے دیتے اور وہ گوشت کا ایک حصّہ اٹھا لیتا اور اسے اس کے بدلے کچھ نہ دینا پڑتا ۔ دوسری طرف وہ تین افراد جن کے نام " ناکام " والی لکڑیاں نکلتیں ان میں سے ہر ایک کے لیے لازمی ہوتا کہ وہ اس جانور کی ایک تہائی قیمت ادا کرے ، جبکہ گوشت کا بھی اسے کوئی حصّہ نہ ملتا ۔ ان لکڑیوں کو " ازلام " کہتے ہیں ۔ " ازلام " " زلم " (بروزن " قلم ") کی جمع ہے ۔ اسلام نے ایسے گوشت کا کھانا حرام قرار دے دیا ۔ یہ حرمت اس بنا پر نہیں کہ اصل گوشت حرام ہے بلکہ اس لیے کہ یہ کام قماربازی اور قسمت آزمائی (لاٹری وغیرہ) کا پہلو لیے ہوئے ہے قرآن فرماتا ہے : و ان تستقسموا بالازلام ۔

واضح ہے کہ قماربازی وغیرہ کی حرمت جانوروں کے گوشت سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر صورت میں قماربازی ممنوع ہے اور اس کے مفہوم میں تمام نقصان دہ امور ، بے مقصد کام اور بیہودہ پروگرام شامل ہیں آخر میں ان احکام حرمت کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے : یہ تمام احکام فسق ہیں اور اطاعت پروردگار کی حدود سے خارج ہیں (ذٰلکم فسق)[1]

---

[1] ذٰلکم اگرچہ اسم اشارہ مفرد ہے کہ جس میں خطاب جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے اور قاعدۃً اسے مفرد کی طرف لوٹنا چاہیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ مفرد اشارہ اس مجموعے کے لیے جو مفرد فرض کیا گیا ہو ، کوئی اشکال نہیں رکھتا ۔



گوشت کے استعمال میں اعتدال

مندرجہ بالا تمام بحث سے اور دیگر اسلامی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ گوشت سے استفادہ کے بارے میں اسلام کی روش اس کے دیگر احکام کی طرح اعتدال پر مبنی ہے۔ نہ زمانہ جاہلیت کی طرح ہے کہ وہ تو گوہ، مردار، خون وغیرہ سب کھا جاتے تھے، نہ آج کے بہت سے مغربی ممالک کی طرح ہے جہاں کے لوگ کیکڑا اور کیڑے مکوڑے تک کھانے سے نہیں کتراتے اور نہ ہی اسلام کا طریقہ ہندوؤں کا سا ہے جنھوں نے گوشت کھانا مطلقاً ممنوع قرار دے رکھا ہے بلکہ ان جانوروں کا گوشت کھانا حلال قرار دیا ہے جن کی غذا پاک ہے اور جو باعث تنفر نہیں ہیں اور افراط و تفریط کے راستے پر خط البطلان کھینچ دیا ہے اور مختلف قسم کا گوشت کھانے کے لیے شرائط معین کردی ہیں جو اس طرح ہیں:

۱۔ جن جانوروں کا گوشت استعمال کیا جاسکتا ہے انھیں گھاس خور ہونا چاہیے کیونکہ گوشت خور جانوروں کا گوشت مردار اور گندگی سے آلودہ گوشت کھانے کے نتیجے میں عموماً صحیح سالم نہیں رہتا اور طرح طرح کی بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس گھاس کھانے والے چوپائے عام طور پر صحیح اور پاک چیزوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ سورۂ بقرہ آیہ ۲، کی تفسیر میں کہا جاچکا ہے کہ ہر جانور کی صفات اس کے گوشت کے ذریعے اسے کھانے والے تک منتقل ہوجاتی ہیں۔

اس لیے درندوں کا گوشت کھانے سے انسان میں قساوت اور درندگی کی صفت کو تقویت پہنچے گی اسی لیے اسلام نے نجاست خور جانوروں کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ وہ جانور جن کے گوشت سے استفادہ کیا جائے وہ قابلِ نفرت نہ ہوں۔

۳۔ ایسے جانور بھی نہ ہوں جو انسانی روح یا جسم کے لیے نقصان اور ضرر کا باعث ہوں۔

۴۔ ایسے جانور جو شرک اور بت پرستی وغیرہ کی راہ میں قربان کیے جائیں چونکہ وہ روحانی اور معنوی لحاظ سے ناپاک ہیں اس لیے انھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ اسلام میں کچھ احکام جانوروں کو ذبح کرنے کے طریقے کے بارے میں بھی ہیں۔ ان میں سے ہر حکم کے اپنے فوائد یا اخلاقی اثرات ہیں۔

مندرجہ بالا احکام کے بعد زیر بحث آیت میں دو معنی خیز جملے نظر آتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے: آج کے دن کافر تمھارے دین سے مایوس ہوگئے ہیں لہٰذا اب ان سے نہ ڈرو اور صرف میری مخالفت سے ڈرو (الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون)۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: آج کے دن میں نے تمھارے دین اور آئین کو کامل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور اسلام کو تمھارے دین کے طور پر قبول کرلیا (الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینًا)۔



دین کس روز اپنے کمال کو پہنچا

یہاں ایک اہم بحث سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ " الیوم " (یعنی... آج کا دن) جس کا مندرجہ بالا آیت کے دو جملوں میں ذکر ہے، کون سا دن ہے؟ یعنی وہ کون سا دن ہے جس میں یہ چار پہلو جمع ہو گئے۔

۱۔ کفار اس روز مایوس ہو گئے
۲۔ دین اس دن مکمل ہو گیا۔
۳۔ نعمتِ الٰہی تمام ہو گئی اور
۴۔ خداوندِ عالم نے دینِ اسلام کو پورے عالم کے لوگوں کے لیے آخری دین کے طور پر قبول کر لیا۔

مفسرین میں اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے لیکن جس بات میں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ ایسا دن پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں بہت اہم ہونا چاہیے اور یہ کہ یہ کوئی عام سا اور معمولی دن نہیں ہو سکتا کیونکہ اتنی اہمیت کسی عام دن کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ایک روایات میں آیا ہے کہ بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ ایسی آیت اگر ہماری آسمانی کتب میں ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن قرار دیتے ہیں[1]

ہمیں چاہیے کہ ہم قرائن، نشانیوں، آیت اور سورت کے نزول کی تاریخ، پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کی تاریخ اور مختلف اسلامی منابع کی روایات سے اس اہم دن کو تلاش کریں۔ کیا اس سے مراد وہ دن ہے جس دن حلال و حرام گوشت کے بارے میں مندرجہ بالا احکام نازل ہوئے تھے، قطعاً ایسا نہیں ہے۔ ان احکام کا نزول اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہے اور نہ ہی یہ تکمیل دین کا باعث ہے۔ یہ پیغمبرِ اسلامؐ پر نازل ہونے والے آخری احکام بھی نہ تھے کیونکہ اس سورت کے آخر میں کچھ اور احکام بھی دکھائی دیتے ہیں اور پھر ان احکام کا نزول کفار کی ناامیدی کا سبب بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بات جو کفار کی مایوسی کا سبب بن سکتی ہے، وہ اسلام کے مستقبل کے لیے کوئی محکم بنیاد اور سہارا ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے احکام کا نزول کفار کے جذبات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا کہ ایک طرح کا گوشت حرام ہو اور دوسری طرح کا حلال۔ اس سے ان میں کوئی خاص حساسیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

کیا اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے حجۃ الوداع کے عرفہ کا دن ہے (جیسا کہ مفسرین کے ایک گروہ نے احتمال بھی ظاہر کیا ہے)؟

اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ مذکورہ بالا نشانیاں اس دن پر بھی منطبق نہیں ہو سکتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا کہ جو کفار کی مایوسی کا باعث ہو سکے۔ اگر اس سے مراد مسلمانوں کا عظیم اجتماع ہے تو وہ روز عرفہ سے پہلے بھی مکہ میں خدمتِ پیغمبرؐ میں تھا اور اگر اس دن مذکورہ بالا احکام کا نزول مراد ہے تو بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کفار کے لیے کوئی گھبرانے والی بات نہ تھی۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۱۵۵



تو کیا اس سے فتح مکہ کا دن مراد ہے (جیسا کہ بعض کا خیال ہے)، جب کہ اس سورہ کے نزول کا زمانہ فتح مکہ سے بہت ہی بعد کا ہے۔

یا کیا سورۂ برأت کی آیات کے نزول کا دن ہے؟ تو وہ بھی اس سورہ کے نزول سے کافی مدت پہلے تھا۔

سب سے زیادہ عجیب احتمال یہ ہے جو بعض نے ظاہر کیا ہے کہ اس دن سے مراد ظہور اسلام یا بعثتِ پیغمبرؐ کا دن ہے، جبکہ ان دونوں کا اس آیہ کے نزول کے دن سے کوئی ربط نہیں ہے اور ان کے درمیان ایک طویل مدت حائل ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا چھ احتمالات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو آیت سے آہنگ اور مفہوم سے مناسبت رکھتا ہو۔

(اس آیت کے سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ہے جو تمام شیعہ مفسرین نے اپنی کتب میں پیش کیا ہے، متعدد روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ نیز آیت کے مضامین اور آہنگ بھی اس سے مناسبت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد غدیر خم کا دن ہے، جس روز پیغمبر اسلامؐ نے امیر المومنین حضرت علیؑ کو باقاعدہ اپنی جانشینی کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہی وہ روز تھا جب کفار مایوسیوں کے سمندر میں ڈوب گئے، کیونکہ انھیں توقع تھی کہ دینِ اسلام کا قیام بس ایک شخص سے مربوط ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے بعد صورتِ حال پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آئے گی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ایک ایسا شخص پیغمبرؐ کی جانشینی کے لیے منتخب ہوا ہے جو علم و تقویٰ اور قدرت و عدالت کے لحاظ سے پیغمبر اسلامؐ کے بعد بے نظیر ہے اور آنحضرتؐ نے لوگوں سے اس کی بیعت لے لی ہے تو وہ اسلام کے بارے میں یاس و ناامیدی کا شکار ہو گئے وہ سمجھ گئے کہ اس دین کی جڑیں مضبوط اور پائیدار ہیں۔ یہ وہ دن تھا جب دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا، کیونکہ جانشینِ پیغمبرؐ کے تعین اور مسلمانوں کا مستقبل واضح ہوئے بغیر یہ آخری تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ وہ دن تھا جب نعمتِ الٰہی علیؑ جیسے لائق رہبر کے تعین کے ذریعے لوگوں کے مستقبل کے لیے تمام ہو گئی۔ اسی دن اسلام اپنے پروگرام کی تکمیل کے ذریعے آخری دین کے طور پر خدا کی طرف سے پسندیدہ قرار پایا۔

لہٰذا اس میں چاروں مذکورہ پہلو موجود تھے۔

علاوہ ازیں ذیل کے قرائن بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے، کہ اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اکرمؐ اکیاسی دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات اہلسنّت کے مطابق اور حتیٰ کہ بعض شیعہ روایات کی بناء پر (جیسا کہ کلینی نے اپنی مشہور کتاب کافی میں نقل کیا ہے) رسولِ اکرمؐ کی وفات بارہ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت کے نزول کا دن ٹھیک اٹھارہ ذی الحجہ ہے [1]

---

[1] البتہ یہ اس صورت میں ہے جب خود روزِ وفاتِ پیغمبرؐ اور روزِ غدیر کو شمار نہ کیا جائے۔ نیز تین مہینوں میں یکے بعد دیگرے ہر مہینہ ۲۹ دن کا ہو اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روزِ غدیر سے پہلے اور بعد تاریخ اسلام میں کوئی ایسا اہم واقعہ رونما نہیں ہوا جس پر مندرجہ بالا تاریخ منطبق ہو سکے۔ اس لیے حتماً غدیر کے علاوہ اس سے کوئی اور دن مراد نہیں۔



ب۔ بہت سی روایات جو مشہور شیعہ سنی طرق سے منقول ہیں صریحاً یہ مطلب برآمد ہوتا ہے کہ زیر بحث آیۂ شریفہ غدیرِ خم کے روز اور ولایت حضرت علیؑ کے اعلان کے بعد نازل ہوئی ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ مشہور سنی عالم ابن جریر طبری کتاب ولایت میں معروف صحابی زید بن ارقم کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے دن حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ حافظ ابونعیم اصفہانی اپنی کتاب "ما نزل من القرآن فی علیؑ" میں مشہور صحابی ابوسعید خدری سے نقل کرتے ہیں:۔

پیغمبر خداؐ نے غدیرِ خم کے دن لوگوں سے حضرت علیؑ کا تعارف، ان کی ولایت کے حوالے سے کروایا اور لوگ ابھی منتشر نہیں ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی:

الیوم اکملت لکم دینکم ۔۔۔۔۔۔

اس موقع پر رسول اللہؐ نے فرمایا:

اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمۃ و رضی الرب برسالتی و بالولایۃ لعلی (ع) من بعدی، ثم قال، من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ۔

یعنی ــــــ اللہ اکبر ــــــ دین کی تکمیل پر اور نعمت تمام ہونے پر اور پروردگار کے میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر راضی اور خوش ہونے پر۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

جس شخص کا میں مولا ہوں، اس کا علیؑ مولا ہے، خدایا! اسے دوست رکھ، جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ جو اس کی مدد کرے اس کی مدد کر اور جو اسے چھوڑ دے تو بھی اسے چھوڑ دے۔

۳۔ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں وہ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں:

واقعہ غدیرِ خم، ولایتِ علیؑ کے عہد و پیمان اور عمرؓ کے "بخ بخ یا ابن ابی طالب اصبحت مولای و مولا کل مسلم"[1] کہنے کے بعد آیہ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی[2]

---

[1] حضرت عمرؓ کی اس بات کا مطلب ہے: کیا کہنے اے فرزند ابوطالب! آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے۔

[2] ان تین روایات کو علامہ امینی مرحوم نے تمام خصوصیات کے ساتھ "الغدیر" کی جلد اول میں ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ میں نقل کیا ہے اور کتاب الحق ج ۶ ص ۳۵۳ میں اس آیت کا واقعہ غدیر میں نازل ہونا ابوہریرہ سے دو طرق کے ساتھ اور ابوسعید خدری سے کئی طرق سے نقل کیا گیا ہے۔



کتاب نفیس الغدیر میں مذکورہ تین روایات کے علاوہ اس سلسلے میں مزید تیرہ روایات نقل کی گئی ہیں۔

کتاب احقاق الحق میں تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۴ اور مقتل خوارزمی صفحہ ۴۷ کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ یہ آیت واقعہ غدیر کے بارے میں نازل ہوئی۔

تفسیر بُرہان اور تفسیر نور الثقلین میں بھی مختلف طرق سے اس سلسلے میں دس روایات نقل ہوئی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں یا غدیر خم کے دن کے بارے میں نازل ہوئی۔

ان سب روایات کو نقل کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے[1]

علامہ سید شرف الدین مرحوم کتاب المراجعات میں لکھتے ہیں:

امام صادقؑ اور امام باقرؑ سے منقول صحیح روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی اہلِ سنت نے بھی رسول اللہؐ سے اس سلسلے میں مختلف اسناد سے چھ روایات نقل کی ہیں جو اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے ضمن میں نازل ہوئی۔[2]

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ زیرِ نظر آیت کے واقعہ غدیر کے سلسلے میں نازل ہونے کے بارے میں موجود روایات ایسی نہیں ہیں کہ انھیں خبرِ واحد کہا جا سکے اور ان کی بعض اسناد کو ضعیف قرار دے کر ان سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اگر یہ روایات متواتر نہ ہوں تو کم از کم مستفیض ہیں اور مشہور اسلامی منابع اور کتب میں منقول ہیں۔ اگرچہ بعض متعصب سنی حضرات چونکہ ان روایات کو اپنے ذوق کے خلاف پاتے ہیں لہٰذا انھیں مجہول اور غلط قرار دیتے ہیں۔ مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں صرف ایک سند کو ضعیف قرار دے کر کوشش کی ہے کہ باقی روایات کو نظر انداز کر دے یا مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف آیت کی ایک عام تفسیر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان روایات کی طرف ذرا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ شاید وہ اس مخمصے میں تھے کہ اگر روایات کا ذکر کر کے انھیں ضعیف قرار دیں تو خلافِ انصاف ہوگا اور اگر قبول کر لیں تو خلافِ ذوق ہوگا۔

ایک جالبِ نظر نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن حکیم سورۂ نور آیہ ۵۵ میں کہتا ہے۔

وعد اللّٰہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم و لیمکنن لہم دینہم الذی ارتضٰی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنًا۔

تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین پر خلیفہ بنا دے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا ہے (نیز یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ) جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اسے محکم و مستقر کریگا

---

[1] تفسیر بُرہان جلد اوّل اور تفسیر نور الثقلین جلد اوّل میں زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

[2] المراجعات جلد چہارم صفحہ ۳۰



اور خوف کے بعد انھیں امن دے گا۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دین ان کے لیے "پسند" کیا ہے اسے روئے زمین پر مستقر اور محکم کرے گا۔ یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ سورہ نور، سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور " رضیت " " لکم الاسلام دینا " کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت میں ولایت علی کے بارے میں نازل ہوا ہے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام اس صورت میں روئے زمین پر مستحکم ہو سکتا ہے جب " ولایت " کے ساتھ منسلک اور توام ہو۔ کیونکہ یہ وہی اسلام ہے جسے خدا نے "پسند" کیا ہے اور اس کے استقرار و استحکام کا وعدہ کیا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اسلام اسی صورت میں عالمگیر ہو سکتا ہے جب وہ ولایت اہل بیتؑ کے مسئلے سے جدا نہ ہو۔

سورۂ نور کی مذکورہ آیت اور زیر بحث آیت کو منضم کرنے سے جو دوسرا مطلب سامنے آتا ہے یہ ہے کہ سورۂ نور کی آیت میں باایمان افراد سے تین وعدے کیے گئے ہیں۔

پہلا۔ روئے زمین پر خلافت

دوسرا۔ عبادت پروردگار کے لیے امن و امان اور

تیسرا۔ اس دین کا استحکام کہ جو خدا کا پسندیدہ ہے۔

یہ تین وعدے غدیر خم کے روز آیہ ـــــ الیوم اکملت لکم دینکم ـــــ کے نزول کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے، کیونکہ ایمان و عمل صالح کا کامل نمونہ یعنی ـــــ علیؑ، رسول اللہؐ کی جانشینی کے لیے منصوب اور مقرر ہوئے اور " الیوم یئس الذین کفروا من دینکم " کے ذریعے مسلمانوں کو نسبتاً امن نصیب ہوا نیز " و رضیت لکم الاسلام دینا " کے ذریعے پروردگار کا پسندیدہ دین مسلمانوں میں مستحکم ہوا۔

البتہ یہ تفسیر ان روایات کے منافی نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ سورۂ نور کی یہ آیت حضرت مہدیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے کیونکہ " اٰمنوا منکم " کا ایک وسیع مفہوم ہے جس کا ایک نمونہ غدیر خم کے دن انجام پایا اور پھر ایک وسیع تر سطح پر حضرت مہدیؑ کے قیام کے وقت انجام پائے گا۔ اس بنا پر " الارض " آیت میں تمام کرۂ زمین کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا بھی ایک عمومی مفہوم ہے۔ یعنی تمام زمین کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ایک حصے کے لیے بھی، جیسا کہ قرآن میں مختلف مواقع پر اس لفظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ زمین کے ایک حصے کے لیے ہے اور بعض اوقات پورے کرۂ ارض کے لیے (غور کیجئے گا)۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

آیت کے سلسلے میں صرف ایک سوال اب باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اول تو مذکورہ بالا اسناد اور آیہ " یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک " کے ذیل میں پیش کی جانے والی اسناد کے مطابق دونوں آیات واقعہ غدیر سے مربوط ہیں تو پھر ان دونوں کے درمیان فاصلہ کیوں رکھا گیا ہے۔ ایک سورہ مائدہ کی تیسری آیت ہے اور دوسری آیت کا نمبر ۶۷ ہے۔



دوسری بات یہ ہے کہ آیت کا یہ حصّہ جو واقعہ غدیر سے مربوط ہے، ایسے مطالب سے منسلک کیا گیا ہے جو حلال و حرام گوشت کے بارے میں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔[1]

اس کا جواب یہ ہے:

اوّلاً۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآنی آیتیں اور اسی طرح سورتیں تاریخِ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں بلکہ مدینہ میں نازل ہونے والی بہت سی سورتوں میں مکی آیات ہیں اور اس کے برعکس مکی سورتوں میں مدنی آیتیں موجود ہیں۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان دو آیات کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے (البتہ ہر سورت کی آیات کو فرمانِ پیغمبرؐ کے تحت رکھا گیا ہے) ہاں البتہ آیات اگر تاریخِ نزول کے مطابق جمع کی گئی ہوتیں پھر یہ فاصلہ ہوتا تو اعتراض کیا جا سکتا تھا۔

ثانیاً۔ ممکن ہے کہ غدیر سے مربوط آیت کو حلال و حرام غذاؤں سے متعلق آیت میں تحریف، حذف اور تغیّر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفیس چیز کو محفوظ رکھنے کیلئے عام سی چیزوں میں ملا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی طرف کم توجہ ہو (غور کیجئے گا)۔

وہ حوادث جو رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری لمحات میں رونما ہوئے اور بعض افراد نے آپ کی طرف سے وصیت نامہ لکھے جانے کی صریح مخالفت کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ (نعوذ باللہ) حتیٰ کہ رسولِ خدا کے بارے میں کہا گیا کہ انھیں ہذیان ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ سب باتیں بیماری کے عالم میں کر رہے ہیں۔ رسولِ اکرمؐ کو ایسی ایسی ناموزوں تہمتیں لگائی گئیں۔ اس واقعے کی تفصیل اسلامی دنیا کی مشہور کتب میں موجود ہے اور سنی شیعہ دونوں کی اہم کتب میں یہ واقعہ مذکور ہے۔[2] یہ واقعہ اس سلسلے میں شاہدِ ناطق ہے کہ بعض لوگ مسئلہ خلافت اور رسول اللہؐ کی جانشینی کے معاملے میں بہت حساس تھے اور وہ اس کے انکار کے لیے ہر انتہائی قدم اٹھانے کو تیار تھے۔

تو کیا ایسے حالات میں ضروری نہیں تھا کہ خلافت سے مربوط اسناد کی حفاظت کی جاتی اور انھیں آنے والے لوگوں تک بحفاظت پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا اور اسے عام مطالب کے ساتھ ملا کر بیان کیا جاتا تاکہ زیادہ سخت مخالفین کی ان پر کم توجہ ہو۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ اس بات سے متعلق کہ "الیوم اکملت لکم دینکم" کے غدیر اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی کے متعلق نزول سے مربُوط اسناد صرف شیعہ کتب میں موجود نہیں ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض ہو بلکہ اہلِ سنّت کی بہت سی کتب میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔ ان میں یہ حدیث مختلف طرق سے تین مشہور صحابہ سے بھی منقول ہے۔

---

[1] یہ سوال تفسیر المنار میں اس آیت سے مربوط مباحث میں اشارتاً مذکور ہے (جلد ۶ صفحہ ۴۰۶)

[2] یہ حدیث اہلِ سنت کی مشہور ترین کتاب صحیح بخاری میں کئی مقامات پر نقل ہوئی ہے ان میں سے کتاب المرضی جزء ۴ میں، کتاب العلم جزءِ اوّل صفحہ ۲۲ پر، کتاب الجہاد، باب جوائز وفدس صفحہ ۱۱۸ جزء ۲ میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح یہ روایت کتاب صحیح مسلم جزء ۲ میں آخری وصیتوں کے زیرِ عنوان صفحہ ۱۴ پر موجود ہے۔

علاوہ ازیں دیگر کتب میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ سیّد شرف الدین مرحوم نے المراجعات میں "رزیہ یوم خمیس" کے زیرِ عنوان یہ روایات نقل کی ہیں۔



اضطراری کیفیت میں حرام گوشت کا حکم

آیت کے آخر میں پھر حرام گوشت سے مربوط مسائل کا ذکر ہے یہاں اضطراری صورت کے لیے حکم بیان کیا گیا ہے: اور جو لوگ بھوک کی حالت میں حرام گوشت کھانے پر مجبور ہو جائیں جبکہ وہ گناہ کی طرف رغبت نہ رکھتے ہوں تو پھر یہ ان کے لیے حلال ہے کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور ضرورت کے وقت وہ اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا اور نہ انھیں اس پر سزا دیتا ہے (فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم فان اللہ غفور رحیم)۔

"مخمصۃ" کا مادہ "خمص" (بروزن "لمس") ہے جس کا معنی ہے دھنس جانا۔ یہ لفظ سخت بھوک کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ بھوک شکم کے دھنس جانے کا باعث ہو چاہے قحط کے زمانے میں ہو یا کوئی انفرادی طور پر اس مشکل صورتِ حال سے دوچار ہو جائے۔

"غیر متجانف لاثم" ـــــ کا معنی ہے "گناہ کی طرف میلان یا رغبت نہ رکھتا ہو" یہ اضطرار کے مفہوم کی تاکید کے طور پر آیا ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ضرورت کے وقت حرام گوشت کھانے میں تیزی نہ دکھائے اور اسے حلال نہ سمجھنے لگے یا یہ کہ اضطرار کی بنیاد اس نے خود فراہم نہ کی ہو اور یا کسی ایسے سفر میں اس مشکل سے دوچار نہ ہوا ہو۔ جو اس نے فعل حرام انجام دینے کے لیے اختیار کیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اس عبارت سے یہ تمام معانی مراد ہوں۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۴۴۳ و صفحہ ۴۴۴ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۴۔ يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَٰتُ ۙ وَمَا
عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ
اللَّهُ ۖ فَكُلُوا مِمَّآ أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا
اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۴۔ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیزیں حلال کی گئی ہیں، کہہ دو کہ پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں، نیز ان شکاری جانوروں کا شکار (بھی تمھارے لیے حلال ہے) جنھیں تم نے وہ کچھ سکھایا جس کی خدا نے تمھیں تعلیم دی تھی۔ بس جو کچھ یہ جانور تمھارے لیے (شکار کرتے ہیں اور) روک رکھتے ہیں وہ کھا لو اور (جب جانور کو شکار کے لیے چھوڑو تو) اس پر خدا کا نام لیا کرو اور خدا سے ڈرو کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے۔



شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول ذکر کی گئی ہیں ان میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ زید الخیر اور عدی بن حاتم جو صحابیٔ رسولؐ تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہم کچھ لوگ ہیں جو شکاری کتوں اور بازوں کی مدد سے شکار کرتے ہیں، اور ہمارے شکاری کتے حلال جنگلی جانوروں کو پکڑ لیتے ہیں ان میں سے بعض تو زندہ ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور ہم انھیں ذبح کر لیتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کتوں کی وجہ سے مارے جاتے ہیں اور ہمیں انھیں ذبح کرنے کا موقع نہیں ملتا ہم جانتے ہیں کہ خدا نے مردار کا گوشت حرام قرار دیا ہے اب ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا گیا[1]

تفسیر

حلال شکار

گذشتہ دو آیات میں حرام و حلال گوشت کے بارے میں احکام بیان ہو چکے ہیں یہاں ان میں سے کچھ مزید احکام کا تذکرہ ہے اس سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: تم سے کھانے والی چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یسئلونک ماذا احل لھم) پھر پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: پہلے تو ان سے کہو کہ ہر پاکیزہ چیز تمھارے لیے حلال ہے (قل احل لکم الطیبات) یعنی اسلام نے جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ ناپاک ہے اور خبائث کے زمرے میں آتا ہے اور قوانین الٰہی کسی ایسی چیز کو کبھی حرام قرار نہیں دیتے جو پاکیزہ ہو اور فطری طور پر نوع بشر کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہو لہٰذا حقیقی شریعت قوانین تکوین سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

پھر شکار کے بارے میں فرمایا گیا ہے: تمھارے سدھائے ہوئے یعنی جنھیں تم نے وہ کچھ سکھایا ہے جس کی خدا نے تعلیم دی ہے ان شکاری جانوروں کا شکار تمھارے لیے حلال ہے (وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ)[2]

"جوارح" اصل میں "جرح" سے لیا گیا ہے جو کبھی "کسب" اور "کام" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "زخم" کے معنی میں۔ اسی لیے شکاری جانوروں کو چاہے وہ پرندے ہوں یا کوئی اور جانور "جارحہ" کہتے ہیں "جارحہ" کی جمع "جوارح" ہے۔ یعنی وہ جانور جو اپنے شکار کو زخم لگاتے ہیں یا وہ جانور جو اپنے مالک کے لیے کسب کرتے ہیں۔

بدن کے اعضاء کو بھی جوارح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان ان کے ذریعے کسی کام کو انجام دیتا ہے اور اکتساب کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۳، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] اس جملے کی ابتداء میں حذف و تقدیر موجود ہے "فکلوا مما امسکن علیکم" سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں "وصید ما علمتم" ہے (غور کیجیے گا)۔



اس لیے "وما علمتم من الجوارح" "ان تمام جانوروں کے لیے ہے جنھیں شکار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، لیکن ساتھ "مکلبین" بھی ہے جو "کلب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "کُتا"۔ "مکلبین" شکاری کتوں کی تربیت کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ اس طرح یہ تعبیر جملے کو شکاری کتوں سے مخصوص کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ آیت شکاری کُتوں کے علاوہ باز وغیرہ سے کیے گئے شکار کے بارے میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ میں صرف شکاری کتوں سے کیا جانیوالا شکار جائز ہے۔ اگرچہ اہلِ سنت کے بعض مفسرین سب کو جائز سمجھتے ہیں اور "مکلبین" کا مفہوم وسیع قرار دیتے ہیں کہ جو کتوں سے شکار کرنے والوں کے لیے مخصوص نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس لفظ کا اصلی مادہ اسے شکاری کتوں کی تربیت سے مخصوص کر دیتا ہے۔ البتہ اگر دوسرے شکاری جانور کسی شکار کو بے بس کر دیں لیکن اسے مرنے سے پہلے آدابِ شرعی کے مطابق ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہے۔

تعلّمونھن مما علمکم اللہ میں چند نکات

۱۔ ایسے جانوروں کی تعلیم و تربیت مستقل اور مسلسل ہو۔ اگر وہ اپنی تعلیم بھول جائیں اور آوارہ کتوں کی طرح کسی جانور کو چیر پھاڑ دیں تو اس شکار کا گوشت حلال نہیں ہوگا کیونکہ "تعلّمونھن" فعل مضارع ہے اور مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ کتے کی تعلیم و تربیت صحیح اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے یہ بات "مما علمکم اللہ" کے مفہوم سے مطابقت رکھتی ہے۔

۳۔ تمام علوم کا سرچشمہ خدا ہے چاہے وہ عام اور چھوٹے چھوٹے امور کا علم ہو یا اہم اسکی تعلیم کے بغیر ہم کوئی علم نہیں رکھتے۔ ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ شکاری کتوں کی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ ان کی تربیت اس طرح سے ہونی چاہیے کہ وہ مالکوں کے حکم سے چل پڑیں اور ان کے روکنے سے رک جائیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جس جانور کو کتے شکار کرتے ہیں اگر وہ زندہ ہاتھ آجائے تو اسے آدابِ اسلامی کے مطابق ذبح کیا جانا چاہیے، لیکن شکاری کے پہنچنے سے پہلے اس کی جان نکل جائے تو وہ حلال ہے اگرچہ اسے ذبح نہیں بھی کیا گیا۔

اس کے بعد ایسے شکار کی حلیت کی شرائط میں سے دو کا ذکر کیا گیا ہے: اس شکار کو جسے شکاری کتے تمھارے لیے روکے رکھیں، کھاؤ (فکلوا مما امسکن علیکم) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر شکاری کتے اس بات کے عادی ہوں کہ اپنے شکار کا کچھ حصہ کھا لیتے ہیں اور کچھ چھوڑ دیتے ہوں تو ایسا شکار حلال نہیں ہے اور وہ "وما اکل السبع" کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کا گذشتہ آیت میں ذکر ہے۔ حقیقت میں ایسا کتا نہ تو تعلیم یافتہ ہے اور نہ اس سے جو کچھ بچا رکھا ہے وہ "علیکم" (تمھارے لیے) کا مصداق ہے۔

بعض فقہا اس شرط کے قائل نہیں ہیں وہ اس سلسلے میں چند روایات سے استناد کرتے ہیں جو کُتب احادیث میں موجود ہیں بہرحال اس پر تفصیلی بحث فقہی کُتب میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان کی ایسے تربیت ہونا چاہیے کہ وہ اپنا شکار کھائیں نہیں۔



دوسری شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے کو چھوڑا جائے تو خدا کا نام لیا جائے (واذکروا اسم اللہ علیہ)
آخر میں ان تمام احکام کا احترام کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا سے ڈرو کیونکہ وہ سریع الحساب ہے (واتقوا اللہ ان اللہ سریع الحساب)[1]

۵۔ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۪ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۟ ع

ترجمہ

۵۔ آج کے دن پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہوگئی ہیں اور (اسی طرح) اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے نیز مسلمانوں میں پاک دامن عورتیں اور اہل کتاب میں سے پاک دامن عورتیں حلال ہیں جبکہ ان کا حق مہر ادا کردو اور پاک دامن رہو نیز پوشیدہ طور پر اور غیر شرعی طریقے سے یاری نہ لگاؤ، اور جو شخص اس چیز سے کفر اختیار کرے کہ جس پر ایمان لانا چاہیئے اس کے اعمال باطل اور بے اثر ہو جاتے ہیں اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

اہلِ کتاب کا کھانا کھانا اور ان میں شادی بیاہ کرنا

یہ آیت گذشتہ آیات کے مباحث کی تکمیل کرتی ہے، پہلے فرمایا: آج کے دن سے پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہوگئی

---

[1] سریع الحساب (جلدی حساب لینے والا) کی تشریح تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۴۵ (اردو ترجمہ) پر گذر چکی ہے۔



ہیں اور اہل کتاب کے کھانے تمھارے لیے اور تمھارے کھانے ان کے لیے حلال ہیں (الیوم احل لکم الطیبت وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم وطعامکم حل لھم)۔

یہاں چند مطالب توجہ طلب ہیں۔

۱۔ "الیوم" (آج کا دن) سے مراد بعض مفسرین کے مطابق عرفہ کا دن ہے اور بعض اسے فتح خیبر کا دن کہتے ہیں لیکن بعید نہیں کہ یہ یوم غدیر ہو کہ جب اسلام کو کفار پر مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی (اس بات کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے)۔

۲۔ طیبات تو اس دن سے پہلے بھی حلال تھے یہاں ان کی حلّت کا ذکر اہل کتاب کے کھانے کے بارے میں آنیوالے حکم کی تمہید کے طور پر ہے۔

۳۔ اہل کتاب کا طعام جسے آیت میں حلال قرار دیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں زیادہ تر مفسرین اور علماء اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کا کھانا شامل ہے، چاہے ان جانوروں کا گوشت ہو جو ان کے ہاتھ سے ذبح ہوئے ہوں۔ یا اس کے علاوہ کچھ ہو۔ لیکن شیعہ فقہاء اور مفسرین کی قطعی اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ اس سے مراد ان کے ہاتھوں ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کے علاوہ ہے۔ چند شیعہ علماء پہلے نظریے کے حامی ہیں۔

ائمہ اہل بیتؑ سے منقول متعدد روایات بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں کہ آیت میں طعام سے مراد اہل کتاب کے ذبیحہ کے علاوہ ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے زیر نظر آیت کے بارے میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا،

"عنی بطعامھم ھٰھنا الحبوب والفاکھۃ غیر الذبائح التی یذبحون فانھم لا یذکرون اسم اللّٰہ علیھا"

اہل کتاب کے طعام سے مراد دانے اور میوے ہیں نہ کہ ان کے ذبح کیے ہوئے جانور، کیونکہ وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے ہیں[1]

دوسری متعدد روایات جو وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ابواب اطعمہ واشربہ کے باب ۵۱ صفحہ ۲۸۱ پر مذکور ہیں نیز گزشتہ آیات میں دقت نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے ذبح شدہ جانوروں کے علاوہ ان سے کھانا پینا حقیقت کے زیادہ نزدیک ہے، کیونکہ جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے مذکورہ روایت میں نشاندہی فرمائی ہے کہ اہل کتاب ذبح کرنے میں زیادہ تر اسلامی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور نہ جانور کو روبقبلہ ذبح کرتے ہیں۔ اسی لیے باقی شرائط بھی پوری نہیں کرتے تو کیسے ممکن ہے کہ گذشتہ آیات میں تو ایسا جانور صریحاً حرام قرار دیا گیا ہو اور اس آیت میں اسے حلال شمار کر لیا گیا ہو۔

یہاں چند سوالات سامنے آتے ہیں،

پہلا سوال: اگر طعام سے مراد گوشت کے علاوہ دوسرے کھانے ہیں تو وہ تو پہلے بھی حلال تھے کیا اس آیت کے نزول سے

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۶ صفحہ ۲۹۱



قبل گندم اور ایسی دیگر اجناس اہلِ کتاب سے خریدنا ممنوع تھا، حالانکہ مسلمانوں اور ان کے درمیان ہمیشہ کاروبار رہتا تھا۔

آیت کی تفسیر میں ایک بنیادی نقطے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام پورے جزیرۂ عرب پر غالب آچکا تھا۔ اور پورے جزیرۂ عرب میں اس کا وجود مسلّم ہو چکا تھا اب دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو شکست دینے سے مایوس ہو چکے تھے اس موقع پر ان حد بندیوں کو برطرف کیا جانا چاہیے تھا جو پہلے کفار سے مسلمانوں کی معاشرت کے بارے میں تھیں۔ پہلے ان کے ہاں آنا جانا، انھیں مہمان بلانا، ان کے ہاں بطور مہمان جانا ممنوع تھا۔ لہٰذا اس آیت نے بتایا کہ اب کے بعد جبکہ تم اپنی حیثیت اور مقام منوا چکے ہو اور ان سے تمھیں کوئی خطرہ نہیں رہا ان سے معاشرتی حد بندیوں میں کمی کر دی گئی ہے لہٰذا اب تم ان کے مہمان بن سکتے ہو اور انھیں بھی اپنے ہاں دعوت دے سکتے ہو اسی طرح ان میں شادی بھی کر سکتے ہو (لیکن ان سب امور کی اپنی اپنی شرائط ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا)۔

یہ بات بغیر کہے نہ رہ جائے کہ جو لوگ اہل کتاب کو پاک نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کھانا اس صورت میں کھایا جا سکتا ہے جب غذا وغیرہ مرطوب نہ ہو یا مرطوب ہو تو ان کا ہاتھ اسے نہ لگا ہو، لیکن ایسے محققین جو اہلِ کتاب کی طہارت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ اگر ان کا کھانا ان کے ذبیحہ سے تیار نہ کیا گیا ہو اور نجاست عرضی کا یقین بھی نہ ہو (مثلاً شراب یا آب جو وغیرہ سے نجس نہ ہوا ہو) تو پھر ان کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ زیر بحث آیت کا مقصد دراصل اہلِ کتاب سے معاشرت کے سلسلے میں گذشتہ حد بندیوں کو برطرف کرنا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ تمھارا کھانا بھی ان کے لیے حلال ہے یعنی انھیں اپنے ہاں مہمان بلانے میں بھی کوئی حرج نہیں نیز اس کے فوراً بعد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کے بارے میں بھی حکم بیان کیا گیا ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ ایک حکومت اپنے پیروکاروں کو ایسا حکم دے سکتی ہے جب وہ اپنے ماحول پر پوری طرح سے کنٹرول حاصل کرلے اور اسے دشمن کا کوئی خوف نہ رہے ایسی صورتِ حال دراصل یوم غدیر پر پیدا ہو چکی تھی۔ بعض کے نزدیک یہ حجۃ الوداع کا روزِ عرفہ تھا یا فتح خیبر کے بعد کا موقع تھا اگرچہ غدیر خم کا دن اس بات کیلیے ہر لحاظ سے زیادہ سازگار معلوم ہوتا ہے۔

<u>دوسرا سوال</u>: جو تفسیر المنار میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں آیا ہے یہ ہے کہ صاحبِ تفسیر کے مطابق لفظ "طعام" بہت سی قرآنی آیات میں ہر قسم کی غذا کے لیے آیا ہے یہاں تک کہ گوشت بھی اس میں شامل ہے اب کیسے ممکن ہے کہ زیر بحث آیت میں اسے غلات اور میوہ جات وغیرہ میں محدود کر دیا جائے۔ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے یہ اعتراض ایک ایسی مجلس میں پیش کیا جس میں کچھ شیعہ علماء بھی موجود تھے (اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا)۔

ہمارے نقطہ نظر کے مطابق اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہے ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ لفظ "طعام" کا ایک وسیع مفہوم ہے لیکن گذشتہ آیات جن میں مختلف طرح کے گوشت کے بارے میں بحث ہے اور خصوصاً ان جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے جنھیں ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہیں لیا گیا، وہ اس وسیع مفہوم کی تخصیص کرتی ہیں اور اسے ایسے گوشت کے علاوہ میں محدود کر دیتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر عام اور مطلق قابلِ تخصیص ہے اور اسے بعض شرائط کا پابند کیا جا سکتا ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل کتاب



ذبیحہ پر نام خدا لینے کے پابند نہیں ہیں اور اس کے علاوہ وہ دیگر شرائط کا بھی لحاظ نہیں رکھتے جو سنت سے ثابت ہیں۔

تیسرا سوال: کتاب کنزالعرفان میں اس آیت کی تفسیر میں ایک اور اشکال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "طیبات" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اصطلاح کے مطابق عام ہے لیکن "طعام الذین اوتوا الکتب" خاص ہے اور عموماً عام کے بعد خاص کے ذکر میں کوئی نکتہ ہونا چاہیے مگر یہاں کوئی واضح نکتہ نہیں ہے اسکے بعد مصنف اس اُمید کا اظہار کرتا ہے کہ خدا اس کی اس علمی مشکل کو حل کر دے گا۔

مندرجہ بالا سطور میں اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ طیبات کے حلال ہونے کا ذکر اہلِ کتاب سے میل جول پر عائد پابندی ختم کرنے کے لیے مقدمہ و تمہید کے طور پر آیا ہے۔ حقیقت میں آیت کہتی ہے کہ ہر پاکیزہ چیز تمھارے لیے حلال ہے اسی وجہ سے اہلِ کتاب کا (پاکیزہ) کھانا بھی تمھارے لیے حلال ہے اور ان سے معاشرت کے بارے میں جو پابندیاں پہلے عائد تھیں آج تمہیں میسر کامیابیوں کے باعث کم کر دی گئی ہیں (غور کیجیے گا)۔

غیر مسلم عورتوں سے شادی

اہلِ کتاب کے کھانے کی حلیت کا حکم دینے کے بعد آیت میں پاکدامن مسلمان اور پاکدامن اہلِ کتاب عورتوں سے شادی بیاہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: تمھارے لیے مسلمان اور اہلِ کتاب پاکدامن عورتیں حلال ہیں اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا حق مہر انھیں ادا کر دو (والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتب من قبلکم اذا اٰتیتموھن اجورھن) اور یہ بھی شرط ہے کہ شادی مشروع اور جائز طریقے سے ہو نہ کہ کھلے بندوں زنا ہو یا مخفی طور پر یاری لگاتے پھرو (محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان)۔[2]

درحقیقت آیت کا یہ حصہ بھی غیر مسلم عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بیاہ کے سلسلے کی پابندیوں میں کمی کے لیے ہے۔ اس میں اہلِ کتاب عورتوں سے مسلمان مردوں کی شادی کو مشروط طور پر جائز قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اہلِ کتاب عورتوں سے ہر طرح کی دائمی و موقت شادی جائز ہے یا صرف ازدواج موقت یعنی متعہ جائز ہے۔ فقہائے اسلام میں اس سلسلے میں اختلاف ہے علمائے اہلِ سنت ان دو طرح کی تزویج میں فرق کے قائل نہیں ان کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت عمومیت کی حامل ہے لیکن بعض شیعہ فقہاء کے نزدیک یہ آیت صرف موقت ازدواج کی اجازت دیتی ہے۔ آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول بعض روایات بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں اور آیت میں بھی بعض ایسے قرائن موجود ہیں

---

[1] کنزالعرفان، جلد ۲ صفحہ ۳۱۲

[2] جیسا کہ اس تفسیر کی جلد ۳ میں سورہ نساء کی آیت ۲۵ کے ذیل میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ "اخدان" "خدن" (بروزن "اذن") سے دوست اور رفیق کے معنی میں ہے لیکن عام طور پر جنس مخالف سے غیر شرعی طور پر پوشیدہ دوستی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔



جنھیں اس نظریئے پر شاہد قرار دیا جا سکتا ہے۔

پہلا قرینہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: اذا اٰتیتموھن اجورھن ـــــ بشرطیکہ ان کی اُجرت انھیں ادا کرو .... یہ درست ہے کہ "اجر" عقد دائمی اور عقد موقت دونوں کے حق مہر کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ تر ازدواج موقت کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی زیادہ تر اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: غیر مسافحین و لا متخذی اخدان۔ زنا اور پوشیدہ طور پر بغیر شرعی یاری دوستی کے طور پر نہ ہو .... یہ تعبیر بھی موقت ازدواج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ دائمی شادی زنا اور پوشیدہ دوستی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی کہ اس سے منع کیا جاتا لیکن بعض اوقات نادان اور بے خبر لوگ ازدواجِ موقت کو زنا یا پوشیدہ دوستی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تعبیرات سورۂ نساء کی آیت ۲۵ میں دکھائی دیتی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہ آیت ازدواج موقت کے بارے میں ہے۔

ان تمام امور کے باوجود بعض فقہا اہل کتب سے مطلق ازدواج کو جائز سمجھتے ہیں اور مذکورہ قرآن کو آیت کی تخصیص کے لیے کافی نہیں سمجھتے اور اس سلسلے میں بعض روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ تفصیل فقہی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ بات بنا کہے نہ رہ جائے کہ آج جبکہ زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمیں زندہ ہو چکی ہیں یہ نظریہ بھی وجود میں آچکا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کیلئے عورت یا مرد سے دوستانہ تعلقات میں نہ صرف مخفی صورت میں بلکہ کھلے بندوں بھی کوئی حرج نہیں۔

درحقیقت آج کی دنیا نے گناہ اور جنسی بے راہ روی میں زمانہ جاہلیت سے بھی قدم آگے بڑھا لیا ہے کیونکہ اس دور میں تو مخفی تعلقات کو جائز سمجھا جاتا تھا لیکن آج علی الاعلان ایسی دوستی کو جائز قرار دیا جاتا ہے یہاں تک کہ انتہائی بے شرمی سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے یہ رسوا کن رسم جو واضح اور شرمناک بدکاری ہے مغرب کی طرف سے مشرق کے لئے منحوس سوغات ہے یہ بہت سی بدبختیوں اور جرائم کا سرچشمہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اہل کتاب کے طعام کے بارے میں (مذکورہ شرائط کے ساتھ) اجازت دی گئی ہے کہ ان سے کھانا کھایا بھی جا سکتا ہے اور انھیں کھلایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن شادی بیاہ کے سلسلے میں صرف ان سے رشتہ لینا جائز ہے۔ مسلمان عورتوں کے لیے کسی طرح کوئی اجازت نہیں کہ وہ اہل کتاب کے مردوں سے شادی کریں۔ اس کا فلسفہ کچھ بغیر واضح ہے کہ عورتیں نسبتاً نرم دل ہوتی ہیں اور ممکن ہے کہ برخلاف مرد کے عورت بہت جلد اپنے شوہر کا عقیدہ قبول کرلے۔

مندرجہ بالا سہولتیں جو کہ اہل کتاب سے معاشرت اور ان کی عورتوں سے ازدواج کرنے کے بارے میں ہیں جن سے ممکن ہے کہ بعض لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی طرف کھنچے چلے جائیں، لہٰذا آیت کے آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو شخص ان چیزوں سے کفر اختیار کرے کہ جن پر ایمان لانا چاہیے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کفار کی راہ اختیار کرے اس کے اعمال برباد ہو جائیں گے اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا (ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین)۔



یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سہولتیں تمام تمھاری زندگی کی کشائش و آرام کے علاوہ اس چیز کا باعث بنانا چاہییں کہ تم ان بے گانوں میں اثر و نفوذ پیدا کرو نہ یہ کہ تم ان کے زیر اثر ہو جاؤ اور اپنے دین سے دستبردار ہو جاؤ۔ کیونکہ اس صورت میں تمھاری سزا بہت سخت ہوگی۔[1]

آیت کے اس حصّے کی تفسیر کے سلسلے میں چند روایات اور مذکورہ شانِ نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے نزول اور اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے اور ان کی عورتوں کی حلیت کے بعد بھی بعض مسلمان اسے ناپسند کرتے تھے لہٰذا قرآن نے انھیں تنبیہ کی کہ اگر انھیں خدا کے نازل کردہ احکام پر اعتراض ہے اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں تو ان کے اعمال برباد ہو جائیں گے اور وہ خسارے میں رہیں گے۔

۶۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

۶۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لو اور سر اور پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ تک) مسح کرو اور اگر حالتِ جنب میں ہو تو غسل کرو اور اگر بیمار ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی (قضائے حاجت کی) پست جگہ سے آیا ہے یا عورتوں سے (مباشرت کیلیے) لمس کیا ہو اور (غسل یا وضو کیلیے) پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اس (مٹی) سے چہرے کے اوپر (پیشانی پہ) اور ہاتھوں پہ مسح کرو۔ خدا انہیں

---

[1] حبط اور احباط کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم سورۂ بقرہ آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں ص۳۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔



چاہتا کہ تمھارے لیے مشکل پیدا کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کرے شاید تم اس کا شکر ادا کرو۔

تفسیر

جسم اور رُوح کی پاکیزگی

گزشتہ آیات میں جسمانی پاکیزگی اور مادی نعمات کے بارے میں بحثیں تھیں۔ زیر نظر آیت میں روحانی پاکیزگی سے متعلق گفتگو ہے اس میں ان امور کا تذکرہ ہے جو روحانی طہارت کا باعث ہیں۔ اس میں وضو، غسل اور تیمم کے احکام ہیں اور روح کی صفائی کا باعث ہیں پہلے تو اہلِ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے احکام وضو بیان کیے گئے ہیں: اے ایمان والو! جب نماز کے لیے کھڑے[لہ] ہوجاؤ، تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور سر کے ایک حصے کا اور اسی طرح پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ) تک مسح کرو (یایها الذین اٰمنوا اذا قمتم الی الصلوٰة فاغسلوا وجوهکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برءوسکم وارجلکم الی الکعبین)۔

آیت میں وضو میں دھونے کے لیے چہرے کی حدود کا ذکر نہیں، لیکن روایاتِ اہلِ بیتؑ میں رسول اللہؐ کے وضو کرنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ لمبائی میں چہرے کی حد بالوں کے اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک ہے اور چوڑائی میں وہ حصّہ جو درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان آجائے۔

دراصل یہ "وجہ" (چہرے) کے اس معنی کی وضاحت ہے جو عرف عام میں اس سے سمجھا جاتا ہے کیونکہ وجہ (چہرہ) وہی حِصّہ ہے جس کا انسان سے ملتے ہی "مواجہ" (سامنا) ہوتا ہے۔

۲۔ ہاتھ کی حد جو وضو میں دھوئی جانی چاہیے کہنی تک بیان ہوئی ہے کیونکہ "مرافق" "مرفق" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "کہنی"۔ جب کہا جائے کہ ہاتھ دھو لو تو ممکن ہے ذہن میں یہ آئے کہ انھیں کلائی تک دھونا ہے کیونکہ عام طور پر یہی مقدار دھوئی جاتی ہے اس وہم کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: کہنیوں تک دھوؤ (الی المرافق) اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ

لہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول متعدد روایات میں ہے کہ قمتم (تم کھڑے ہو) سے مراد ہے نیند سے اٹھنا۔ آیت کے مشتملات اور تمام حصوں پر غور کرنے سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ بعد میں تیمم کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: او جاء احد منکم من الغائط (یا کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے لوٹے)۔ اگر آیت کا خطاب اصطلاحاً بے وضو افراد سے ہوتا تو اس جملے کا عطف اور وہ بھی "اَو" کے ذریعے آیت کے ظاہری مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ بھی بے وضو کے عنوان میں داخل ہے لیکن اگر آیت کے آغاز میں خطاب نیند سے اٹھنے والے لوگوں سے ہے اور اصطلاح کے مطابق صرف نیند کا حدث بیان کیا گیا ہے تو پھر اس جملے کا مفہوم بھی مکمل ہوگا (غور کیجیے گا)۔



" الیٰ ": اس آیت میں فقط دھونے کی حد بیان کرنے کے لیے ہے نہ کہ کیفیت بیان کرنے کے لیے جیسا کہ بعض کو اس سے یہی گمان ہوا ہے ان کا خیال ہے کہ آیت کہتی ہے کہ ہاتھ کو انگلیوں کے سروں سے لے کر کہنی تک دھونا چاہیے (جیسا کہ اہل سنت کے ایک طبقے میں رائج ہے)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ بالکل اس طرح ہے کہ انسان کسی کاریگر سے کہے کہ کمرے کی دیوار کو نیچے سے لے کر ایک میٹر اوپر تک رنگ کر دو تو واضح ہے کہ مقصد یہ نہیں کہ دیوار کو نیچے سے اوپر کی طرف رنگ کرو بلکہ مراد یہ ہے کہ اتنی مقدار کو رنگ کرو اس سے زیادہ یا کم نہ ہو۔ اس لیے یہاں آیت میں بھی صرف ہاتھ کی وہ مقدار مقصود ہے جسے دھونا چاہیے۔ رہی ایسی کیفیت تو وہ سنت پیغمبر میں ہے جو ان کے اہل بیت کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے اس کے مطابق کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سروں تک دھونا چاہیے۔

توجہ رہے کہ کہنی کو بھی وضو میں ساتھ دھونا چاہیے کیونکہ ایسے مواقع پر اصطلاح کے مطابق " غایت مغیا میں داخل ہے" یعنی حد بھی حکم محدود میں شامل ہے[1]

۳۔ کلمہ "ب" جو "برءوسکم" میں ہے بعض روایات کے مطابق اور بعض اہل لغت کی تصریح کے مطابق تبعیض کے لیے ہے یعنی کچھ حصے کے مفہوم میں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سر کے کچھ حصے کا مسح کرو جسے ہماری اصطلاح میں سر کے اگلے حصے سے محدود کیا گیا ہے اور اس کے لیے سر کے چوتھائی یا کچھ کم حصے پر ہاتھ سے مسح کیا جاتا ہے اس لیے جو اہل سنت کے بعض گروہوں میں مروج ہے کہ وہ پورے سر کا یہاں تک کانوں کا بھی مسح کرتے ہیں وہ آیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔

۴۔ " ارجلکم " "برءوسکم "کے ہم پہلو آیا ہے یہ اس بات پر شاہد ہے کہ پاؤں کا بھی مسح کیا جائے نہ کہ اسے دھویا جائے۔ " ارجلکم " کی لام پر زبر اس وجہ سے ہے کہ اس کا عطف "برءوسکم "کے ساتھ ہے نہ کہ "وجوھکم " پر عطف ہے[2]

۵۔ " کعب " لغت میں پاؤں کے اوپر کی ابھری ہوئی جگہ اور مفصل کے معنی میں آیا ہے یعنی وہ مقام جہاں پاؤں کی ہڈی سے پنڈلی کی ہڈی مل جاتی ہے[3]

---

[1] سیبویہ عربی لغت کا مشہور ماہر اور علم نحو کا عالم تھا وہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں لفظ " الیٰ " کا مابعد اور ماقبل ایک جنس سے ہوں تو مابعد قبل کے حکم میں ہوتا ہے اور اگر دو جنسوں سے ہوں تو پھر خارج ہوتا ہے (مثلاً اگر کہا جائے کہ دن کی آخری گھڑی تک روزہ رکھو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری گھڑی میں بھی روزہ رکھو اور اگر کہا جائے کہ ابتدائے رات تک روزہ رکھو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے رات حکم میں داخل نہیں ہے)۔ (المنار ج ۶ ص ۲۲۳)

[2] اس میں شک نہیں کہ "وجوھکم " اور " ارجلکم " میں بہت فاصلہ ہے لہٰذا اس پر عطف کرنا بہت بعید نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے قاریوں نے " ارجلکم " کو لام کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

[3] قاموس میں " کعب " کے تین معنی مذکور ہیں۔ ۱۔ پشت پا کی ابھری ہوئی جگہ، ۲۔ مفصل اور ۳۔ ٹخنے جو پاؤں کے دو طرف ہیں لیکن سنت میں جو وضاحت کی گئی ہے اس میں یہ بات مسلم ہے کہ اس سے ٹخنے مراد نہیں، لیکن اس بات میں فقہا میں اتفاق نہیں کہ آیا یہ پاؤں پر کی ابھری ہوئی جگہ ہے یا پاؤں اور پنڈلی کا جوڑ (مفصل) بہرحال احتیاط یہی ہے کہ جوڑ تک ہی مسح کیا جائے۔



اس کے بعد غسل کے بارے میں حکم ہے، فرمایا گیا ہے: اگر مجنب ہو تو غسل کرو (وان کنتم جنبا فاطھروا)۔ واضح ہے کہ "فاطھروا" سے مراد پورے جسم کا دھونا ہے کیونکہ اگر کسی مخصوص حصّے کا دھونا مطلوب ہوتا تو اس کا نام لیا جانا ضروری تھا اس لیے جب یہ فرماتا ہے کہ اپنے آپ کو دھولو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ سارے بدن کو دھولو۔ اس کی نظیر سورۂ نساء آیہ ۴۳ میں بھی موجود ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

حتی تغتسلوا

جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۳ میں سورۂ نساء آیہ ۴۳ کے ضمن میں نشاندہی کی جا چکی ہے کہ لفظ "جنب" مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے دراصل اس کا مطلب ہے "دور ہونے والا" اس کی وجہ یہ ہے کہ مجنب کو اس حالت میں نماز کی ادائیگی، مسجد میں توقف اور اس طرح کے دیگر کاموں سے دوری اختیار کرنا چاہیے۔ اور لفظ "جنب" مفرد، جمع، مذکر اور مونث سب کے لیے بولا جاتا ہے "جار جنب" کا اطلاق دور کے ہمسایوں پر بھی اسی مناسبت سے ہے۔

قرآن مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے: نماز کے وقت مجنب ہو جاؤ تو غسل کرو، ممکن ہے اس سے یہ بھی اخذ کیا جا سکے کہ غسلِ جنابت، وضو کا بھی جانشین ہے۔

اس کے بعد تیمم کا حکم بیان کیا گیا ہے: اگر نیند سے اُٹھے ہو اور نماز کا ارادہ رکھتے ہو اور بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت سے لوٹے ہو یا عورتوں سے جنسی ملاپ کر چکے ہو اور پانی تک تمہاری رسائی نہیں ہے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو (وان کنتم مرضی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا)۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ "او جاء احد منکم من الغائط" اور "او لمستم النساء" کا عطف جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے آیت کی ابتداء یعنی "اذا قمتم الی الصلوۃ" پر ہے، حقیقت میں آیت کی ابتداء میں نیند کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے اور آیت کے ذیل میں دو مزید چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو وضو یا غسل کا سبب بنتی ہیں اگر ان دونوں جملوں کا عطف "علی سفر" پر کریں تو آیت میں کئی ایک اشکالات پیدا ہوں گے مثلاً قضائے حاجت سے لوٹنا، بیماری اور مسافرت کے مقابل پر نہیں ہو سکتا لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ "او" کو "واؤ" کے معنی میں لیں (جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے) اور یہ ظاہر کے بالکل خلاف ہے علاوہ ازیں یہ اشکال بھی ہے کہ وضو واجب کرنے والے امور میں سے صرف قضائے حاجت کا ذکر کرنا اس صورت میں بلا وجہ ہو گا، اگر اس طرح سے ہو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں تو ان دونوں میں سے کوئی اعتراض لاحق نہ ہو گا (غور کیجیے گا)۔

(بہت سے مفسرین کی طرح اگرچہ ہم بھی جلد ۳ میں نساء ۴۳ میں "او" کو واؤ کے معنی میں ذکر کر چکے ہیں لیکن جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ قرینِ نظر ہے)۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مسئلہ جنابت کا دو مرتبہ ذکر آیا ہے ممکن ہے یہ تاکید کے لیے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ "جنب" جنابت اور نیند میں احتلام کے معنی میں ہو اور "او لمستم النساء" سے جنسی ملاپ والی جنابت سے کنایہ ہو نیز اگر "قیام" سے مراد "نیند سے اٹھنا" لیا جائے جیسا کہ روایات اہلِ بیتؑ میں ہے اور خود آیت میں اس کا قرینہ موجود ہے تو یہ خود مسئلہ جنابت کے بارے میں کی گئی تفسیر پر شاہد ہو گا (غور کیجیے گا)۔



اس کے بعد تیمم کا طریقہ بیان کیا گیا ہے: اس کے ذریعے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو (فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ)۔

واضح ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں کہ کچھ مٹی اٹھالیں اور اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیں بلکہ مراد یہ ہے کہ پاک مٹی پر ہاتھ مارنے کے بعد چہرے اور ہاتھوں کا مسح کریں۔ لیکن بعض فقہاء نے لفظ منہ کی وجہ سے کہا ہے کہ چاہیے تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو غبار ہاتھ پر لگا ہونا چاہیے[1]

اب "صعیدًا طیبًا" کی تفسیر باقی رہ گئی ہے بہت سے علماءِ لغت نے "صعید" کے دو معانی ذکر کیے ہیں ایک مٹی اور دوسرا وہ چیزیں جنھوں نے کرۂ ارض کی سطح کو ڈھانپ رکھا ہے چاہے وہ مٹی ہو، ریت ہو یا پتھر وغیرہ۔ یہی بات فقہاء میں اس اختلاف نظر کا باعث بن گئی ہے کہ تیمم کس چیز پر جائز ہے۔ کیا صرف مٹی پر تیمم جائز ہے یا پتھر اور سنگریزوں پر بھی ہو جاتا ہے لیکن "صعید" کے اصل لغوی معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے یعنی "صعود اور اوپر ہونا" دوسرا مفہوم ہی زیادہ قرین ذہن ہے۔

"طیب" ایسی چیزوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں، قرآن میں یہ لفظ بہت سی چیزوں کے ساتھ استعمال ہوا ہے، مثلاً: البلد الطیب، مساکن طیبة، ریح طیب، حیاة طیبة، وغیرہ۔ ہر پاکیزہ چیز کو بھی طیب کہتے ہیں کیونکہ انسان کی طبیعت ذاتی طور پر ناپاک چیزوں سے نفرت کرتی ہے یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ تیمم کی مٹی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیے۔

ہادیانِ اسلام سے منقول روایات میں خصوصاً اس بات کا تذکرہ ہے۔ ایک روایت میں ہے:

نهى امير المؤمنين ان يتيمم الرجل بتراب من اثر الطريق۔

یعنی ——— حضرت امیرالمومنینؑ نے گندی مٹی سے جو سڑکوں پر پڑی ہوتی ہے، تیمم کرنے سے منع فرمایا ہے[2]

توجہ رہے کہ قرآن و حدیث میں تو تیمم اسی مخصوص اسلامی ذمہ داری کے مفہوم میں آیا ہے جس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن لغت میں اس کا معنی ہے "قصد کرنا" درحقیقت قرآن کہتا ہے کہ جب تیمم کرنا چاہو تو زمین کے کسی پاک حصے کا قصد کرو یعنی تیمم کے لیے زمین میں سے مختلف حصوں میں سے ایسا حصہ منتخب کرو جو "صعید" کے مفہوم سے ہم آہنگ ہو جو "صعود" کے مادہ سے ہے زمین کے اوپر والا حصہ جہاں بارش پڑتی ہو، سورج کی روشنی پڑتی ہو اور جس سے ہوائیں ٹکراتی ہوں۔ ایسی مٹی جو ہاتھوں اور پاؤں سے روندی نہیں جاتی۔ ایسی مٹی سے استفادہ نہ صرف صحت کے لیے مضر نہیں بلکہ جیسا کہ ہم تیسری جلد میں سورۂ نساء کی آیت ۴۳ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں، سائنس دانوں کی گواہی کے مطابق جراثیم کش اثرات کا بھی حامل ہے۔

---

[1] احکام تیمم اور اس اسلامی حکم کا فلسفہ، اور یہ کہ ایسا کرنا نہ صرف صحت کے منافی نہیں بلکہ صحت مندی کا پہلو رکھتا ہے۔ اسی طرح لفظ "غائط" کا مفہوم اور اس طرح کے دیگر مسائل کی تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] وسائل الشیعہ ج ۲ صفحہ ۹۶۹



وضو اور تیمّم کا فلسفہ

تیمم کے فلسفہ کے بارے میں تو تیسری جلد میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ باقی رہا وضو کا فلسفہ تو اس میں شک نہیں کہ وضو میں دو واضح فائدے ہیں:

ایک فائدہ صحت کے حوالے سے ہے اور دوسرا فائدہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ہے۔

صحت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک دن میں پانچ مرتبہ یا کم از کم تین مرتبہ چہرے اور ہاتھوں کے دھونا، بدن کی نظافت اور پاکیزگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سر اور پاؤں کے مسح کی شرط کہ جس میں ضروری ہے کہ پانی بالوں یا بدن کے چمڑے کو مس کرے بھی اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ یہ اعضاء بھی پاک صاف رکھے جائیں اور جیسا کہ غسل کے فلسفہ میں ہم واضح کریں گے، پانی کا بدن کے چمڑے کو مس کرنا سمپاتھیک (SYMPATHETIC) اور پیرا سمپاتھیک (PARASYMPATHETIC) اعصاب معتدل رکھنے میں بہت مؤثر ہے۔

اخلاقی و روحانی حوالے سے دیکھا جائے تو چونکہ یہ کام قصد قربت سے اور خدا کے لیے کیا جاتا ہے لہٰذا تربیتی اثرات کا حامل ہے خصوصاً جب کنایۃً اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں سر سے لے کر پاؤں تک تیری اطاعت کے لیے حاضر ہوں۔ اس اخلاقی اور معنوی پہلو کی مؤید وہ روایت ہے جو امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

انما امر بالوضوء وبدء به لان یکون العبد طاھرًا اذا قام بین یدی الجبار، عند مناجاته ایاه، مطیعًا له فیما امره، نقیًا من الادناس والنجاسة، مع ما فیه من ذھاب الکسل، وطرد النعاس وتزکیة الفؤاد للقیام بین یدی الجبار۔

وضو کا حکم اس لیے دیا گیا ہے اور عبادت کی ابتداء اس سے اس لیے کی گئی ہے تاکہ بندے جب بارگاہِ الٰہی میں کھڑے ہوں اور مناجات کریں تو پاک و پاکیزہ ہوں، اس کے احکام پر کاربند رہیں اور آلودگیوں اور نجاستوں سے دور رہیں۔ اس کے علاوہ وضو کے سبب سے نیند اور سستی کے اثرات انسان سے دور ہو جاتے ہیں نیز یہ اس لیے ہے تاکہ دل درگاہِ خداوندی میں کھڑے ہونے کے لیے روشنی اور پاکیزگی حاصل کرے۔[۱]

غسل کا فلسفہ

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ حالتِ جنب کے لیے اسلام غسل کا حکم کیوں دیتا ہے جبکہ ایک خاص حصّہ آلودہ ہوتا ہے۔ پیشاب

---

[۱] وسائل الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۷



کرنے اور منی خارج ہونے میں کیا فرق ہے ؟ جب کہ ایک میں تو فقط اس جگہ کو دھونے کا حکم ہے اور دوسرے میں سارے بدن کو دھونے کا۔

اس سوال کا ایک جواب اجمالی ہے اور دوسرا تفصیلی۔

اجمالی جواب یہ ہے کہ اخراج منی پیشاب اور دیگر فضلات کی طرح کسی ایک حصے کا عمل نہیں ہے کیونکہ اس کا اثر سارے بدن پر ہوتا ہے۔ بدن کے تمام خلیے اس کے اخراج کے بعد ایک خاص سستی میں ڈوب جاتے ہیں جو کہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ کام سارے بدن کے اعضاء پر اثر انداز ہوتا ہے اس کی وضاحت کچھ یوں ہے :

سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں نباتی اعصاب کے دو سلسلے ہیں جو بدن کی تمام فعالیت کو کنٹرول کرتے ہیں ایک **سمپاتھیٹک** اور دوسرا **پیرا سمپاتھیٹک**

سارے انسانی بدن میں اور اس کی مشینریوں میں یہ سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ **سمپاتھیٹک** (SYMPATHETIC) اعصاب کی ذمہ داری ہے "تیز کرنا" اور بدن کی مختلف مشینریوں کو فعالیت پر ابھارنا اور **پیرا سمپاتھیٹک** (PARASYMPATHETIC) کا کام ہے ان کی فعالیت کو سست کرنا۔ درحقیقت ان میں ایک گاڑی کے لیے گیس یا پٹرول کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا بریک کا کام کرتا ہے ان دو طرح کے نباتی اعصاب کی فعالیت کے اعتدال سے جسم کا کارخانہ معتدل طور پر کام کرتا رہتا ہے ۔

بعض اوقات انسانی بدن میں اس طرح کے حوادث رونما ہوتے ہیں جو اس اعتدال کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ جنسی لذت کا عروج پر پہنچنا (CLIMAX) بھی ایسے حوادث میں سے ہے جو تمام طور پر منی کے اخراج کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اس موقع پر **پیرا سمپاتھیٹک** (PARASYMPATHETIC) کا سلسلہ **سمپاتھیٹک** (SYMPATHETIC) اعصاب پر سبقت حاصل کر لیتا ہے اور اعتدال منفی شکل میں بدل جاتا ہے ۔

یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ **سمپاتھیٹک** (SYMPATHETIC) اعصاب کو کام پر ابھارنے اور بدن کے اعتدال کو واپس لانے کے لیے بدن سے پانی کا مس کرنا بھی موثر ہے اور چونکہ جنسی لذت کا عروج (CLIMAX) تمام اعضائے بدن پر حسی طور پر اثر انداز ہوتا ہے اور اعصاب کے ان دونوں سلسلوں کا اعتدال سارے بدن میں ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا حکم دیا گیا ہے کہ جنسی ملاپ یا اخراج منی کے بعد سارے بدن کو پانی سے دھویا جائے تاکہ اس کا حیات بخش اثر پورے جسم میں اعصاب کے اعتدال کی بحالی کی صورت میں ظاہر ہو۔[1]

---

[1] امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا :

ان الجنابة خارجة من کل جسده فلذلك وجب علیه تطهیر جسده کله

جنابت سارے بدن سے خارج ہوتی ہے لہٰذا پورے بدن کو دھویا جائے ۔

(وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۴۶۶)

یہ روایت بھی گویا اسی امر کی طرف اشارہ ہے ۔



البتہ غسل کا بس یہی فائدہ نہیں بلکہ یہ غسل ایک طرح کی عبادت بھی ہے جس کے اخلاقی اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اسی لیے قصد قربت اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی نیت بغیر ایسا غسل صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت جنسی ملاپ اور اخراج منی کے وقت روح بھی متاثر ہوتی ہے اور جسم بھی۔ روح مادی شہوات کی طرف کھنچتی ہے اور جسم سستی کا شکار ہوتا ہے۔ جسم کو چونکہ قصد قربت سے دھویا جاتا ہے لہٰذا یہ ایک طرح سے غسل روح بھی ہے۔ اس طرح سے روح خدا اور معنویت کی طرف مائل ہوتی ہے اور جسم پاکیزگی، نشاط اور فعالیت کی طرف۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، زندگی بھر غسل جنابت کا وجوب بدن کی نگہداشت اور صحت کی حفاظت کے لیے ایک لازمی اور ضروری اسلامی حکم ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنی نظافت اور ستھرائی سے غافل رہتے ہیں لیکن یہ اسلامی حکم مختلف وقتی فاصلوں پر انہیں نہانے اور بدن کو پاک رکھنے پر ابھارتا ہے۔ یہ امر گزشتہ زمانے کے لوگوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ خود ہمارے زمانے میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو جسم کی نظافت اور صفائی سے مختلف وجوہ کی بنا پر غافل رہتے ہیں (البتہ یہ حکم کلی اور عمومی ہے یہاں تک کہ اس شخص کے لیے بھی ہے جس نے ابھی تازہ غسل کیا ہے)

مذکورہ بالا تینوں وجوہ مجموعی طور پر واضح کرتی ہیں کہ نیند یا بیداری کی حالت میں اخراج منی اور جنسی ملاپ کی صورت میں اگرچہ منی خارج نہ ہو سارے بدن کو کیوں لازمی طور پر دھونا چاہیے۔

آیت کے آخر میں یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ مذکورہ احکام میں کوئی سختی نہیں ہے بلکہ وہ سارے احکام مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر نافذ کیے گئے ہیں، فرمایا گیا ہے، خدا نہیں چاہتا کہ تمہیں مشقت اور زحمت میں ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو (ما یرید اللّٰہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم و لیتم نعمتہ علیکم لعلکم تشکرون)۔

دراصل اس جملے میں اس حقیقت کی تاکید کی گئی ہے کہ تمام خدائی احکام اور اسلامی پروگرام لوگوں کی خاطر اور انہی کے فائدے میں ہیں اور ان سے کچھ اور مقصود نہیں، خدا چاہتا ہے کہ ان احکام کے ذریعے لوگوں کو روحانی اور جسمانی طور پر پاکیزہ رکھے۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ تمہارے دوش پر کوئی طاقت فرسا اور مشکل ذمہ داری ڈال دے یہ بات اگرچہ غسل، وضو اور تیمم سے مربوط احکام کے ضمن میں آئی ہے لیکن یہ ایک عمومی قانون بھی بیان کر رہی ہے کہ احکام الٰہی کسی موقع پر بھی طاقت فرسا اور قوت سے بڑھ کر نہیں ہیں۔

اس لیے جب کوئی حکم یا ذمہ داری کسی کے لیے سخت مشکل اور ناقابلِ برداشت ہو جائے تو اس کے پیشِ نظر وہ اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت کے لیے روزہ رکھنا باعثِ مشقت ہو جائے تو اسی آیت کی بنا پر ان پر واجب نہیں رہتا۔

یہ بات فراموش نہیں کی جانا چاہیے کہ بعض احکام ذاتی طور پر مشکل ہیں اور اہم مقاصد اور مصلحتوں کے پیشِ نظر ایسی مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ مثلاً دشمنانِ حق کے خلاف جہاد۔

اس آیت سے فقہ اسلامی میں ایک بنیادی اصول "قاعدہ لا حرج" حاصل کیا گیا ہے اور فقہاء بہت سے



مواقع پر احکام کے استنباط میں اس سے استناد کرتے ہیں۔

۷۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

ترجمہ

۷۔ اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو اور اس عہد و پیمان کو (بھی یاد کرو) جو اس نے تم سے لیا ہے۔ اس وقت جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور خدا (کی نافرمانی) سے ڈرو، کیونکہ خدا سینوں کے اندر کے حالات سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خدا سے باندھے گئے پیمان

گذشتہ آیت میں چند احکام اسلامی اور نعمات الٰہی کی تکمیل کا ذکر تھا۔ اسی بحث کی مناسبت سے اس آیت میں مسلمانوں کو دوبارہ خدا کی لامتناہی نعمات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان نعمات میں سب سے اہم ایمان، اسلام اور ہدایت کی نعمت ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے: خدا کی نعمتوں کو یاد رکھو (واذکروا نعمۃ اللہ علیکم) یہاں لفظ "نعمت" مفرد صورت میں ہے لیکن یہ جنس کے معنی میں ہے اور جنس یہاں عمومیت کا مفہوم رکھتی ہے لہٰذا اس سے مراد تمام تر نعمتیں ہیں۔

البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ خصوصیت سے یہاں نعمتِ اسلام مراد ہو جس کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے: ولیتم نعمتہ علیکم ـــــ اور اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔ اسلام ہی کے زیر سایہ مسلمانوں کو تمام تر نعمتیں، افتخارات اور وسائل نصیب ہوئے۔ وہ لوگ جو پہلے بالکل منتشر، جاہل، گمراہ، خوں خوار، فاسد اور مفسد تھے۔ اسلام نے انھیں اتحاد اور دانائی عطا کی اور وہ مادی و روحانی نعمتوں سے مالا مال ہو گئے۔

اس کے بعد وہ عہد و پیمان جو انھوں نے خدا سے باندھا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور میثاق الٰہی کو فراموش نہ کرو جبکہ اس وقت تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی (و میثاقہ الذی و اثقکم بہ اذ قلتم سمعنا و اطعنا)۔



اس بارے میں کہ اس پیمان سے کون سا پیمان مراد ہے دو احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔

پہلا وہ پیمان کہ جو مسلمانوں نے آغازِ اسلام میں حدیبیہ کے موقع پر باندھا تھا یا حجۃ الوداع یا عقبہ میں باندھا تھا یا پھر وہ پیمان جو ہر مسلمان نے اسلام قبول کرتے ہی بالواسطہ طور پر خدا سے باندھا تھا۔

دوسرا وہ پیمان جو فطری طور پر ہر شخص اپنے خدا سے باندھ چکا ہے اسی کو بعض اوقات "عالم ذر" کہتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس کی خلقت کے وقت قابلِ نظر صلاحیتیں اور بے شمار نعمتیں عطا کیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو اسرارِ آفرینش اور اس کے ذریعے پروردگار کی معرفت کی استعداد بخشی ہے۔ اسی طرح اس نے عقل و شعور سے نوازا جس کے ذریعے انسان پیغمبروں کو پہچانتا ہے اور ان کے احکام پر عمل کرتا ہے۔

یہ صلاحیتیں عطا کر کر خدا نے عملاً انسان سے یہ عہد لیا کہ وہ انھیں معطل اور باطل نہیں کر چھوڑے گا، بلکہ ان سے صحیح طور پر استفادہ کرے گا اور انسان بھی یہ صلاحیتیں حاصل کر کے بزبانِ حال پکار اٹھا کہ سمعنا و اطعنا ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

یہ عہد و پیمان زیادہ وسیع، زیادہ پائیدار اور زیادہ عمومی ہے جو خدا نے اپنے بندوں سے لیا ہے یہ وہی پیمان ہے جس کی طرف حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لیستادوھم میثاق فطرتہ

انبیاء اس لیے بھیجے گئے کہ وہ لوگوں کو پیمانِ فطرت پورا کرنے کی دعوت دیں۔

واضح ہے کہ یہ وسیع پیمان تمام دینی مسائل پر بھی محیط ہے۔ کوئی مانع نہیں کہ یہ آیت تمام تکوینی اور تشریعی عہد و پیمان (جو خدا نے بحکم فطرت لیے ہیں یا رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے مختلف موقعوں پر لیے ہیں) کی طرف اشارہ ہو۔

یہاں سے واضح ہو گیا کہ وہ حدیث جس میں ہے کہ میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع میں ولایت علیؑ کے سلسلے میں لیا تھا وہ ہمارے مذکورہ بیان سے پوری مناسبت رکھتا ہے کیونکہ ہم بار ہا کہہ چکے ہیں کہ مختلف آیات کے ذیل میں آنے والی احادیث کسی ایک روشن اور واضح مصداق کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ یہ کہ مفہومِ آیات ان میں منحصر ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "میثاق" اصل میں "وثاقہ" یا "وثوق" کے مادہ سے ہے جو طناب وغیرہ سے کسی چیز کو باندھنے کے معنی میں ہے بعد ازاں ہر اس کام کو کہا جانے لگا جو اطمینانِ خاطر کا سبب بنے۔ عہد و پیمان چونکہ ایک گرہ کی مانند ہے جو دو افراد یا دو گروہوں کے درمیان بندھ جاتا ہے اور ان کے اطمینان کا باعث بنتا ہے اس لیے اسے میثاق کہتے ہیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیزگاری اختیار کرو کہ خدا سینوں کے اندر کے اسرار سے آگاہ ہے (واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور)۔

۱؎ اس بارے میں مزید تشریح اور یہ کہ اسے "عالم ذر" کیوں کہتے ہیں انشاء اللہ اعراف ۱۷۲ کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے گا۔

۲؎ تفسیر برہان ج ۱ صفحہ ۴۵۴



" ذات الصدور" مرکب ہے۔ " ذات " عین اور حقیقت کے معنی میں ہے اور "صدور"، "صدر" کی جمع ہے جس کا معنی ہے سینہ ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا ان باریک ترین اسرار سے باخبر ہے جو انسان کی روح کی گہرائیوں میں چھپے ہوتے ہیں اور انھیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ۔ عواطف، احساسات اور نیتوں کو دل اور اندرونِ سینہ سے کیوں نسبت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جلد اوّل صفحہ ۱۰۰ (اردو ترجمہ) میں تفصیل سے بحث کی جاچکی ہے۔

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

۹۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

۱۰۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○

ترجمہ

۸۔ اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو اور کسی گروہ کی دشمنی تمھیں ترکِ عدالت کی طرف نہ لے جائے۔ عدل کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۹۔ خدا نے ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

۱۰۔ اور جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اور ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں وہ اہلِ جہنم ہیں۔

تفسیر

قیامِ عدالت کا تاکیدی حکم

پہلی آیت قیامِ عدالت کی دعوت دیتی ہے۔ ایسی ہی دعوت کچھ فرق کے ساتھ سورۂ نساء آیہ ۱۳۵ میں گذر چکی ہے۔



پہلے تو صاحبِ ایمان افراد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو (یایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للّٰہ شھداء بالقسط)۔

اس کے بعد عدالت سے انحراف کے ایک عمومی سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قومی عداوتیں اور شخصی معاملات کہیں تمہیں اجرائے عدالت سے روک نہ دیں اور کہیں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کا سبب نہ بن جائیں کیونکہ عدالت ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے (ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا)۔

مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر دوبارہ عدالت ہی کا حکم دیا گیا ہے: عدالت اختیار کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے (اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی)۔

عدالت چونکہ تقویٰ و پرہیزگاری کا بہترین رکن ہے لہٰذا تیسری مرتبہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے: خدا سے ڈرو کیونکہ خدا تمہارے تمام اعمال سے آگاہ ہے (واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون)۔

اس آیت میں اور سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں چند پہلوؤں میں فرق ہے، جو یہ ہیں:

۱۔ سورہ نساء میں عدالت کے قیام اور خدا کے لیے گواہی دینے کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہاں خدا کے لیے قیام اور حق و عدالت کی گواہی دینے کی دعوت دی گئی ہے یہ فرق شاید اس لیے ہو کہ سورۂ نساء میں ہدف یہ تھا کہ گواہیاں خدا کے لیے دی جائیں نہ کہ اقرباء، اعزا اور وابستگان کے لیے، لیکن یہاں چونکہ گفتگو دشمن کے متعلق ہے۔ لہٰذا عدل و قسط پر مبنی گواہی کی بات کی گئی ہے یعنی ظلم و ستم پر مبنی گواہی نہ ہو۔

۲۔ سورۂ نساء میں عدالت سے انحراف کا ایک سبب بیان کیا گیا ہے اور یہاں دوسرا سبب مذکور ہے وہاں بلاوجہ محبت میں افراط اور یہاں بلاوجہ بغض میں افراط کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن سورۂ نساء کی اس بات میں دونوں جمع ہیں کہ فلا تتبعوا الھوٰی ان تعدلوا ــــــ یعنی ترک عدالت سے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو ــــــ بلکہ ہوا و ہوس کی پیروی ظلم و ستم کا وسیع منبع ہے کیونکہ ظلم و ستم بعض اوقات ہوا پرستی کی وجہ سے اور شخصی مفادات کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ دوستی اور دشمنی کی بناء پر، لہٰذا عدالت سے انحراف کی اصل بنیاد ہوا و ہوس کی پیروی ہے جس کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ اور حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے:

اما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق
ہوا پرستی تمہیں حق سے باز رکھے گی [۱]

عدالت ایک اہم اسلامی حکم ہے

اسلام میں بہت کم مسائل عدالت جیسی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ مسئلہ عدل، مسئلہ توحید کی طرح اسلام کے تمام

---

[۱] یہ حدیث کتاب سفینۃ البحار میں مادہ "ہویٰ" کے ذیل میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے اور نہج البلاغہ کے خطبہ ۴۲ میں حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔



اصول و فروع کی بنیاد ہے، جیسے اعتقادی، عملی، انفرادی، اجتماعی، اخلاقی اور حقوق کے بارے میں کوئی بھی مسئلہ حقیقت توحید سے جدا نہیں اسی طرح ان میں کوئی بھی روحِ عدل سے خالی نہیں ملے گا۔

یہی وجہ ہے کہ تعجب کا مقام نہیں کہ عدل اصولِ دین میں سے ہو اور مسلمانوں کی فکری عمارت کی ایک بنیاد کے طور پر پہچانا جائے۔ اگرچہ عدالت جو کہ اصولِ دین کا حصہ ہے صفات الہیہ میں سے ہے اور خداشناسی جو کہ اصولِ دین میں سے ایک ہے میں عدالت بھی شامل ہے لیکن اسے ممتاز اور جدا رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اجتماعی مباحث میں عدالت سے بڑھ کر کسی اصل سے کام نہیں لیا گیا۔ مندرجہ ذیل احادیث اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ایاکم والظلم فان الظلم عند اللہ ھو الظلمات یوم القیٰمۃ

ظلم سے بچو کیونکہ ہر عمل روزِ قیامت اپنی مناسب شکل میں مجسم ہوگا اور ظلم ظلمت وتاریکی کی صورت میں مجسم ہوگا اور تاریکی کا پردہ ظالموں کو گھیرے ہوئے ہوگا۔[1]

اور ہم جانتے ہیں کہ سرخیر و برکت نور ہے اور ظلمت ہر عدم اور فقدان کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

بالعدل قامت السمٰوٰت و الارض

آسمان اور زمین عدل کی بنیاد پر قائم ہیں۔[2]

عدالت کے بارے میں یہ بات واضح ترین ممکن تعبیر ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ نوعِ بشر کی یہ محدود زندگی اس کرۂ خاکی میں عدالت کے بغیر برپا نہیں ہو سکتی بلکہ تمام جہانِ ہستی اور آسمان و زمین سب کا قیام عدالت کی وجہ سے، توانائیوں کے اعتدال کے باعث اور ہر چیز کے اپنے مقام و محل پر ہونے کے سبب سے ہے اور اگر یہ لحظہ بھر کے لیے اور سوئی کی نوک کے برابر اس اصول سے منحرف ہو جائیں تو تباہ و برباد ہو جائیں۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الملک یبقی مع الکفر و لا یبقی مع الظلم

حکومتیں کفر سے تو ممکن ہے باقی رہ جائیں، لیکن ظالم ہوں تو انہیں دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلم ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر اس دنیا میں جلدی ظاہر ہو جاتا ہے آج کی دنیا میں جنگیں، اضطراب، بے اطمینانی سیاسی افراتفری، نیز اجتماعی، اخلاقی اور اقتصادی بحران اس حقیقت کو اچھے طریقے سے ثابت کر رہے ہیں۔

جس چیز کی طرف پوری توجہ رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلام عدالت کی فقط نصیحت نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر میں زیادہ اہم عدالت کا رائج ہونا ہے ان آیات و روایات کا فقط بر سرِ منبر پڑھنا، کتابوں میں لکھنا یا تقاریر میں سنانا معاشرے میں موجود

---

[1] سفینۃ البحار ...... مادہ "ظلم"

[2] تفسیر صافی سورہ رحمٰن آیۃ ۸ کے ذیل میں۔



ناانصافیوں، برائیوں اور خرابیوں کا علاج نہیں بلکہ ان احکام کی عظمت اس دن واضح ہوگی جب یہ مسلمانوں کی زندگی میں جاری و ساری ہو جائیں گے۔

اگلی آیت میں خصوصی احکام کی تاکید اور تکمیل کے لیے سنت قرآن کے مطابق کلی قانون اور اصول کی نشاندہی کی گئی ہے ایمان لانے والوں سے خدا بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کرتا ہے (وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لھم مغفرۃ واجر عظیم) اور جو اللہ اور اسکی نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں وہ اہلِ دوزخ ہیں (والذین کفروا وکذبوا بایاتنا اولٰئک اصحاب الجحیم)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بخشش اور اجر عظیم کا ذکر اس آیت میں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے طور پر آیا ہے اور فرمایا گیا ہے: وعد اللہ یعنی اللہ کا وعدہ ہے لیکن دوزخ کی سزا کا ذکر عمل کے نتیجہ کی صورت میں ہے، فرمایا گیا ہے: جن لوگوں کے ایسے اعمال ہوں گے ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا یہ درحقیقت دارِ آخرت کی جزا میں خدا کے فضل و رحمت کی طرف اشارہ ہے جو کسی طرح بھی انسان کے ناچیز اعمال کے برابر نہیں ہے جیسا کہ وہاں کی سزا بھی انتقامی پہلو نہیں رکھتی۔ بلکہ خود آدمی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ضمناً یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ "اصحٰب الجحیم" میں "اصحاب" کا معنی ہے یار و انصار جو ہمیشہ ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کے ساتھی ہیں لیکن تنہا یہ آیت دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ تفسیر تبیان، مجمع البیان اور تفسیر فخر الدین رازی میں آیا ہے کیونکہ اس میں قیام ہو سکتا ہے دائمی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ طویل مدت کے لیے ہو اور اس کے بعد نہ ہو جیسا کہ حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونے والوں کے لیے قرآن میں "اصحاب السفینہ" (کشتی کے ساتھی) کہا گیا ہے اور اس میں قیام بھی دائمی نہ تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ کفار دوزخ میں رہیں گے لیکن زیر نظر آیت میں اس کے بارے میں گفتگو نہیں ہے بلکہ یہ بات دیگر آیات سے معلوم ہوتی ہے۔[1]

۱۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ
اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۠

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان والو! وہ نعمت یاد کرو جو خدا نے تمھیں بخشی جبکہ (دشمنوں کی) ایک جماعت نے ارادہ کر رکھا تھا کہ تم پر

---

[1] "جحیم" مادہ "جحم" (بروزن "فہم") سے ہے اس کا معنی ہے "شدت سے آگ بھڑکنا" جہنم کو اسی وجہ سے "جحیم" کہا گیا ہے۔ دنیا کی جلانے والی وسیع آگ کو بھی کبھی "جحیم" کہتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں ہے کہ نمرود نے یوں کہا:

فالقوہ فی الجحیم

پس اسے بھڑکتی آگ میں ڈال دو (الصّٰفّٰت - ۹۷)



ہاتھ اٹھائے (اور تمھیں ختم کردے) لیکن خدا نے ان کا ہاتھ تم سے روک دیا، خدا سے ڈرو اور مومنین کو چاہیے کہ وہ صرف خدا پر ہی توکّل (اور بھروسہ) کریں۔

تفسیر

گذشتہ چند آیات میں نعماتِ الٰہی کے ذکر کے بعد اس آیت میں پھر روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ اور نعمتیں مسلمانوں کو یاد دلائی ہیں تاکہ ان کے شکرانے کے طور پر فرمانِ خدا کی اطاعت کریں اور عدالت کے قیام کی کوشش کریں۔ فرمایا گیا ہے: اے ایمان لے آنے والو! خدا کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب ایک گروہ مصمم ارادہ کرچکا تھا کہ تمھاری طرف ہاتھ بڑھائے اور تمھیں ختم کردے لیکن خدا نے ان کا شر تم سے دُور کردیا (یٰایھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم)۔

خداوندِ عالم آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو بار بار اپنی گوناگوں نعمات اور الطاف یاد دلاتا ہے تاکہ ان میں روحِ ایمان کو محکم کرے، ان میں شکر گذاری کا احساس اجاگر کرے اور مشکلات کے مقابلے میں انھیں ثباتِ قدم پر ابھارے۔ ایسی آیات میں سے ایک زیرِ نظر آیت بھی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ آیت کون سے واقعہ کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض سمجھتے ہیں کہ یہ بنی نضیر کے یہودیوں کا خطرہ برطرف کرنے کی طرف اشارہ ہے، جنھوں نے مدینہ میں رسولِ خدا اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔

بعض مفسرین اسے "بطن نخل" کے واقعہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو حدیبیہ کے موقع پر ہجرت کے چھٹے برس واقع ہوا۔ ہوا یہ کہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں مشرکین مکہ کی ایک جماعت نے پروگرام بنایا کہ نمازِ عصر کے دوران میں مسلمانوں پر حملہ کردیں۔ پیغمبر اکرم اس سازش سے آگاہ ہوگئے۔ آپؐ نے نماز کو مختصر کرکے نمازِ خوف میں تبدیل کردیا۔ اس طرح ان کی سازش نقش بر آب ہوگئی۔

بعض اسے رسول اللہؐ اور مسلمانوں کی حادثات سے معمور زندگی کے دیگر حوادث کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ آیت ان تمام حوادث کی طرف اشارہ کررہی ہے جو پوری تاریخ اسلام میں وقوع پذیر ہوتے رہے۔ آیت میں لفظ "قوم" نکرہ ہے اور وحدت پر دلالت ہے۔ اگر اس سے صرف نظر کرلیں تو یہ تفسیر دیگر تفاسیر سے بہتر ہے۔

بہرحال آیت مسلمانوں کی توجہ ان خطرات کی طرف دلا رہی ہے جن میں ممکن تھا کہ ان کا نام ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ آیت تنبیہ کررہی ہے کہ ان نعمتوں کی قدردانی کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور جان لو کہ اگر تم پرہیزگار رہے تو زندگی میں اکیلے نہیں رہوگے اور وہ دستِ غیب جو ہمیشہ تمھارا محافظ رہا ہے آئندہ بھی حمایت کرتا رہے گا (و اتقوا اللہ وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔

واضح ہے کہ توکّل کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے کام خدا پر چھوڑنے کے بہانے ذمّہ داریوں سے صرف نظر کرلے یا حوادث کے سامنے سر جھکا لے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی پوری صلاحیت اور توانائی کو بروئے کار لانے کے باوجود اس طرف متوجہ رہے کہ جو کچھ



اس کے پاس ہے وہ خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ کسی دوسری ذات کی طرف سے ہے۔ اس طرح غرور اور خود پرستی کا احساس اپنے دل سے نکال دے نیز اس بات سے نہ ڈرے کہ مشکلات وحوادث بہت زیادہ اور شدید ہیں مایوس نہ ہو اور جان لے کہ اس کے پاس ایک ایسا سہارا ہے جس کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے۔

ضمناً یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ آیت میں پہلے تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے پھر توکّل کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی حمایت پرہیزگاروں کے شامل حال ہے۔

توجہ رہے کہ "تقویٰ" "وقایہ" کے مادہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ اپنا بچاؤ اور فساد اور برائی سے اجتناب کرنا۔

۱۲۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○

ترجمہ

۱۲۔ خدا نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان میں سے بارہ رہبر اور سرپرست ہم نے مبعوث کیے اور خدا نے (انھیں) کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، میرے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو اور خدا کو قرض حسنہ دو (اس کی راہ میں ضرورت مندوں کی مدد کرو) تو تمھارے گناہوں کو چھپا دوں گا (بخش دوں گا) اور تمھیں باغات جنت میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں داخل کروں گا لیکن جو شخص اس کے بعد بھی کافر ہو جائے تو وہ راہِ راست سے منحرف ہو گیا ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی ابتداء میں ایفائے عہد کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ مختلف طریقوں سے اس کی تکرار بھی کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا آیت بھی اسی مناسبت سے ہے شاید یہ پے در پے سب تاکیدیں جو ایفائے عہد کے بارے میں اور پیمان شکنی کی



مذمت کے لیے ہیں، پیمانِ غدیر کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہوں جن کا ذکر آیہ ۶۷ میں آئے گا۔

زیر بحث آیت کی ابتداء میں ہے: ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ ہمارے احکام پر عمل کریں اور اس پیمان کے بعد ہم نے ان کے لیے بارہ رہبر اور سرپرست بھیجے تاکہ ان میں سے ہر ایک بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ایک ایک کی سرپرستی کرے (ولقد اخذ اللّٰہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا)۔

"نقیب" کا مادہ ہے "نقب" (بروزن "نقد") جو بڑے سوراخوں اور خصوصاً زیر زمین راستوں کا معنی دیتا ہے۔ کسی گروہ کے سربراہ اور رہبر کو اس لیے نقیب کہتے ہیں کہ وہ اس گروہ کے اسرار سے آگاہ ہوتا ہے گویا اس نے بیچ میں ایک نقب لگائی ہے جس کی وجہ سے وہ اس گروہ کی وضع اور حالات سے آگاہ ہو گیا ہے بعض اوقات "نقیب" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی گروہ کا سردار نہیں ہوتا اور صرف ان کی پہچان کا ذریعہ ہوتا ہے۔ فضائل کو بھی مناقب اسی لیے کہتے ہیں کہ ان سے آگاہی بھی جستجو اور تحقیق کر کے ہی حاصل کی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں "نقیب" کا معنی آگاہ اور اسرار سے مطلع ہی کیا ہے لیکن یہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ تاریخ و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقبائے بنی اسرائیل میں سے ہر ایک اپنے گروہ اور قبیلے کا سرپرست تھا تفسیر روح المعانی میں ابن عباس سے منقول ہے:

انھم کانوا وزراء وصاروا انبیاء بعد ذٰلک

یعنی ——— نقبائے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر تھے جو بعد میں منصب نبوت پر فائز ہوئے [1]

پیغمبر اسلامؐ کے حالات میں مرقوم ہے کہ آپؐ نے شب عقبہ کو حکم دیا کہ نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے مطابق اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کرو۔ مسلماً ان کی ذمہ داری بھی یہی تھی کہ اس گروہ کی رہبری کریں [2]

یہ امر جاذب نظر ہے کہ طرق اہل سنت سے بہت سی روایات ایسی وارد ہوئی ہیں جن میں پیغمبر اسلامؐ کے بارہ خلفاء اور جانشینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کی تعداد کا تعارف نقبائے بنی اسرائیل کے تعداد کے حوالے سے کروایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ اہل سنت کے مشہور امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں مسروق سے نقل کرتے ہیں وہ کہتا ہے: میں نے عبداللہ بن مسعود سے سوال کیا کہ اس اُمت پر کتنے افراد حکومت کریں گے تو ابن مسعود نے جواب دیا:

لقد سئلنا رسول اللّٰہ فقال اثنی عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل

ہم نے پیغمبر خداؐ سے یہی مسئلہ پوچھا تھا۔ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ بارہ افراد نقبائے بنی اسرائیل

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۸۔

[2] سفینۃ البحار (نقب)



کی تعداد کے مطابق [1]

۲۔ تاریخ ابن عساکر میں ابن مسعود سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں نے پیغمبر اسلامؐ سے سوال کیا کہ اس اُمّت پر کتنے خلفاء حکومت کریں گے، تو آپؐ نے فرمایا:

ان عدة الخلفاء بعدی عدة نقباء موسٰی

میرے بعد کے خلفاء کی تعداد نقبائے موسیٰ کی تعداد کے برابر ہے [2]

۳۔ منتخب کنزالاعمال میں جابر بن سمرہ سے منقول ہے:

نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر بارہ خلفاء اس امت پر حکومت کریں گے [3]

ایسی حدیث ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۵ اور البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۲۴۸ پر بھی منقول ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خدا کے وعدہ کی یوں وضاحت کرتا ہے: خدا نے ان سے کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں گا اور تمھاری حمایت کروں گا (و قال الله انی معکم) لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں:

۱۔ بشرطیکہ تم نماز قائم کرو (لئن اقمتم الصلٰوة)،

۲۔ اور اپنی زکوٰۃ ادا کرو (و اٰتیتم الزکٰوة)،

۳۔ میرے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو (وآمنتم برسلی وعزرتموهم) [4]

۴۔ اور اس کے علاوہ مستحب مصارف اور انفاق جو خدا کو قرض حسنہ دینے کے مترادف ہیں سے احتراز نہ کرو (واقرضتم الله قرضاً حسناً)

اگر اس عہد و پیمان پر عمل کرو تو میں تمھارے گذشتہ گناہ بخش دوں گا (لاکفرن عنکم سیاٰتکم) اور تمھیں ان باغاتِ بہشت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (ولادخلنکم جنٰت تجری من تحتها الانهار) لیکن جو لوگ کفر، انکار اور عصیان کی راہ اپنائیں، مسلم ہے کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں (فمن کفر بعد ذٰلک منکم فقد ضل سواء السبیل)۔

---

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۳۹۸ طبع مصر ۱۳۱۳

[2] فیض القدیر شرح جامع الصغیر ج ۲ ص ۴۵۹

[3] منتخب کنزالعمال در حاشیہ مسند احمد ج ۵ ص ۳۱۲

[4] "عزرتموهم" کا مادہ "تعزیر" ہے جو منع کرنے اور مدد دینے کے معنی میں ہے بعض اسلامی سزاؤں کو اسی لیے تعزیر کہتے ہیں کہ حقیقت میں وہ گنہگار کی مدد ہے اور اسے گناہ سے باز رکھنے کی تدبیر ہے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلامی سزائیں انتقامی پہلو نہیں رکھتیں بلکہ تربیتی پہلو رکھتی ہیں اسی لیے ان کا نام تعزیر رکھا گیا ہے۔



اس بارے میں کہ قرآن مجید میں انفاق کے لیے خدا کو قرض دینے کی تعبیر کیوں استعمال کی گئی ہے، ضروری وضاحت تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۲۹ پر (اردو ترجمہ میں) کی جا چکی ہے۔

ایک سوال یہاں باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے کے ذکر سے کیوں مقدم کیا گیا ہے جبکہ ان پر ایمان لانا عمل سے پہلے ضروری تھا۔

بعض مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ "رسل" سے مراد یہاں پر وہ انبیاءؑ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تھے نہ کہ خود حضرت موسیٰؑ۔ لہٰذا یہ حکم آئندہ سے متعلق تھا اس لیے نماز و زکوٰۃ کے بعد ہو سکتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "رسل" سے مراد نقبائے بنی اسرائیل ہی ہوں جن کے متعلق بنی اسرائیل سے عہد وفا لیا جا چکا تھا (تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ بعض قدیم مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ نقبائے بنی اسرائیل خدا کے رسول تھے اور یہ احتمال ہماری مندرجہ بالا آیت کی تائید کرتا ہے)۔

۱۳۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۳۔ پس ہم نے ان کی پیمان شکنی کے باعث انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (یہاں تک کہ) وہ (خدا کے) کلام میں تحریف کرتے تھے اور اس کے کچھ حصّے کی جو ہم نے انھیں تعلیم دی تھی، ان سے انھوں نے فراموش کر دیا اور تمھیں ہر وقت ان کی کسی (نئی) خیانت کی خبر ملے گی مگر ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ (ایسا نہیں ہے) پھر بھی ان سے درگذر کرو اور صرف نظر کرو کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ کے پیمان لینے کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں ان کی پیمان شکنی اور اس کے انجام کا تذکرہ ہے، فرمایا گیا ہے: انھوں نے چونکہ اپنا عہد توڑ ڈالا لہٰذا ہم نے انھیں دھکیل کر اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (فبما نقضھم میثاقھم لعناھم

ؔ "لعن" لغت میں دھتکارنے اور دور کرنے کے معنی میں ہے اور جب یہ لفظ خدا کے حوالے سے ہو تو اس کا معنی ہے "رحمت سے محروم کرنا"



وجعلنا قلوبھم قاسیة[1])۔

درحقیقت انھیں یہ دو سزائیں عہد شکنی کے جرم میں دی گئی ہیں وہ رحمتِ الٰہی سے بھی دور ہو گئے ہیں اور ان کے افکار و قلوب بھی پتھر ہو گئے ہیں اور میلان و انعطاف کے قابل نہیں رہے۔

اس کے بعد آثارِ قساوت کی اس طرح تشریح کی گئی ہے ، وہ کلمات کی تحریف کرتے ہیں اور انھیں ان کے اصلی مقام سے بدل دیتے ہیں (یحرفون الکلم عن مواضعہ) اور جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اس کا ایک حصہ فراموش کر دیتے ہیں (ونسوا حظا مما ذکروا بہ)۔

بعید نہیں کہ جو حصہ انھوں نے بھلا دیا وہ پیغمبرِ اسلامؐ کی نشانیاں اور آثار ہوں جن کی طرف قرآن کی دیگر آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک تورات مفقود رہی پھر چند یہودی علماء نے اسے لکھا۔ فطری امر ہے کہ اس کا بہت سا حصہ تو نابود ہو گیا اور کچھ میں تحریف کر دی گئی یا فراموش ہو گیا۔ لہٰذا یہودیوں کے ہاتھ جو کچھ لگا وہ کتاب موسیٰؑ کا کچھ حصہ تھا جس میں بہت سے خرافات ملا دیئے گئے تھے اور انھوں نے یہ حصہ بھی بھلا ڈالا۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے : ہمیں ہر روز ان کی ایک نئی خیانت کا پتہ چلتا ہے ہاں البتہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو ان جرائم سے کنارہ کش ہے لیکن وہ اقلیت میں ہے (ولا تزال تطلع علی خائنة[2] منھم الا قلیلا منھم)۔

آخر میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سے صرف نظر کر لیں اور چشم پوشی کریں کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے (فاعف عنھم واصفح ان اللہ یحب المحسنین)۔ آیت کے اس حصے سے کیا یہ مراد ہے کہ اس صالح اور نیک اقلیت کے گذشتہ گناہوں سے صرفِ نظر کریں یا غیر صالح اکثریت کے گناہوں سے۔ آیت کا ظاہر دوسرے مفہوم کو تقویت دیتا ہے کیونکہ صالح اقلیت نے تو کوئی خیانت نہیں کی کہ جس سے عفو و بخشش کی جائے۔ مسلّم ہے کہ یہاں درگذر اور عفو ان تکالیف سے متعلق ہے جو انھوں نے ذاتِ پیغمبرؐ کو پہنچائی تھیں اور یہ معافی اسلام کے اہداف و اصول سے متعلق نہیں ہے کیونکہ ان میں تو معافی کا کوئی معنی نہیں۔

یہودیوں کی تحریفات

وہ تمام آیات جو قرآن مجید میں یہودیوں کی تحریفات کے بارے میں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آسمانی کتاب میں

---

[1] لفظ "قاسیة" "قساوت" کے مادہ سے ہے ، او سخت پتھروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی مناسبت سے جو لوگ حقائق سے رغبت اور میلان کا کوئی اظہار نہ کریں ، ان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] "خائنة" اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن یہاں مصدری معنی میں استعمال ہوا ہے اور "خیانت" کا معنی دیتا ہے۔ عربی ادب میں اسم فاعل مصدری معنی میں آتا رہتا ہے۔ مثلاً عافیة و خاطیة اور یہ احتمال بھی ہے کہ "خائنة" "گروہ" کی صفت ہو جو مقدر ہے۔



کیسا کیسا تغیر و تبدل کرتے تھے۔

بعض اوقات وہ تحریف معنوی کا ارتکاب کرتے تھے یعنی اپنی آسمانی کتاب کی آیات کی حقیقی معانی کے خلاف تفسیر کرتے تھے الفاظ نہیں بدلتے تھے معانی بدل دیتے تھے۔

کبھی تحریف لفظی کا ارتکاب کرتے تھے۔ استہزاء و مسخرہ پن کرتے ہوئے "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سنا اور اطاعت کی) کہنے کی بجائے "سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا" (ہم نے سنا اور مخالفت کی) کہتے تھے۔

بعض اوقات وہ آیات کا کچھ حصہ چھپا دیتے۔ جو کچھ ان کے مزاج کے مطابق ہوتا اسے ظاہر کرتے اور جو مخالف ہوتا اسے مخفی رکھتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آسمانی کتاب سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے تاکہ دوسری طرف والا غافل رہے اور اسے پڑھ نہ سکے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں ابن صوریا کے ذکر میں آئیگا۔

کیا خدا کسی کو سنگدل بناتا ہے

زیر بحث آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایک گروہ کی سنگدلی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ سنگدلی اور عدم انعطاف حق سے انحراف اور گناہوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے یہاں سوال ابھرتا ہے کہ جب اس کام کا فاعل خدا ہے تو ایسے اشخاص اپنے اعمال کے جواب دہ کیسے ہو سکتے ہیں اور کیا یہ ایک طرح کا جبر و اکراہ نہیں ؟

قرآن کی مختلف آیات، یہاں تک کہ زیر نظر آیت میں بھی غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت سے مواقع پر لوگ اپنے برے اعمال کے باعث خدا تعالیٰ کے لطف اور ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں در حقیقت ان کا عمل ہی ان کے فکری و اخلاقی انحراف کی بنیاد بنتا ہے اور وہ اپنے ان اعمال کے نتائج سے کسی طور بھی کنارہ کش نہیں ہو سکتے لیکن ہر سبب کا اثر چونکہ خدا کی طرف سے ہے لہٰذا قرآن میں ایسے آثار کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جیسے زیر نظر آیت میں ہے: انھوں نے چونکہ پیمان شکنی کی لہٰذا ہم نے ان کے دلوں کو سخت اور ناقابلِ انعطاف بنا دیا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۲۷ میں ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ آیت ۷۷ میں بعض عہد شکنی کرنے والوں کے بارے میں ہے:

فاعقبھم نفاقا فی قلوبھم الی یوم یلقونہ بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ و بما کانوا یکذبون۔

ان کی پیمان شکنی اور جھوٹ کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا۔

اس طرح کی تعبیرات قرآن میں بہت ہیں۔

واضح ہے کہ یہ برے آثار جن کا سرچشمہ خود انسان کا عمل ہے انسان کے اختیار اور ارادہ کی آزادی کے منافی ہرگز نہیں ہیں کیونکہ اس کی بنیاد خود اس نے فراہم کی ہے اور اس نے جان بوجھ کر اس وادی میں قدم رکھا ہے اور یہ اسکے اعمال کا قہری نتیجہ ہے۔



اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جان بوجھ کر شراب پیئے اور جب وہ مست ہو جائے اور جرائم کرنے لگے تو یہ ٹھیک ہے کہ نشے کی حالت میں وہ خود اختیاری نہیں رکھتا لیکن چونکہ اس نے اس کے اسباب خود پیدا کیے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ نشے کی حالت میں اس سے ایسے افعال سرزد ہو سکتے ہیں لہٰذا وہ اپنے افعال کا جواب دہ ہے۔۔۔۔۔ اس طرح ایسے موقع پر اگر کہا جائے کہ چونکہ انھوں نے شراب پی ہے اور ہم نے ان کی عقل ختم کر دی ہے اور ان کے اعمال کی وجہ سے ہم نے جرائم میں مبتلا کر دیا ہے۔۔۔ کیا اس بات میں کوئی اشکال اور جبر کا پہلو ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ تمام ہدایتیں اور گمراہیاں جنھیں قرآن میں خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے یقیناً یہ خود انسان کے خود کردہ افعال کی وجہ سے ہے اور انھی کے باعث وہ ہدایت یا گمراہی کا استحقاق پیدا کرتا ہے ورنہ خدا کی عدالت و حکمت اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ کسی کو بلاوجہ راہِ راست کی ہدایت کرے اور دوسرے کو گمراہ کر دے۔[1]

۱۴۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○

ترجمہ

۱۴۔ اور جو لوگ (مسیح کی دوستی اور) نصرانیت کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان سے (بھی) ہم نے عہد و پیمان لیا، لیکن ان لوگوں نے بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جو انھیں دی گئی تھی لہٰذا ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت ڈال دی اور جو کچھ انھوں نے انجام دیا عنقریب خدا انھیں اس کے (نتائج کے) بارے میں آگاہ کرے گا۔

تفسیر

دائمی دشمن

گزشتہ آیت میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی سے متعلق گفتگو تھی اب اس آیت میں نصاریٰ کی پیمان شکنی کا تذکرہ ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: دعوائے نصرانیت کرنے والوں کی ایک جماعت جس سے ہم نے عہد وفا لیا تھا پیمان شکنی کی مرتکب ہوئی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول ص۱۴۰ (اردو ترجمہ) میں اس بارے میں مزید توضیح کی جا چکی ہے۔



انھیں جو احکام دیئے گئے تھے ان کا ایک حصہ انھوں نے فراموش کردیا۔ (ومن الذین قالوا انا نصٰری اخذنا میثاقھم فنسوا حظا مما ذکروا بہ)۔

ہاں انھوں نے بھی خدا سے پیمان باندھا تھا کہ وہ حقیقت توحید سے منحرف نہیں ہوں گے اور احکام الٰہی کو فراموش نہیں کریں گے اور آخری پیغمبر کی نشانیاں نہیں چھپائیں گے لیکن انھوں نے بھی یہودیوں کا سا طرز عمل اختیار کرلیا فرق یہاں یہ ہے کہ قرآن یہودیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کی قلیل تعداد پاک اور حق شناس تھی لیکن نصاریٰ کے بارے میں کہتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ منحرف ہوگیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ عیسائیوں کی نسبت یہودیوں میں سے منحرف ہونے والے زیادہ تھے۔

موجودہ اناجیل کی تاریخ کہتی ہے کہ یہ ساری انجیلیں حضرت مسیحؑ کے کئی سال بعد بعض عیسائیوں نے لکھی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان میں واضح تناقضات موجود ہیں۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ انجیل کی آیات کا ایک اہم حصہ بھول چکے تھے موجود اناجیل میں واضح طور پر خرافات موجود ہیں مثلاً حضرت مسیحؑ کی شراب خوری کا ذکر ہے[1] جو کہ عقل کے بھی خلاف ہے اور خود موجودہ تورات و انجیل کی بعض آیات کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح مریم مجدلیہ کا قصہ بھی ہے[2]۔

ضمناً توجہ رہے کہ "نصاریٰ" "نصرانی" کی جمع ہے، عیسائیوں کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے اس سلسلے میں مختلف احتمالات پیش کیے جاتے ہیں:

پہلا یہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے بچپن ناصرہ شہر میں گزارا۔

دوسرا یہ کہ لفظ نصران سے لیا گیا ہو یہ ایک بستی کا نام ہے جس سے نصاریٰ خاص لگاؤ رکھتے تھے۔

تیسرا یہ کہ جب حضرت مسیحؑ نے لوگوں میں سے یار و انصار طلب کیے تو انھوں نے آپ کی دعوت قبول کرلی جیسا کہ قرآن میں ہے:

كما قال عيسى ابن مريم للحواريين من انصاري الى الله قال الحواريون نحن انصار الله

جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کے لیے میری نصرت کرنے والا ہوگا، تو حواریوں نے کہا کہ ہم انصار خدا ہیں۔ (صف ۔۔۔۔ ۱۴)

چونکہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اپنے کہنے کے مطابق عمل نہ کرتے تھے اور صرف دعویٰ کی حد تک حضرت عیسیٰؑ کے یار و انصار تھے لہٰذا قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے ومن الذین قالوا انا نصٰری (ان لوگوں میں سے جو کہتے تھے کہ ہم عیسیٰ کے مددگار ہیں لیکن وہ اس دعویٰ میں سچے نہ تھے)۔

اس کے بعد قرآن عیسائیوں کے اعمال کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کے اعمال کے نتیجے میں ہم نے قیامت تک کے لیے

---

[1] انجیل یوحنا، باب ۲، جملہ ۲ تا ۱۲

[2] انجیل لوقا، باب ۷، جملہ ۳۶ تا ۴۷



ان میں دشمنی ڈال دی (فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیٰمۃ)۔

ان کے لیے دوسری سزا کہ جس کی طرف آیت کے آخری حصے میں اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ: عنقریب خدا انھیں ان کے اعمال کے نتائج کی خبر دے گا اور وہ عملی طور پر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے (وسوف ینبئھم اللہ بما کانوا یصنعون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **"اغرینا" کا مفہوم**: یہ لفظ "اغراء" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے کسی چیز سے چپٹا دینا اور جوڑ دینا۔ بعد ازاں کسی کام کا شوق دلانے اور اس پر اکسانے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ بات لوگوں کے معین اسباب سے مربوط ہونے کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نصاریٰ کی عہد شکنی اور غلط کاریاں اس بات کا سبب بنیں کہ ان میں عداوت و دشمنی اور نفاق و اختلاف پیدا کر دیا جائے (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسبابِ تکوینی کے آثار کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے) آج بھی عیسائی حکومتوں کے درمیان بے شمار کشمکشیں موجود ہیں جن کی بنا پر اب تک دو عالمی جنگیں ہو چکی ہیں ان میں گروہ بندیاں اور عداوت و دشمنی آج بھی جاری و ساری ہے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں کے مختلف مذاہب میں اختلافات اور عداوتیں اس قدر ہیں کہ آج بھی وہ ایک دوسرے کا کشت و خون جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں مراد یہود و نصاریٰ کے درمیان دشمنی ہے جو رہتی دنیا تک جاری رہے گی لیکن آیت کا ظاہری مفہوم عیسائیوں کے مابین عداوت ہی کی تائید کرتا ہے[1]

شاید اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ یہ دردناک انجام عیسائیوں ہی میں منحصر نہیں اگر مسلمان ان کا طریقہ اپنائیں گے تو وہ بھی اس نتیجے سے دوچار ہوں گے۔

۲۔ **"عداوت" اور "بغضاء" کا مفہوم**: "عداوت" "عدو" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے، اور "بغضاء" "بغض" کے مادہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے معنی میں ہے۔ ممکن ہے ان دونوں الفاظ میں یہ فرق ہو کہ "بغض" زیادہ تر قلبی پہلو رکھتا ہے جب کہ "عداوت" عملی پہلو رکھتی ہے یا کم از کم عملی اور قلبی دونوں پہلو رکھتی ہے۔

۳۔ **کیا یہودیت اور عیسائیت ہمیشہ موجود رہیں گی؟**: زیر بحث آیت میں یوں لگتا ہے جیسے نصاریٰ ایک مذہب کے پیروکار ہونے کے حوالے سے (یا یہود و نصاریٰ دونوں) رہتی دنیا تک موجود رہیں گے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بعد پورے عالم میں ایک سے زیادہ دین نہیں ہوگا اور وہ دین اسلام ہے تو ان دو باتوں کو کیسے جمع کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] اس بنا پر "بینھم" کی ضمیر نصاریٰ کی طرف ہی لوٹے گی کہ جن کا ذکر آیت کی ابتداء میں ہو چکا ہے۔



اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ عیسائیت (یا عیسائیت اور یہودیت) ایک بہت ہی کمزور اقلیت کے طور پر حضرت مہدیؑ کے دور میں بھی باقی رہ جائے کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ اس دور میں بھی انسانوں سے ارادہ کی آزادی نہیں چھینی جائے گی اگرچہ دنیا کی قطعی اکثریت دین حق کو پالے گی اور اسے قبول کرلے گی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ پوری دنیا پر ایک اسلامی حکومت ہی ہوگی۔

۱۵۔ یَآَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ط قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ○

۱۶۔ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

ترجمہ

۱۵۔ اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو آسمانی کتاب کے ان بہت سے حقائق کو واضح کرے گا جنھیں تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے (جن کی عملاً ضرورت نہیں) صرف نظر کرلے گا۔ خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے۔

۱۶۔ جو لوگ اس کی خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں خدا انھیں سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرے گا اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر انھیں روشنی میں لیجائے گا اور انھیں راہِ راست کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ اور ان کی عہد شکنیوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب ان آیات میں ان سے بلا واسطہ خطاب کے ذریعے انھیں اس اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے جس نے اُن کے آسمانی دین کو خرافات سے پاک کیا اور انھیں اس راہِ راست کی ہدایت کی جا رہی ہے جو ہر قسم کے انحراف اور کجروی سے دُور ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے اہل کتاب! ہمارا بھیجا ہوا تمھاری طرف آیا ہے تاکہ آسمانی کُتب کے وہ بہت سے حقائق آشکا



کرے جنھیں تم نے چھپا رکھا تھا جبکہ بہت سی ایسی چیزیں جنھیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور جو گذشتہ ادوار سے مربوط ہیں ان سے صرف نظر کرے (یاھل الکتب قد جاءکم رسولنا یبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون من الکتاب ویعفوا عن کثیر)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے بہت سے حقائق چھپا رکھے تھے لیکن پیغمبر اسلام نے صرف وہ باتیں بیان کیں جن کی اس وقت لوگوں کو احتیاج تھی۔ مثلاً حقیقتِ توحید، انبیاء کی طرف ناروا نسبتیں جو کتب عہدین میں ان کی طرف دی گئی تھیں، سود اور شراب کی حرمت اور اس طرح کے دیگر امور لیکن ان امور سے صرف نظر کر لیا جن کا تعلق گذشتہ امتوں اور زمانوں سے تھا اور موجودہ اقوام کے لیے انکے بیان کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

اس کے بعد قرآن مجید کی نصیحت وعظمت اور نوع البشر کی ہدایت وتربیت کے لیے اس کے گہرے اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ خدا کی جانب سے تمھارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے (قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین) وہ نور آیا ہے کہ جس کے ذریعے خدا ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہیں (یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام) علاوہ ازیں انھیں طرح طرح کی ظلمتوں یعنی شرک، جہالت، پراگندگی اور نفاق جیسی تاریکیوں سے توحید، علم اور اتحاد کے نور کی طرف رہبری کرتا ہے (ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ)۔ نیز انھیں اس جادۂ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے جس میں اعتقاد اور عملی پروگرام کے حوالے سے کوئی کجی اور خامی نہیں ہے (ویھدیھم الی صراط مستقیم)۔

پہلی آیت میں نور سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد پیغمبر اسلام کی ذات ہے اور بعض کے نزدیک قرآن مجید۔ قرآن مجید کی مختلف آیات میں قرآن کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ زیر نظر آیت میں نور سے مراد قرآن حکیم ہی ہے۔ اس بناء پر "کتاب مبین" اس پر عطف توضیحی ہے۔ سورہ اعراف آیت ۱۵۷ میں ہے:

> فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون۔
>
> وہ لوگ جو پیغمبر پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے ان کی عظمت کو تسلیم کر لیا ہے اور ان کی مدد کی ہے اور اس نور کی پیروی کی ہے جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے، اہلِ نجات اور کامیاب ہیں۔

سورۂ تغابن آیہ ۸ میں ہے:

> فاٰمنوا باللہ ورسلہ والنور الذی انزلنا
>
> خدا، اس کے پیغمبر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے، ایمان لے آؤ۔

اسی طرح متعدد دیگر آیات بھی ہیں لیکن لفظ نور کا اطلاق پیغمبر اسلام کی ذات پر قرآن میں نظر نہیں آتا۔



علاوہ ازیں بعد والی آیت میں " بہ " کی ضمیر مفرد ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ نور اور کتاب مبین ایک ہی حقیقت ہیں۔

البتہ متعدد روایات میں نور سے امیرالمومنینؑ یا تمام آئمہ اہل بیتؑ مراد لیے گئے ہیں لیکن واضح ہے کہ یہ آیات کے مختلف بطون کے حوالے سے ایک بطن کی تفسیر کی طرح ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے ظاہری معانی کے علاوہ کچھ باطنی مفاہیم بھی ہیں جنھیں " بطونِ قرآن " کہا جاتا ہے یہ جو ہم نے کہا ہے کہ واضح ہے کہ یہ تفسیر بطون قرآن سے مربوط ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت آئمہ موجود نہیں تھے کہ اہلِ کتاب کو ان پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دوسری آیت رضائے الٰہی کے حصول کے لیے قدم بڑھانے والوں کو نوید سناتی ہے کہ قرآن کے سائے میں انھیں تین عظیم نعمتیں دی جائیں گی۔

پہلی نعمت سلامتی کی شاہراہ کی ہدایت ہے..... یہ سلامتی درحقیقت، فرد، معاشرے، روح، خاندان اور اخلاق کی سلامتی ہے (اور یہ سلامتی عملی پہلو رکھتی ہے)۔

دوسری نعمت کفر اور بے دینی کی ظلمتوں سے نکال کر نور ایمان کی طرف لے جانا ہے (یہ اعتقادی پہلو رکھتی ہے)۔

تیسری نعمت ان تمام چیزوں کو مختصر ترین اور نزدیک ترین راستے سے انجام دینا ہے، جسے "صراط مستقیم" کہتے ہیں۔

لیکن یہ سب نعمتیں ان لوگوں کو نصیب ہوں گی جو تسلیم اور حق گوئی کے دروازہ سے داخل ہوں گے اور " من اتبع رضوانه " کے مصداق ہوں گے۔ منافقین اور ہٹ دھرم افراد جو حق سے دشمنی رکھتے ہیں انھیں اس سے کوئی فائدہ نصیب نہیں ہوگا، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات گواہی دیتی ہیں۔

نیز ان سب آثار کا سرچشمہ خدا کا حتمی ارادہ ہے جس کی طرف لفظ " باذنه " سے اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۷۔ یقیناً جنھوں نے کہا کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں، کہہ دو اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم، اس کی



ماں اور روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو ہلاک کر دے تو اسے کون روک سکتا ہے (ہاں) آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کی حکومت خدا ہی کے لیے ہے جو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

کیسے ممکن ہے کہ مسیحؑ خدا ہو؟

گذشتہ مباحث کی تکمیل کے لیے اس آیت میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے دعویٰ پر شدید حملہ کیا گیا ہے اور اُسے ایک واضح کفر قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ امر مسلّم ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں اور درحقیقت انھوں نے خدا کا انکار کیا ہے (لقد کفر الذین قالوا ان الله هو المسیح ابن مریم)۔

اس جملے کا مفہوم واضح ہونے کے لیے ہمیں جاننا چاہیے کہ عیسائی خدا کے بارے میں بے بنیاد دعوے کرتے ہیں۔

پہلا وہ تین خداؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں جسے سورۂ نساء کی آیہ ۱۷۰ میں باطل قرار دیا گیا ہے:

لا تقولوا ثلاثة انتهوا خیرًا لکم انما الله اله واحد

یعنی ——— یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں، اس عقیدے سے باز آجاؤ۔ یہی تمھارے حق میں بہتر ہے، معبود تو فقط تنہا خدا ہے[1]

دوسرا وہ عالم ہستی پیدا کرنے والے کو ان تین میں سے ایک خدا شمار کرتے ہیں اور اسے "باپ خدا"[2] کہتے ہیں۔ سورہ مائدہ ۷۳ میں قرآن مجید نے اس عقیدے کو بھی باطل قرار دیا ہے:

لقد کفر الذین قالوا ان الله ثالث ثلاثة وما من اله الا اله واحد

---

[1] اس آیت کی تفسیر اس جلد کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔

[2] عیسائی کتب میں ہے:

باپ خدا بیٹے کے واسطے سے پوری کائنات کا خالق ہے (قاموس کتاب مقدس صفحہ ۳۴۵)

نیز یہ بھی ہے:

خدا یعنی جو خود بخود وجود میں آیا تمام مخلوقات کے خالق اور ساری کائنات کے مالک کا نام ہے اور وہ ایک لامتناہی اور ازلی روح ہے جو اپنے وجود، حکمت، قدرت اور عدالت میں انواع مختلف کے ساتھ ایسا ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہے۔

(قاموس کتاب مقدس صفحہ ۳۴۴)



یعنی ـــــ کافر کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے ۔ جب کہ ایک اکیلے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

تیسرا ـــــ وہ کہتے ہیں کہ تینوں خدا تعدد حقیقی کے باوجود ایک ہیں اس عقیدے کو وہ "وحدت در تثلیث" بھی کہتے ہیں اس بات کی طرف زیر نظر آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا مسیح بن مریم ہے اور مسیح بن مریم خدا ہے اور دونوں روح القدس سے مل کر تین متعدد ذاتیں ہونے کے باوجود ایک ہیں ۔

سہ گانہ تثلیث کے تمام پہلوجن میں سے ہر ایک عیسائیت کا عظیم ترین انحراف ہے، قرآن کی ایک ہی آیت میں باطل قرار دیئے گئے ہیں ۔

عقیدہ تثلیث کے بطلان کے بارے میں تفصیلی وضاحت اسی جلد میں سورۂ نساء کی آیۂ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں ۔

ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فخرالدین رازی اور بعض دیگر مفسرین کو اس آیت کے سمجھنے میں یہ جو اشکال ہوا ہے کہ کوئی عیسائی بھی صراحت سے خدا اور مسیح کے اتحاد کے عقیدہ کا اظہار نہیں کرتا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مسیحیت کی کتب پر کافی احاطہ نہیں ہے کیونکہ موجودہ عیسائی کتب میں "وحدت در تثلیث" کا مسئلہ بالوضاحت پیش کیا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی کتابیں اس زمانے میں ان مفسرین کے ہاتھ نہ لگی ہوں ۔

اس کے بعد عقیدہ الوہیت کے بطلان کے لیے قرآن کہتا ہے : اگر خدا چاہے کہ مسیح ، اس کی والدہ اور زمین میں بسنے والے تمام لوگوں کو ہلاک کر دے تو کون اسے روک سکتا ہے (قل فمن یملك من الله شیئًا ان اراد ان یهلك المسیح ابن مریم وامه ومن فی الارض جمیعًا)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ مریم دیگر انسانوں کی طرح انسان ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ۔ اس بنا پر مخلوق ہونے کے لحاظ سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح ہیں لہٰذا نابودی ان کے لیے بھی ہے اور وہ چیز جس کے لیے نیستی کا تصور ہو سکے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ازلی و ابدی خدا ہو ۔

دوسرے لفظوں میں اگر مسیحؑ خدا ہو تو خالق کائنات اسے ہلاک نہیں کر سکتا اور اس طرح اس کی قدرت محدود ہو جائے گی اور ایسی ہستی خدا نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا کی قدرت اس کی ذات کی طرح غیر محدود ہے (غور کیجیے گا)۔

آیت میں "مسیح بن مریم" کے الفاظ کا تکرار ہے شاید یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ تم خود معترف ہو کہ مسیحؑ مریم کے فرزند تھے اور وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ان پر ایک مرحلہ حالت جنین کا گذرا ، پھر وہ نوزائیدہ بچے کی حالت میں رہے اور انھوں نے تدریجاً پرورش پائی اور بڑے ہوئے تو کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ایک چھوٹے سے محیط مثلاً شکم مادر میں رہے اور اس میں یہ تمام تغیرات اور تحویلات پیدا ہوں نیز جنین اور شیر خوارگی کے عالم میں وہ ماں کا محتاج ہو ۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ خصوصیت سے ان کی والدہ کے نام کے ساتھ لفظ

لہ اس کی تفسیر انشاء اللہ عنقریب آئے گی ۔



"واحدہ" آیا ہے یوں مادرِ عیسٰیؑ کو دنیا کے دیگر لوگوں سے ممتاز کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس بنا پر ہو کہ عیسائی پوجا پاٹ کے وقت ان کی والدہ کی پرستش بھی کرتے ہیں اور اس وقت کے کلیساؤں میں دیگر مجسموں کے علاوہ جناب مریم کا مجسمہ بھی ہوتا ہے جس کی وہ تعظیم اور پرستش کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۶ میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

واذقال اللہ یاعیسی بن مریم أانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللہ

روز قیامت جب خدا کہے گا: اے عیسٰی بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر میری اور میری والدہ کی پرستش کرو۔

جو لوگ بغیر باپ کے پیدا ہونے کو مسیحؑ کی الوہیت کی دلیل سمجھتے ہیں، آیت کے آخر میں انھیں جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ جیسی مخلوق چاہے پیدا کرتا ہے (وہ چاہے تو کسی کو بغیر ماں باپ کے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا، وہ چاہے تو ماں باپ کے توسط سے پیدا کرے جیسے عام انسانوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ چاہے تو کسی کو صرف ماں کے توسط سے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت مسیحؑ کو پیدا کیا ہے خلقت کا یہ تنوع کسی اور چیز کا نہیں بلکہ اس کی قدرت کی دلیل ہے) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (و للہ ملک السمٰوٰت والارض و بینھما یخلق مایشاء واللہ علی کل شیء قدیر)۔

۱۸۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور اس کے (خاص) دوست ہیں (ان سے) کہہ دو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم اس کی مخلوقات میں سے انسان ہو وہ جسے چاہتا ہے (اور اہل پاتا ہے) اسے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) اسے سزا دیتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب اس کے لیے ہے اور تمام موجودات کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔



تفسیر

اس آیت میں گذشتہ مباحث کی تکمیل کی گئی ہے۔ یہود و نصاریٰ کی بے بنیاد دعووں اور موہوم امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں (و قالت الیھود و النصاریٰ نحن ابناء اللہ و احباءہ)۔

وہ اپنے بارے میں صرف اسی امتیاز کے قائل نہیں بلکہ آیات قرآنی میں بارہا ان کے اس قسم کے دعووں کا ذکر کیا گیا ہے سورۂ بقرہ آیت ۱۱۱ میں ان کے دعوے کا بھی ذکر ہے کہ ان کے علاوہ کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا اور یہ کہ جنت یہود و نصاریٰ ہی سے مخصوص ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۸۰ میں یہودیوں کے اس دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے کہ جہنم کی آگ چند دن کے سوا ان تک نہیں پہنچے گی۔ اس دعویٰ کے ذکر کے بعد ان کی سرزنش کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان کے اس موہوم دعویٰ کا تذکرہ ہے کہ وہ خدا کے بیٹے اور خاص دوست ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا حقیقی بیٹا نہیں سمجھتے تھے عیسائی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حقیقی بیٹا سمجھتے ہیں اور بالتصریح اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں[1]۔ وہ یہ بات اپنے لیے اس مفہوم میں استعمال کرتے تھے کہ وہ خدا سے خاص ربط رکھتے ہیں اور جو شخص بھی ان کی نسل میں سے ہے یا ان کے گروہ میں داخل ہوجاتا ہے وہ اعمال صالح کے بغیر خود بخود خدا کے دوستوں اور فرزندوں میں شمار ہو جاتا ہے[2]۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن ان تمام موہوم امتیازات سے جنگ کرتا ہے اور ہر شخص کا امتیاز صرف ایمان، عمل صالح اور اس کی پرہیزگاری ہی سمجھتا ہے اسی لیے زیر نظر آیت میں اس دعویٰ کے بطلان کے لیے فرمایا گیا ہے: ان سے کہیے کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے (قل فلم یعذبکم بذنوبکم)۔

یعنی تم خود اعتراف کرتے ہو کہ تمہیں تھوڑی سی مدت کے لیے سزا دے گا گناہ گاروں والی جو یہ سزا تمہیں ملے گی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ تم خدا سے کوئی خاص تعلق رکھتے ہو بلکہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا شمار کرتے ہو۔ علاوہ ازیں تمہاری تاریخ شاہد ہے کہ خود اسی دنیا میں تم کئی سزاؤں اور عذابوں میں مبتلا ہوئے ہو۔ یہ تمہارے دعویٰ کے بطلان پر

---

[1] کتب عیسائیت کہتی ہیں:

"خدا کا بیٹا"......... یہ لفظ ہمارے منجی (نجات دینے والے) اور فادی (فدیہ بخشنے والے) کا ایک لقب ہے جو کسی دوسرے پر نہیں بولا جا سکتا مگر ایسے مقام پر کہ قرآن سے معلوم ہو کہ مقصد خدا کا حقیقی بیٹا نہیں۔

(قاموس کتاب مقدس صفحہ ۳۴۵)

[2] کچھ عرصہ ہوا ہمارے علاقے میں کچھ افراد نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے خاص تبلیغات شروع کر رکھی تھیں اور وہ اپنے آپ کو "خدا کے بیٹے" کہتے تھے



دوسری دلیل ہے۔

اس مفہوم کی تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے: تم مخلوقاتِ خدا میں سے دیگر انسانوں جیسے انسان ہو (بل انتم بشر ممن خلق) یہ سب کے لیے قانونِ عام ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور مستحق پاتا ہے) سزا دیتا ہے (یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء)۔

• علاوہ ازیں سب خدا کی مخلوق، اس کے بندے اور مملوک ہیں لہٰذا کسی کو خدا کا بیٹا کہنا منطقی اور اصولی بات نہیں ہے (وللّٰہ ملک السمٰوٰت والارض وما بینھما) اور آخرکار ساری مخلوق نے اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (والیہ المصیر)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کہاں "خدا کے بیٹے" ہونے کا دعویٰ کیا ہے (چاہے یہاں بیٹا حقیقی میں نہیں مجازی معنی ہی میں ہو)؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ اناجیل میں یہ بات بار بار دکھائی دیتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انجیل یوحنا باب ۸ جملہ ۴۱ کے بعد یہ بات درج کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں سے کہا:

"تم اپنے باپ والے کام کرتے ہو"

یہودیوں نے جواب دیا:

ہم زنا سے پیدا نہیں ہوئے، ہمارا ایک باپ ہے جو کہ خدا ہے۔

عیسیٰ نے ان سے کہا:

اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھے دوست رکھتے۔

روایاتِ اسلامی میں بھی ابنِ عباس سے ایک حدیث مروی ہے:

پیغمبرِ اسلام نے یہودیوں کی ایک جماعت کو دینِ اسلام کی دعوت دی اور انہیں خدا کے عذاب سے ڈرایا تو وہ کہنے لگے تم ہمیں خدا کے عذاب سے کیسے ڈراتے ہو جب کہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں[1]

تفسیر مجمع البیان میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں اس حدیث سے ملتی جلتی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ:

پیغمبرِ خدا نے خدا کے عذاب سے ڈرایا تو ایک گروہ کہنے لگا کہ ہمیں تہدید نہ کرو اور نہ ڈراؤ کیونکہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں اگر وہ ہم پر ناراض بھی ہو تو اس کی یہ ناراضگی ایسی ہے جیسے کوئی انسان اپنے بیٹے پر ناراض ہوتا ہے (یعنی بہت جلد اس کا یہ غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے)۔

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۱ ص ۱۹۲



۱۹۔ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ
مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ
فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۹۔ اے اہلِ کتاب! ہمارا رسول تمھاری طرف آگیا ہے اور وہ پیغمبروں کے درمیانی عرصے اور فاصلے کے بعد تمھارے لیے حقائق بیان کرتا ہے کہ مبادا (روزِ قیامت) کہو کہ ہمارے پاس نہ بشارت دینے والا آیا ہے نہ ڈرانے والا (لہٰذا اب) بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (پیغمبر) تمھارے پاس آگیا ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں پھر روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے: اے اہلِ کتاب: اے یہود و نصاریٰ! ہمارا پیغمبر تمھاری طرف آیا ہے اور اس دور میں جب کہ انبیاء الٰہی کے درمیان فاصلہ اور وقفہ ہوچکا ہے اس نے تمھارے سامنے حقائق بیان کیے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ خدا کی طرف سے ہماری طرف کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا (یاھل الکتب قد جاء کم رسولنا یبین لکم علی فترة من الرسل ان تقولوا ما جاء نا من بشیر ولا نذیر)۔

"بشیر" اور "نذیر" یعنی پیغمبر اسلامؐ جنھوں نے صاحبِ ایمان اور نیک افراد کو خدا کی رحمت و جزا کی بشارت دی اور بے ایمان، گنہ گار اور آلودہ افراد کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا ایسا پیغمبر تمھاری طرف آگیا ہے (فقد جاء کم بشیر ونذیر)۔

"فترت" دراصل سکون و اطمینان کے معنی میں ہے۔ دو حرکات، دو کوششوں اور دو انقلابات کے درمیانی فاصلے کو بھی "فترت" کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے درمیان انبیاء مرسلین موجود تھے لیکن حضرت مسیحؑ اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیان یہ صورت نہیں تھی قرآن نے اس دور کا نام "فترت رسل" رکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور بعثتِ پیغمبرؐ کے درمیان



تقریباً چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔[1] لیکن جس طرف قرآن نے (سورۂ یٰس آیہ ۱۴ میں) اشارہ کیا ہے اور مفسرین اسلام کے قول کے مطابق ان دو پیغمبروں کے درمیانی عرصے میں کم از کم تین رسول آئے ہیں اور بعض ان کی تعداد چار سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ان رسولوں کی وفات اور رسولِ اسلامؐ کے درمیان فاصلہ تھا اسی لیے قرآن نے اس عرصے کو "فترت" قرار دیا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے اس مقام پر کہا جائے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق تو انسانی معاشرہ ایک لحظہ کے لیے بھی خدائی نمائندے اور اس کے بھیجے ہوئے افراد سے خالی نہیں ہو سکتا لہٰذا "فترت" کا ایسا دور کیونکر ہو سکتا ہے۔

توجہ رہے کہ قرآن کہتا ہے: "علی فترۃ من الرسل ......" یعنی اس دور میں رسول نہیں تھا۔ یہ بات اس کے خلاف نہیں کہ اس دور میں اوصیاء موجود ہوں۔

بہتر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ "رسول" ان ہستیوں کو کہتے ہیں جو وسیع و عریض تبلیغات پر مامور تھے۔ لوگوں کو بشارتیں اور نذارتیں دیتے تھے، معاشروں کا سکوت توڑتے تھے اور اپنی آواز تمام لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے تھے۔ لیکن سب کے سب اوصیاء ایسی ماموریت اور ذمہ داری نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ممکن ہے وہ بعض اجتماعی عوامل کی وجہ سے پوشیدہ طور پر لوگوں میں زندگی گزارتے ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ایک بیان میں فرماتے ہیں۔

اللھم بلی لا تخلوا الارض من قائم للہ بحجۃ اما ظاھرًا مشھورًا او خائفًا مغمورًا لئلا تبطل حجج اللہ و بیناتہ یحفظ اللہ بھم حججہ و بیناتہ حتی یودعوھا نظرائھم و یزرعوھا فی قلوب اشباھھم

ہاں روئے زمین ایسے شخص کے وجود سے ہرگز خالی نہیں ہوتی جو حجتِ خدا کے ساتھ قیام کرے، وہ آشکار اور مشہور ہو یا مخفی اور نہ پہچانا ہو تاکہ خدائی احکام، دلائل اور نشانیاں ختم نہ ہو جائیں (اور وہ انھیں تحریف اور دستبرد سے محفوظ رکھیں) خدا ان کے ذریعے اپنے دلائل اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے تاکہ وہ انھیں اپنے جیسے افراد تک پہنچا دیں، آہستہ آہستہ خرافات، شیطانی وسوسے، تحریفات اور تعلیماتِ الٰہی سے بے خبری پھیلتی رہے گی ایسے میں ممکن ہے کچھ لوگ ذمہ داریوں سے فرار کیلئے ایسی صورت کو بہانہ بنائیں تو اس صورت میں خدا آسمانی جوانمردوں کے ذریعے اس بہانے کو منقطع کر دیتا ہے۔[2]

---

[1] بعض لوگ ان دو عظیم پیغمبروں کے درمیانی عرصے کو چھ سو سال سے کم سمجھتے اور بعض زیادہ۔ کچھ کے بقول حضرت مسیحؑ کی ولادت اور پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت کے درمیان رومی سالوں کے حساب سے چھ سو اکیس سال اور ایک سو بچانوے دن کا فاصلہ ہے

(تفسیر ابو الفتوح رازی ج ۴ ص ۱۵۱ کے حاشیہ پر مرحوم شعرانی کی تحریر)

[2] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار، کلمہ ۱۴۷

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (و اللہ علی کل شیءٍ قدیر)
یعنی پیغمبروں کو بھیجنا اور ان کے جانشینوں کو دعوتِ حق کی نشر و اشاعت کے لیے بھیجنا اس کی قدرت کے سامنے
آسان سا کام ہے۔

۲۰۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○

۲۱۔ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا
تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○

۲۲۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖۗ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا
حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ○

۲۳۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ
الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

۲۴۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ
وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ○

۲۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

۲۶۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ
فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○ۧ



ترجمہ

۲۰- وہ وقت (یاد کرو) جب موسٰی نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم! تم پر خدا نے جو نعمت کی ہے اسے یاد رکھو۔ جب اس نے تمھارے درمیان انبیاء مقرر کیے (اور فرعونی استعمار کی زنجیر توڑ دی) اور تمھیں خود اپنا مختار بنا دیا اور تمھیں ایسی کئی چیزیں بخشیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیں۔

۲۱- اے قوم! سرزمینِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے اور اپنے پچھلے پاؤں نہ لوٹ جاؤ (اور پیچھے نہ ہٹو) کہ خسارے میں رہو گے۔

۲۲- وہ کہنے لگے: اے موسٰی! اس سرزمین میں ظالم رہتے ہیں جب تک وہ نہ نکل جائیں ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے، وہ نکل جائیں تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔

۲۳- ان لوگوں میں سے دو شخص جو خدا سے ڈرتے تھے اور خدا نے (عقل، ایمان اور شجاعت کی صورت میں) انھیں اپنی نعمت سے نوازا تھا کہنے لگے: ان کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ، جب تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے اور خدا پر توکّل کرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

۲۴- بنی اسرائیل کہنے لگے: اے موسٰی! جب تک وہ اس میں ہیں ہم ہرگز وہاں نہیں جائیں گے تُو اور تیرا پروردگار جائے اور (ان سے) جنگ کرے، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔

۲۵- موسٰی نے کہا: پروردگارا! میرا تو بس اپنے پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے، میرے اور اس گنہ گار جماعت کے درمیان جدائی ڈال دے۔

۲۶- خدا نے موسٰی سے فرمایا: یہ سرزمین چالیس سال تک ان کیلئے ممنوع ہے (اور یہ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے) اور ہمیشہ زمین میں سرگرداں رہیں گے اور اس گنہ گار جمعیت (کے انجام) کے بارے میں غمگین نہ ہو۔

تفسیر

بنی اسرائیل اور سرزمینِ مقدس

ان آیات میں یہودیوں میں روحِ حق شناسی بیدار کرنے، گذشتہ خطاؤں کے بارے میں ان کے شعور کو دعوت دینے اور



انھیں ان خطاؤں کی تلافی پر ابھارنے کے لیے فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ خدا نے تمھیں جو نعمتیں بخشی ہیں انھیں فراموش نہ کرو (و اذ قال موسٰی لقومہ یٰقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم) واضح ہے کہ " نعمۃ اللہ " کا مفہوم پروردگار کی تمام نعمات پر محیط ہے۔ لیکن یہاں ان کے تین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی نعمت یہ ہے کہ بہت سے انبیاء اور رہبران انہیں پیدا ہوئے یہ دراصل ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی (اذ جعل فیکم انبیاء) یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ صرف حضرت موسیٰ بن عمران کے زمانے میں ستّر سے زیادہ پیغمبر تھے۔ وہ تمام ستّر افراد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کوہ طور پر گئے تھے، انبیاء کے زُمرے میں آتے ہیں۔ اسی نعمت کی برکت سے وہ شرک، بت پرستی اور گوسالہ پرستی جیسی ہولناک مصیبتوں سے رہا ہوئے اور انھوں نے طرح طرح کے خرافات، موہومات قباحتوں اور نجاستوں سے نجات حاصل کی۔ یہ انکے لیے عظیم ترین نعمت تھی۔

ایک عظیم مادی نعمت تھی جو اپنے مقام پر روحانی نعمتوں کے لیے ایک مقدمہ بھی ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے تمھاری جان و مال اور زندگی کا اختیار خود تمھارے ہاتھ میں دے دیا (و جعلکم ملوکا) بنی اسرائیل سالہا سال سے فرعون اور فرعونیوں کی قید و بند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ان کے اپنے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔ ان کیساتھ قیدی جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا حضرت موسیٰ بن عمران نے حکم خدا سے قیام کیا اور انکے پاؤں میں پڑی غلامی اور استعمار کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا اور انھیں ان کی زندگی کا مختار بنا دیا۔

بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ " ملوک " سے یہاں مراد وہ بادشاہ اور سلاطین ہیں جو بنی اسرائیل میں سے ہوئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے پاس حکومت ایک مختصر سے دور کے لیے ہی رہی اور ان میں سے چند افراد ہی اس مقام تک پہنچے جب کہ آیت کہتی ہے: و جعلکم ملوکا ..... یعنی خدا نے تم سب کو یہ مقام عطا کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت سے مراد وہی کچھ ہے جو ہم نے سطور بالا میں کہا ہے علاوہ ازیں " ملک " (بروزن " الف ") لغت میں بادشاہ اور صاحب اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے[1]

درمنثور میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

کانت بنو اسرائیل اذا کان لاحدھم خادم و دابۃ و امراۃ کتب ملکا۔

---

[1] کتب لغت میں ہے:

الملک من کان لہ الملک و الملک ھو ما یملکہ الانسان و یتصرف بہ ــــ او ــ العظمۃ و السلطۃ

مَلِک وہ شخص ہے جو مِلک رکھتا ہو اور مِلک ان سب چیزوں کو کہتے ہیں جس کا انسان مالک ہو اور ان میں تصرف کرے۔



بنی اسرائیل میں سے جس شخص کے پاس غلام گھوڑا اور بیوی ہوتی اسے ملک کہتے تھے[1]

آیت کے آخر میں کلی طور پر ان اہم نعمتوں کا ذکر ہے جو اس زمانے میں کسی اور کو نہیں دی گئی تھی۔ تمھیں ایسی چیزیں دی گئیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھیں (و اٰتاکم مالم یؤت احدًا من العالمین)۔

ایسی طرح طرح کی بہت زیادہ نعمتیں تھیں ان میں سے یہ بھی تھیں کہ انھیں معجزانہ طور پر فرعون سے نجات ملی، ان کیلیے دریا شق ہوا اور مَن و سلویٰ جیسی خاص غذا انھیں میسر آئی۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۷ ۵ کے ذیل میں جلد اوّل (ص۲۱۴، اردو ترجمہ) میں گزر چکی ہے۔

اس کے بعد سرزمین مقدس میں بنی اسرائیل کے حدود کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے: موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سرزمین مقدس میں جسے خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے داخل ہو جاؤ۔ اس سلسلے میں مشکلات سے نہ ڈرو۔ فداکاری سے منہ نہ موڑو اور اگر تم نے اس حکم سے پیٹھ پھیری تو خسارے میں رہو گے (یقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم و لا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین)۔

آیت میں ارضِ مقدسہ سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے۔ بعض بیت المقدس کہتے ہیں کچھ اردن یا فلسطین کا نام لیتے ہیں اور بعض سرزمین طور سمجھتے ہیں، لیکن بعید نہیں کہ اس سے مراد منطقہ شامات ہو، جس میں تمام مذکورہ علاقے شامل ہیں کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ علاقہ انبیاء الٰہی کا گہوارہ، عظیم ادیان کے ظہور کی سرزمین اور طویل تاریخ میں توحید، خدا پرستی اور تعلیمات انبیاء کی نشر و اشاعت کا مرکز رہا ہے لہٰذا اسے سرزمین مقدس کہا گیا ہے اگرچہ بعض اوقات خاص بیت المقدس کو بھی ارضِ مقدس کہا جاتا ہے۔

"کتب اللہ علیکم" سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ بنی اسرائیل سرزمین مقدس میں امن و سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں (اس شرط کے ساتھ کہ اسے شرک اور بت پرستی سے پاک رکھیں اور خود بھی انبیاء کی تعلیم سے منحرف نہ ہوں) لیکن وہ اگر اس حکم پر کاربند نہ رہے تو انھیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ لہٰذا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی مخاطب بنی اسرائیل کی ایک نسل اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکی اور چالیس سال تک بیابان میں سرگرداں رہی اور ان کی اگلی نسل کو یہ توفیق ملی .... تو یہ بات "کتب اللہ لکم" (خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے) کے مفہوم کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ بات چند شرائط سے مشروط تھی جنھیں انھوں نے پورا نہیں کیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس حکم پر حضرت موسیٰ کو وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر کمزور، بزدل اور جاہل لوگ دیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ تمام کامیابیاں انھیں اتفاقاً اور معجزانہ طور پر ہی حاصل ہو جائیں یعنی لقمہ بھی کوئی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک جابر اور جنگجو گروہ رہتا ہے

---

[1] المیزان جلد ۵ ص۳۱۹، تفسیر طبری ج ۶ ص۱۰۱ میں بھی یہ روایت نقل ہے۔

جب تک وہ اسے خالی کر کے باہر نہ چلا جائے ہم تو اس علاقے میں قدم تک نہیں رکھیں گے۔ اسی صورت میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور سرزمینِ مقدّس میں داخل ہوں گے (قالوا یموسی ان فیھا قوما جبارین[۱] و انا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا فان یخرجوا منھا فانا داخلون)۔

بنی اسرائیل کا یہ جواب اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ طویل فرعونی استعمار نے ان کی نسلوں پر کیسا منحوس اثر چھوڑا تھا۔ لفظ "لن" جو دائمی نفی پر دلالت کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ سرزمینِ مقدّس کی آزادی کے لیے مقابلے سے کس قدر خوفزدہ تھے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل سعی و کوشش کرتے، جہاد و قربانی کے جذبے سے کام لیتے اور سرزمینِ مقدّس پر قبضہ کر لیتے اگر فرض کریں کہ سنّتِ الٰہی کے برخلاف بغیر کسی اقدام کے ان کے تمام دشمن معجزانہ طور پر نابود ہو جاتے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے وہ وسیع علاقے کے وارث بن جاتے تو اس کا نظام چلانے اور اس کی حفاظت میں بھی ناکام رہتے۔ بغیر زحمت سے حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت سے انہیں کیا سروکار ہو سکتا تھا نہ وہ اس کے لیے تیار ہوتے اور نہ اہل۔

جیسا کہ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے آیت میں قوم جبار سے مراد قوم عمالقہ[۲] ہے یہ لوگ سخت جان اور بلند قامت تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بلند قامت کے بارے میں بہت مبالغے ہوئے اور افسانے تراشے گئے۔ اس سلسلے میں مضحکہ خیز باتیں گھڑی گئیں جن کے لیے کوئی عملی دلیل نہیں ہے۔

خصوصاً "عوج" کے بارے میں خرافات سے معمور ایسی کہانیاں تاریخوں میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افسانے جن میں سے بعض اسلامی کتب میں بھی آ گئے ہیں، دراصل بنی اسرائیل کے گھڑے ہوئے ہیں انھیں عام طور پر "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خود موجودہ تورات کے متن میں ایسے افسانے دکھائی دیتے ہیں۔ سفر اعداد کی تیرہویں فصل کے آخر میں ہے:

> اس زمین کے بارے میں جس کے تجسّس میں (بنی اسرائیل کے جاسوس) گئے ہوئے تھے انھوں نے آکر ایک بری خبر دی۔ وہ کہنے لگے کہ جس زمین کے بارے میں ہم تجسّس کرنے گئے ہوئے تھے جب ہم اس کے نزدیک سے گزرے تو دیکھا کہ وہ ایسی زمین ہے جو اپنے رہنے والوں کو تلف کر

---

[۱] توجہ رہے کہ لفظ "جبار" اصل میں مادہ "جبر" سے ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کی قوت سے اور زبردستی اصلاح کرنا۔ اسی لیے ٹوٹی ہوئی ہڈی باندھنے کو "جبر" کہتے ہیں۔ بعدازاں ایک طرف ہر طرح کی اصلاح اور دوسری طرف ہر طرح کے تسلّط اور غلبہ کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا خدا کو بھی جبار اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تمام چیزوں پر تسلّط رکھتا ہے یا ہر محتاج کی اصلاح کرتا ہے۔

[۲] عمالقہ، سام کی اولاد میں سے ایک قوم تھی یہ لوگ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں صحرائے سینا کے نزدیک رہتے تھے وہ مصر پر حملہ آور ہوئے اور مدتوں اس پر قابض رہے ان کی حکومت کا عرصہ تقریباً ۵۰۰ سال تھا (۲۲۱۳ ق م سے لے کر ۱۷۰۳ ق م تک)۔

(دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶ صفحہ ۲۳۲ طبع سوم)



دیتی ہے اور اس میں ہم نے جتنے لوگوں کو دیکھا سب بلند قامت تھے۔ وہاں ہم نے بلند قدوالوں یعنی اولادِ عناق جو بلند قامت ہیں کو دیکھا ہے ہمیں ایسا لگا جیسے ہم ٹڈی دل ہیں اور خود ان کی نگاہوں میں بھی ہم ایسے ہی تھے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اس وقت اہلِ ایمان میں سے دو افراد ایسے تھے جن کے دل میں خوفِ خدا تھا اور اس بنا پر انھیں عظیم نعمتیں میسر تھیں ان میں استقامت و شجاعت بھی تھی، وہ دور اندیش بھی تھے اور اجتماعی اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی بصیرت رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دفاعی تجویز کی حمایت کی اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے: تم شہر کے دروازے سے داخل ہو جاؤ اور اگر تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے (قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غٰلبون) لیکن ہر صورت میں تمھیں روحِ ایمان سے مدد حاصل کرنا چاہیے خدا پر بھروسہ کرو تاکہ اس مقصد کو پا لو (و علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین)۔

اس بارے میں کہ یہ دو آدمی کون تھے؟ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا (یوفنہ بھی لکھتے ہیں) تھے جو بنی اسرائیل کے نقیبوں میں سے تھے کہ جن کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔[1]

من الذین یخافون ...... کی تفسیر میں بھی کئی احتمالات پیش کیے گئے ہیں لیکن واضح ہے کہ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ دونوں مرد ایسے تھے جو خدا سے ڈرتے تھے اسی لیے تو انھیں غیرِ خدا کا کوئی خوف نہ تھا۔

انعم اللہ علیھما ...... خدا نے ان پر فراواں نعمت کی ...... یہ جملہ بھی مندرجہ بالا مفہوم کا شاہد ہے کیونکہ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو گی کہ انسان صرف اللہ سے ڈرے نہ کہ اس کے غیر سے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ دو شخص کیسے جانتے تھے کہ اگر بنی اسرائیل اچانک حملہ کر کے شہر میں داخل ہو جائیں تو عمالقہ شکست کھا جائیں گے۔

شاید یہ اس لیے ہو کہ وہ موسیٰ بن عمران کے وعدۂ فتح و نصرت پر اعتماد رکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تمام جنگوں کا ایک یہ اصول ہے کہ اگر حملہ آور فوج اپنے دشمن کے اصلی مرکز پر جا پہنچے یعنی اس کے گھر میں جا کر لڑے، تو عام طور پر کامیاب ہو جاتی ہے۔[2]

علاوہ ازیں جیسا کہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ عمالقہ ایک تنومند اور قوی ہیکل قوم تھی (البتہ ان کے بارے میں افسانوی پہلوؤں کا ہم نے انکار کیا ہے) اور ایسی قوم بیابانی جنگ میں اپنی مہارت کا بہتر مظاہرہ کر سکتی ہے لیکن شہر کے گلی کوچوں میں ویسا نہیں

---

[1] موجودہ تورات کے سفرِ تثنیہ باب اول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دو افراد کے نام یوشع اور کالب تھے۔

[2] نہج البلاغہ میں بھی خطبہ جہاد میں اس جنگی حکمتِ عملی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

فو اللہ ما غزی قوم فی عقر دارھم الا ذلوا

بخدا جس قوم پر بھی اس کے گھر میں حملہ کیا گیا، وہ ذلیل ہوئی۔ (خطبہ ۲۷)



لڑسکتی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ لوگ تومند اور قوی ہیکل ہونے کے باوجود ڈرپوک تھے اور اچانک حملے سے جلدی مرعوب ہوجاتے۔ ان تمام امور کے باعث ان دو افراد نے بنی اسرائیل کی کامیابی کی ضمانت دی تھی۔ مگر بنی اسرائیل نے یہ تجویز قبول نہ کی اور ضعف و کمزوری جوان کی روح پر قبضہ کر چکی تھی، کے باعث انھوں نے صراحت سے حضرت موسیٰؑ سے کہا: جب تک وہ لوگ اس سرزمین میں ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، تم اور تمھارا پروردگار جس نے تم سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے، جاؤ اور عمالقہ سے جنگ کرو اور جب کامیاب ہوجاؤ تو ہمیں بتادینا ہم یہیں بیٹھے ہیں (قالوا یموسی انا لن ندخلها ابدا ما داموا فیها فاذهب انت و ربك فقاتلا انا ههنا قاعدون)۔

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے سامنے جسارت کی انتہا کر دی تھی، کیونکہ پہلے تو انھوں نے لفظ "لن" اور "ابدا" استعمال کرکے اپنی صریح مخالفت کا اظہار کیا اور پھر یہ کہا کہ تم اور تمھارا پروردگار جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں...... انھوں نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے وعدوں کی تحقیر کی یہاں تک کہ خدا کے ان دو بندوں کی تجویز کی بھی پرواہ نہیں کی اور شاید انھیں تو کوئی مختصر سا جواب تک نہیں دیا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ توراۃ میں بھی اس داستان کے بعض اہم حصے موجود ہیں۔ یہ تو سفر اعداد باب ۱۴ میں ہے، جہاں مذکور ہے:

> تمام بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر معترض ہوئے اور سب انھیں کہنے لگے کہ کاش ہم سرزمین مصر ہی میں مر گئے ہوتے یا پھر کسی جنگل بیابان میں مر جاتے۔ خدا اس زمین میں ہمیں کیوں لے آیا ہے کہ جہاں ہم تلوار زنی کا شکار ہوجائیں اور ہماری عورتیں اور بچے لوٹ کا مال بن جائیں...... پس موسیٰ اور ہارون بنی اسرائیلی عوام کے سامنے منہ کے بل گر پڑے اور یوشع بن نون اور کالیب بن یفنہ جو زمین کے متجسسین میں سے تھے انھوں نے اپنا گریبان چاک کرلیا۔

اگلی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں سے بالکل مایوس ہوگئے اور انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور ان سے علیحدگی کے لیے یوں تقاضا کیا: پروردگارا! میرا تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے: خدایا! ہمارے اور اس فاسق و سرکش گروہ میں جدائی ڈال دے تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں اور ان کی اصلاح ہوجائے (قال رب انی لا املك الا نفسی واخی فافرق بیننا و بین القوم الفسقین)۔

البتہ بنی اسرائیل نے جو کام کیا تھا یعنی اپنے پیغمبر کے حکم صریح کی نافرمانی وہ کفر کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اور اگر قرآن نے انھیں فاسق کا لقب دیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ "فاسق" ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر طرح کی عبودیت اور خدا کی بندگی سے خارج ہونے کا مفہوم شامل ہے اسی لیے شیطان کے بارے میں ہے:

> ففسق عن امر ربه
>
> وہ فرمانِ خدا کے مقابلے میں فاسق ہوگیا اور اس نے مخالفت کی۔
>
> (کہف ...... ۵۰)



اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ گذشتہ آیات میں "مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں اقلیت میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ یوشع اور کالیب ایسے ہی افراد میں سے تھے لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اپنا اور اپنے بھائی ہارونؑ ہی کا نام لیتے ہیں اور ان دونوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ حضرت ہارونؑ ایک تو حضرت موسیٰؑ کے جانشین تھے اور دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ افضل تھے لہٰذا خصوصیت سے ان کا نام لیا گیا ہے۔

آخرکار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اپنے ان بُرے اعمال کے انجام سے دوچار ہوئے۔ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو وحی ہوئی: یہ لوگ اس مقدس سرزمین سے چالیس سال تک محروم رہیں گے جو طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمات سے مالامال ہے (قال فانها محرمة عليهم اربعين سنة) علاوہ ازیں ان چالیس سالوں میں انھیں اس بیابان میں سرگرداں رہنا ہوگا (يتيهون في الارض)[1] اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے: اس قوم کے سر پر جو کچھ بھی آئے وہ صحیح ہے، ان کے اس انجام پر کبھی غمگین نہ ہونا (فلا تأس على القوم الفسقين)۔

آخری جملہ شاید اس لیے ہو کہ جب بنی اسرائیل کے لیے یہ فرمان صادر ہوا کہ وہ چالیس سال تک سزا کے طور پہ بیابان میں سرگرداں رہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جذبۂ مہربانی پیدا ہوا ہو اور شاید انھوں نے درگاہِ خداوندی میں ان کے لیے عفو و درگذر کی درخواست بھی کی ہو جیسا کہ موجودہ تورات میں بھی ہے لیکن انھیں فوراً جواب دیا گیا کہ وہ اس سزا کے مستحق ہیں نہ کہ عفو و درگذر کے، کیونکہ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ وہ فاسق اور سرکش لوگ تھے اور جو ایسے ہوں ان کے لیے یہ انجام حتمی ہے۔

توجہ رہے کہ ان کے لیے چالیس سال کی یہ محرومیت انتقامی جذبے سے نہ تھی (جیسا کہ خدا کی طرف سے کوئی سزا بھی ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ یا اصلاح کے لیے ہوتی ہے اور یا عمل کا نتیجہ) درحقیقت اس کا ایک فلسفہ تھا اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک فرعونی استعمار کی ضربیں جھیل چکے تھے۔ اس عرصے میں حقارت آمیز رسومات، اپنے مقام کی عدم شناخت اور احساساتِ ذلت کا شکار ہو چکے تھے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم رہبر کی سرپرستی میں اس تھوڑے سے عرصے میں اپنی روح کو ان خامیوں سے پاک نہیں کر سکے تھے اور وہ ایک ہی جست میں افتخار، قدرت اور سربلندی کی نئی زندگی کے لیے تیار نہیں ہو پائے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں مقدس سرزمین کے حصول کیلئے جہادِ آزادی کا جو حکم دیا تھا اس پر عمل نہ کرنے کے لیے انھوں نے جو کچھ کہا وہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایک طویل مُدّت وسیع بیابانوں میں سرگرداں رہیں اور اس طرح ان کی ناتواں اور غلامانہ ذہنیت کی حامل موجودہ کمزور نسل آہستہ آہستہ ختم ہو جائے اور نئی نسل حریت و آزادی کے ماحول میں اور خدائی تعلیمات کی آغوش میں پروان چڑھے تاکہ وہ اس قسم کے جہاد کے لیے اقدام کر سکے اور اس طرح سے اس سرزمین پر حق کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

---

[1] یتیہون کا مادہ "تیہ" ہے جس کا معنی ہے سرگردانی۔ بعد ازاں "تیہ" اس بیابان کا نام ہو گیا جس میں بنی اسرائیل سرگرداں رہے۔ جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ جلد اول (ص ۲۱۳، اردو ترجمہ) میں بیان کر چکے ہیں یہ صحراء صحرائے سینا کا ایک حصہ ہے۔



۲۷۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ
اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا
يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝
۲۸۔ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۲۹۔ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ
ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۷۔ آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ ان کے سامنے پڑھیے جبکہ ان میں سے ہر ایک نے (پروردگار کے) تقرب کیلیے ایک کام کیا مگر وہ ایک کا (عمل) تو قبول ہوگیا، لیکن دوسرے سے قبول نہ کیا گیا (وہ بھائی جس کا عمل قبول نہیں ہوا تھا دوسرے بھائی سے) کہنے لگا: خدا کی قسم میں تجھے قتل کردوں گا۔ (دوسرے بھائی نے) کہا: (میں نے کونسا گناہ کیا ہے، کیونکہ) خدا تو صرف پرہیزگاروں سے قبول کرتا ہے۔

۲۸۔ اگر تو میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھائے تو میں تو تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں عالمین کے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔

۲۹۔ میں تو چاہتا ہوں کہ (تو یہ عمل انجام دے کر) میرا اور اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹے اور (دونوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے) تو جہنمیوں میں سے ہوجائے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے۔

تفسیر

روئے زمین پر پہلا قتل

ان آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کے قتل کے

بارے میں داستان بیان کی گئی ہے۔ ان آیات کا گذشتہ آیات سے شاید یہ ربط ہو کہ بنی اسرائیل کے بہت سے غلط اعمال کا سبب حسد تھا ان آیات کے ذریعے خدا تعالیٰ انھیں متوجہ کر رہا ہے کہ حسد کا انجام کتنا ناگوار اور ہولناک ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ایک بھائی اپنے بھائی کے خون سے بھی ہاتھ رنگین کر لیتا ہے پہلے فرمایا: اے پیغمبر! انھیں آدم کے دو بیٹوں کا حقیقی قصہ سنا دیجیے (واتل علیھم نبا ابنی اٰدم بالحق)۔

" بالحق " ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ مذکورہ سرگذشت عہد قدیم (تورات) میں بڑی خرافات کی آمیزش کے ساتھ بیان کی گئی ہے لیکن قرآن میں اس کی حقیقت و واقعیت کو بیان کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں " آدم " سے مراد وہی مشہور آدم ہیں جو موجودہ نسل انسانی کے پہلے باپ ہیں اور یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد آدم بنی اسرائیل میں سے ایک فرد تھا، بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے اور اگر یہاں کوئی اور معنی مراد ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی قرینہ ہوتا باقی رہی آیت " من اجل ذٰلک ..." کہ جس کی تفسیر عنقریب آئے گی جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے ہرگز اس معنی کے لیے قرینہ قرار نہیں پا سکتی۔

اس کے بعد واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ہر ایک نے تقرب پروردگار کے لیے ایک کام انجام دیا تو ایک کا عمل تو قبول کر لیا گیا لیکن دوسرے کا قبول نہ ہوا (اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاٰخر)

اسی وجہ سے جس کا عمل قبول نہ ہوا تھا اس نے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی اور قسم کھا کر کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا (قال لاقتلنک)۔

لیکن دوسرے بھائی نے اسے نصیحت کی اور کہا کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ اعتراض تو تجھ پر ہونا چاہیے کیونکہ تیرے عمل میں تقویٰ شامل نہیں تھا اور خدا تو صرف پرہیزگاروں کا عمل قبول کرتا ہے (قال انما یتقبل اللہ من المتقین) مزید کہا کہ حتیٰ اگر تم اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ اور میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھاؤ تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور تمھارے قتل کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا (لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیک لاقتلک) کیونکہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور ایسے گناہ سے ہرگز اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کروں گا (انی اخاف اللہ رب العٰلمین) علاوہ ازیں میں نہیں چاہتا کہ دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لوں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہی میرے اپنے گناہ کا بار اپنے کندھے پر اٹھا لو (کیونکہ اگر واقعاً تم اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ تو میرے گذشتہ گناہوں کا بوجھ بھی تمھارے کندھوں پر آپڑے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم مجھ سے حق حیات چھینو گے تو تاوان بھی تمھی کو دینا ہوگا اور چونکہ تمھارے پاس کوئی صالح عمل نہیں ہے لہٰذا میرے گناہ تمھیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوں گے (انی ارید ان تبوء[1] باثمی و اثمک)۔

✧ ✧ ✧

---

[1] " تبوء " مادہ " بواء " سے ہے اور اس کا معنی ہے " بازگشت "۔

اور مسلّم ہے کہ یہ بوجھ اٹھا کر تم جہنمیوں میں سے ہو جاؤ گے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے (فتکون من اصحٰب النار و ذٰلک جزٰؤا الظّٰلمین)۔

چند اہم نکات

آدم کے بیٹوں کے نام: ۱۔ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا نام نہیں لیا گیا ہے، نہ اس جگہ اور نہ کسی اور مقام پر لیکن اسلامی روایات کے مطابق ایک کا نام ہابیل ہے اور دوسرے کا قابیل۔ موجودہ تورات کے سفر تکوین کے چوتھے باب میں ایک کا نام قائن مذکور ہے اور دوسرے کا ہابیل۔ جیسا کہ مشہور مفسر ابوالفتح رازی کہتے ہیں ہر ایک کے نام میں چند لغوی پہلو ہیں۔ پہلے کا نام "ہابیل"، "ہابل" یا "ہابن" تھا اور دوسرے کا نام "قابیل"، "قابن" یا "قبن" تھا۔ بہرحال اسلامی روایات اور تورات کے متن میں قابیل کے نام کے بارے میں اختلاف لغت کی طرف بازگشت ہے اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم نے اس امر کو قرآن پر اعتراض کی بنیاد بنالیا ہے کہ قرآن نے "قائن" کو "قابیل" کیوں کہا ہے حالانکہ اوّل تو یہ اختلافِ لغت ہے اور لغت میں ناموں کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے مثلاً تورات "ابراہیم" کو "ابراہام" لکھتی ہے اور قرآن اسے "ابراہیم" لکھتا ہے۔ ثانیاً بنیادی طور پر "ہابیل" اور "قابیل" کے نام قرآن میں مذکور ہی نہیں یہ اسماء تو اسلامی روایات میں آئے ہیں۔[1]

۲۔ "قربان" کا مفہوم: ہم جانتے ہیں کہ "قربان" ایسی چیز کو کہتے ہیں جو تقربِ الٰہی کا باعث بنے مگر جو کام ان دونوں بھائیوں نے انجام دیا اس کا قرآن میں تذکرہ موجود نہیں ہے بعض اسلامی روایات اور تورات کے سفر تکوین باب چہارم میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہابیل کے پاس چونکہ پالتو جانور تھے اس نے ان میں سے ایک بہترین پلا ہوا مینڈھا منتخب کیا قابیل کسان تھا اس نے گندم کا گھٹیا حصہ یا گھٹیا آٹا اس کے لیے منتخب کیا۔

۳۔ قبولیت کی دلیل کیا تھی: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرزندانِ آدمؑ کو کیسے پتہ چلا کہ ایک کا عمل بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو گیا ہے اور دوسرے کا عمل رد کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کی بھی وضاحت نہیں ہے البتہ بعض اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں اپنی مہیا شدہ چیزیں پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے قبولیت کے اظہار کے طور پر بجلی نے ہابیل کی قربانی کھالیا اور اسے جلا دیا لیکن دوسری اپنی جگہ پر باقی رہی اور یہ نشانی پہلے سے مروج تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ایک عمل کی قبولیت دوسرے کا ردّ حضرت آدمؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ہابیل ایک باصفا، باکردار اور راہِ خدا میں سب کچھ کر گزرنے والا شخص تھا جبکہ قابیل تاریک دل، حاسد اور ہٹ دھرم تھا۔ قرآن نے دونوں بھائیوں کی جو گفتگو بیان کی ہے اس سے ان کی روحانی کیفیت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔

۱؎ علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نے اس سلسلے میں ایک رسالہ "الاکاذیب الاعاجیب" (تعجب انگیز جھوٹ) کے نام سے لکھا ہے جس میں مذکورہ جھوٹ کی طرح کے کئی جھوٹ بتائے گئے ہیں اس رسالے کا فارسی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔



۴۔ ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے : ان آیات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ جہانِ انسانیت میں اختلاف ، قتل تجاوز اور ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی رذالت کے حوالے سے حسد کا مقام کس قدر پست ہے ۔ بہت سے اجتماعی اور معاشرتی امور پر اس کے گہرے منفی اثرات بھی اس سے ظاہر ہوتے ہیں ۔

۳۰۔ فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

۳۱۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ أَخِيهِ ۚ قَالَ يٰوَيْلَتٰى أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِيْ ۚ فَأَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۰۔ نفسِ سرکش نے آہستہ آہستہ اسے بھائی کے قتل کے لیے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا ، اور وہ زیاں کاروں میں سے ہو گیا ۔

۳۱۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین میں کوشش کرتا (اور اسے کھودتا) تاکہ وہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کا جسم زمین میں کیسے دفنائے ۔ تو وہ کہنے لگا وائے ہو مجھ پر کہ میں اس کوے جیسا (بھی) نہیں ہو سکا کہ اپنے بھائی کو دفن کرتا اور آخر کار وہ (رسوائی کے خوف اور وجدان کے دباؤ سے اپنے کام پر) پشیمان ہوا ۔

تفسیر

ظلم پر پردہ پوشی

ان آیات میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ ، ایک بھائی کا دوسرے کے ہاتھوں قتل اور قتل کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں ، پہلے فرمایا : سرکش نفس نے بھائی کے قتل کے لیے اسے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا (فطوعت له نفسه قتل اخيه فقتله) ۔

"طوع" کا معنی ہے کسی چیز کا رام اور مطیع ہونا ۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہابیل کا عمل قبول ہو جانے کے بعد قابیل کے دل میں ایک طوفان پیدا ہو گیا ایک طرف دل میں ہر وقت حسد کی آگ بھڑکتی رہتی اور اسے انتقام پر ابھارتی اور دوسری طرف بھائی کا رشتہ ، انسانی جذبہ اور گناہ ، ظلم ، بے انصافی اور قتلِ نفس سے ذاتی تنفر اسے اس جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ، لیکن آخر کار سرکش نفس



آہستہ آہستہ روکنے والے عوامل پر غالب آگیا اور اس نے اس کے بیدار وجدان کو رام کرلیا اور اسے جکڑ دیا اور بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ کرلیا "طوعت" ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس سارے مفہوم کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کسی کو ایک ہی لمحے میں رام نہیں کیا جاسکتا بلکہ ایسا تدریجی طور پر کئی طرح کی کشمکش کے بعد عمل میں آتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس کام کے نتیجے میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگیا (فاصبح من الخاسرین) اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ ہوگا کہ اس نے وجدان کا عذاب، خدا کی طرف سے سزا اور قیامت تک کے لیے اپنے نام پر ننگ و عار خرید لی۔

"اصبح" سے بعض نے یہ استفادہ کیا ہے کہ یہ قتل رات کے وقت ہوا حالانکہ یہ لفظ لغتِ عرب میں رات یا دن کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ کسی چیز کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے، مثلاً سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۰۳ میں ہے:

"فاصبحتم بنعمته اخوانًا"

نعمتِ خدا کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے جب اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اس کی لاش اس نے صحرا میں ڈال رکھی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے زیادہ دیر نہ گذری کہ درندے ہابیل کے جسم کی طرف آنے لگے۔ قابیل ضمیر کے شدید دباؤ کا شکار تھا بھائی کے جسم کو بچانے کے لیے وہ لاش کو ایک مدت تک کندھے پر لیے پھرتا رہا، کچھ پرندوں نے پھر بھی اسے گھیر رکھا تھا اور وہ اس انتظار میں تھے کہ وہ کب اسے زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ لاش پر جھپٹ پڑیں [1]

جیسا کہ قرآن کہتا ہے اس موقع پر خدا تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ زمین کھودے اور اس میں دوسرے مُردہ کوّے کا جسم چھپا دے یا اپنے کھانے کی چیزوں کو زمین میں چھپا دے جیسا کہ کوّے کی عادت ہے تاکہ قابیل سمجھ سکے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح سپردِ خاک کرے (فبعث الله غرابًا یبحث فی الارض لیریه کیف یواری سوأة اخیه) [2]

البتہ اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ انسان کوئی چیز کسی پرندے سے سیکھے کیونکہ تاریخ اور تجربہ شاہد ہیں کہ بہت سے جانور طبعی طور پر بعض معلومات رکھتے ہیں اور انسان نے اپنی پوری تاریخ میں جانوروں سے بہت کچھ سیکھا ہے یہاں تک کہ میڈیکل کی

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] "یبحث" "بحث" کے مادہ سے ہے جیسا کہ مجمع البیان میں ہے دراصل یہ لفظ مٹی میں سے کسی چیز کو تلاش کرنے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ہر طرح کی جستجو حتیٰ کہ عقلی و فکری مباحث کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور "سوأة" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو پسند نہ آئے اس لیے کبھی شرمگاہ تک کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ضمناً توجہ رہے کہ "لیریه" کا فاعل ممکن ہے خدا ہو، یعنی خدا چاہتا تھا کہ ہابیل کا احترام ملحوظ رہے اور اس کے لیے قابیل کو اسے دفن کرنے کا طریقہ سکھائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا فاعل وہی کوا ہو کہ جس نے حکمِ خدا سے یہ کام انجام دیا۔



بعض کتب میں ہے کہ انسان اپنی بعض طبی معلومات میں حیوانات کا مرہونِ منت ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: اس وقت قابیل اپنی غفلت اور جہالت سے پریشان ہوگیا اور چیخ اٹھا کہ وائے ہو مجھ پر، کیا میں اس کوّے سے بھی زیادہ ناتواں اور عاجز ہوں، مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کی طرح اپنے بھائی کا جسم دفن کروں (قال یا ویلتی اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاواری سوأۃ اخی) بہرحال وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہوا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: (فاصبح من النادمین)

کیا اس کی پشیمانی اس بنا پر تھی کہ اس کا گھٹیا اور برا عمل آخرکار اس کے ماں باپ پر اور احتمالی طور پر جو دوسرے بھائی تھے ان پر آشکار ہو جائے گا اور وہ اسے بہت سرزنش کریں گے ——— یا کیا یہ پشیمانی اس بنا پر تھی کہ کیوں میں ایک مدت تک بھائی کی لاش کندھے پر لیے پھرتا رہا اور اسے دفن نہ کیا اور یا پھر کیا یہ ندامت اس وجہ سے تھی کہ اصولی طور پر انسان ہر برا کام انجام دے لینے کے بعد اپنے دل میں ہر طرح کی پریشانی اور ندامت محسوس کرتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس کی ندامت کی جو بھی وجہ ہو وہ اس کے گناہ سے توبہ کی دلیل نہیں ہے کیونکہ توبہ یہ ہے کہ ندامت خوفِ خدا کے باعث اور عمل کے برا ہونے کے احساس کی بنا پر ہو اور یہ احساس اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسا کام نہیں کرے گا۔ قرآن میں قابیل کی ایسی کسی توبہ کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ بلکہ شاید اگلی آیت میں ایسی توبہ کے نہ ہونے کی طرف ہی اشارہ ہے۔

پیغمبر اسلام سے ایک حدیث منقول ہے، آپ نے فرمایا:

"لا تقتل نفس ظلماً الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمھا لانہ کان اول من سن القتل"[1]

جس کسی انسان کا بھی خون بہایا جاتا ہے اس کی جوابدہی کا ایک حصہ قابیل کے ذمہ ہوتا ہے کہ جس نے انسان کشی کی اس بری سنت کی دنیا میں بنیاد رکھی تھی۔

اس حدیث سے ضمناً یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر بری اور منحوس سنت جو دنیا میں باقی ہے اس کی سزا کا ایک حصہ اس شخص کے کندھے پر ہے جو اس کی بنیاد رکھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا یہ واقعہ ایک حقیقی واقعہ ہے اس کے علاوہ کہ آیات قرآن اور اسلامی روایات کا ظاہری مفہوم اس کی واقعیت کو ثابت کرتا ہے اس کے "بالحق" کی تعبیر بھی جو ان آیات میں آئی ہے اس بات پر شاہد ہے لہٰذا جو لوگ ان آیات میں بیان کیے گئے واقعہ کو تشبیہ، کنایہ یا علامتی (SYMBOLIC) داستان سمجھتے ہیں، بغیر دلیل کے ایسا کرتے ہیں۔

اس کے باوجود اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ حقیقی واقعہ اس جنگ کے لیے نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا ہو جو ہمیشہ سے مردانِ پاکباز، صالح و مقبولِ بارگاہِ خدا انسانوں اور آلودہ، منحرف، کینہ پرور، حاسد اور ناجائز ہٹ دھرمی کرنے والوں کے درمیان

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۲ صفحہ ۷۰۳۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ مسند احمد بن حنبل

جاری رہی ہے۔ وہ لوگ کتنے پاکیزہ اور عظیم ہیں جنھوں نے ایسے بُرے لوگوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

آخرکار یہ بُرے لوگ اپنے شرمناک اور بُرے اعمال کے انجام سے آگاہ ہوجاتے ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے اور انھیں دفن کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں اس موقع پر ان کی آرزوئیں ان کی مدد کو لپکتی ہیں۔ گوا ان آرزوؤں کا مظہر ہے جو جلدی سے پہنچتا ہے اور انھیں ان کے جرائم پر پردہ پوشی کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن آخرکار انھیں خسارے، نقصان اور حسرت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

۳۲۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ○

ترجمہ

۳۲۔ اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قرار دیا کہ جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ ارتکاب قتل کرے اور روئے زمین پر فساد پھیلائے قتل کرے تو یہ اس طرح ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو قتل سے بچائے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی ہے اور ہمارے رسول واضح دلائل کے ساتھ بنی اسرائیل کی طرف آئے پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگوں نے روئے زمین پر ظلم اور تجاوز کیا۔

تفسیر

انسانی رشتہ

حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں ایک عمومی نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے:

اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قرار دیا کہ جب کوئی انسان کسی شخص کو ارتکاب قتل اور زمین پر فساد پھیلانے کے جرم کے بغیر قتل کردے تو ایسے ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو موت سے بچالے، ایسے ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو موت سے بچالیا (من اجل[1] ذٰلك كتبنا علی بنی اسرائیل انه من قتل نفسًا بغیر نفس

[1] "اجل" (بروزن "نخل") دراصل "جرم" کے معنی میں۔ بعدازاں ہر اس کام کو اجل کہا جانے لگا جس کا انجام ناگوار ہو اور اب زیادہ تر تعلیل اور کسی چیز کی علت بیان کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔



اوفسادا فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعًا)۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ایک انسان کا قتل سب انسانوں کے قتل کے برابر کیسے ہوسکتا ہے اور اسی طرح ایک انسان کو بچا لینا سب کی نجات کیسے قرار پا سکتا ہے۔

مفسرین نے بہت سے جوابات دیے ہیں تفسیر تبیان میں چھ جواب ہیں، مجمع البیان میں پانچ اور کنز العرفان میں چار جواب دیئے گئے ہیں ان میں سے بعض جوابات تو آیت کے معنی سے بہت دور ہوگئے ہیں۔

بہر حال مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں ایک اجتماعی اور تربیتی حقیقت بیان کرتا ہے۔ درحقیقت جو شخص کسی بے گناہ کے خون میں ہاتھ رنگتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ وہ اس مقتول جیسے دیگر بے گناہ انسانوں پر بھی حملہ کرکے انہیں قتل کر دے وہ حقیقت میں ایک درندہ ہے جس کی غذا بے گناہ انسان ہیں ہم جانتے ہیں کہ اس لحاظ سے بے گناہ انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جو شخص بھی انسانی جذبے اور انسان دوستی کی بنیاد پر ایک انسان کو موت سے نجات دیتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ ایسا سلوک ہر انسان کے ساتھ کرے۔ وہ بے گناہ انسانوں کی نجات سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی نگاہ میں اس انسان میں اور اُس انسان میں کوئی فرق نہیں اور قرآن جو یہ کہتا ہے: فکانما........ (یعنی..... یہ ایسے ہے گویا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی موت یا حیات اگرچہ پورے معاشرے کی موت یا حیات کے برابر نہیں لیکن اس سے شباہت ضرور رکھتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانی معاشرہ درحقیقت ایک ہی اکائی ہے اس کے افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں۔ جو تکلیف اس پیکر کے ایک عضو کو پہنچتی ہے اس کا اثر کم و بیش تمام اعضاء پر ظاہر ہوتا ہے، معاشرہ افراد سے بنتا ہے ایک فرد کی نابودی سے پورے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے ایک فرد کا فقدان اس کے وجود کے اثرات کی مناسبت سے معاشرے کے ایک حصے کا فقدان ہے یوں یہ نقصان پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نفس کی زندگی اس جسم کے باقی اعضاء کی زندگی کا سبب ہے کیونکہ ہر کوئی اپنے وجود کی حیثیت کے اعتبار سے انسانی معاشرے کی عظیم عمارت میں اس کی ضرورت و احتیاج کو پورا کرتا ہے، کوئی زیادہ کردار ادا کرتا ہے اور کوئی کم۔

یہ جو بعض روایات میں ہے کہ ایسے انسان کی سزا قیامت میں اس شخص کی سی ہے جس نے تمام انسانوں کو قتل کیا ہو، دراصل یہ بھی اسی مذکورہ مفہوم کی طرف اشارہ ہے نہ یہ کہ ایک انسان ہر لحاظ سے تمام بنی نوع انسان کے برابر ہے اسی لیے ان روایات میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بہت سے افراد کو قتل کرے تو سزا بھی اسی نسبت سے بڑھ جائے گی۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کی نظر میں ایک انسان کی موت یا حیات کس قدر اہمیت رکھتی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیات ایسے ماحول میں نازل ہوئیں جس میں انسانی خون کی کوئی قیمت نہ تھی، اس کی عظمت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

یہ قابلِ توجہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ آیت ظاہری طور پر اگرچہ مادی موت و حیات کے بارے میں ہے لیکن اس سے زیادہ اہم معنوی موت و حیات ہے یعنی کسی شخص کو گمراہ کرنا یا کسی شخص کو گمراہی سے نجات دلانا۔



کسی نے امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا:

"من حرق او غرق ——— ثم سکت ——— ثم قال تأویلها الاعظم ان دعاها فاستجاب له"

یعنی ——— قتل کرنے اور موت سے نجات دینے سے آیت میں مراد جلنے سے نجات یا غرق ہونے سے بچانا وغیرہ ہے۔

پھر امامؑ کچھ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد مزید فرمایا:

آیت کی سب سے بڑی تاویل اور سب سے بڑا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کو راہ حق کی طرف دعوت دی جائے یا باطل کی طرف اور وہ یہ دعوت قبول کرلے[1]۔

دوسرا سوال جو آیت کے بارے میں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کا نام کیوں لیا گیا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ حکم انہی سے مخصوص نہیں ہے۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ذکر اس لیے ہے کہ ان میں ایسے قتل بہت ہوئے جن کا جذبہ محرکہ حسد اور جاہ طلبی تھا۔ دور حاضر میں بھی بہت سا قتل و خون انہی کے ہاتھوں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ خدائی حکم سب سے پہلے ان کے بارے میں آیا۔

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کی قانون شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہمارے پیغمبر روشن دلائل کے ساتھ ان کی ہدایت کے لیے آئے لیکن ان میں سے بہت سوں نے قوانین الٰہی کو توڑ دیا اور تجاوز کا راستہ اختیار کیا (و لقد جاء تهم رسلنا بالبينات ثم ان كثيرًا منهم بعد ذلك في الارض لمسرفون)۔

توجہ رہے کہ "اسراف" لغت میں وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں حد سے ہر قسم کا تجاوز بھی شامل ہے اگرچہ اکثر اوقات مصارف و اخراجات میں تجاوز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۳۳۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ

۳۴۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ صفحہ ۶۲۰۔ اسی مضمون کی اور روایات بھی موجود ہیں۔



غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ ع

ترجمہ

۳۳- جو لوگ خدا اور پیغمبر سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور روئے زمین پر فساد برپا کرتے ہیں (اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں) ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں (کی چار انگلیوں) کو کاٹ دیا جائے اور یا انھیں انکی زمین سے جلاوطن کر دیا جائے یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کیلیے بہت بڑا عذاب ہے۔

۳۴- مگر وہ جو ان پر تمھارے ہاتھ ڈالنے سے پہلے توبہ کر لیں اور جان لو کہ (خدا ان کی توبہ قبول کرے گا کیونکہ) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ مشرکین کی ایک جماعت خدمتِ پیغمبرؐ میں پہنچی اور یہ لوگ مسلمان ہو گئے لیکن مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی ان کے رنگ زرد ہو گئے اور وہ بیمار پڑ گئے۔ پیغمبر اسلام نے ان کی صحت کے پیش نظر حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر ایک صحت افزا صحرائی علاقے میں چلے جائیں جس میں زکوٰۃ کے اونٹوں کو چرایا جاتا تھا، تاکہ اونٹنیوں کا تازہ دودھ بھی انھیں میسّر آسکے۔ وہ صحت مند ہو گئے لیکن پیغمبر اکرمؐ کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے انھوں نے مسلمان چرواہوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے، ان کی آنکھیں نکال لیں، انھیں قتل کرنا شروع کر دیا، زکوٰۃ کے اونٹ لوٹ لیے اور اسلام سے خارج ہو گئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے اور جو سلوک انھوں نے چرواہوں سے کیا ہے قصاص کے طور پر وہی ان سے کیا جائے۔ آنکھیں نکال لی گئیں ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا تاکہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسے انسانیت کش افعال کا ارتکاب نہ کریں زیر نظر آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں ان کے بارے میں حکم شریعت بیان کیا گیا۔[1]



ل تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۲۵۲ اور تفسیر قرطبی ج ۳ صفحہ ۲۱۴۵۔



تفسیر

لوگوں کی جان و مال پر حملہ کرنے والوں کی سزا

یہ آیت حقیقت میں قتلِ نفس کے بارے میں جاری بحث کی تکمیل کرتی ہے اس میں مسلمانوں کے خلاف مسلح ہو کر دھمکیاں دیتے ہوئے بلکہ انھیں قتل کر کے ان کا مال و اسباب لوٹنے والوں کی نہایت سخت سزا بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ خدا اور پیغمبر کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہ ہے کہ ان چار سزاؤں میں سے کوئی ایک ان پر جاری کی جائے:

پہلی یہ کہ وہ قتل کر دیئے جائیں۔

دوسری یہ کہ انھیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔

تیسری یہ کہ ان کے اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں۔

اور چوتھی یہ کہ وہ جس علاقے میں رہتے ہوں انھیں اس سے جلاوطن کر دیا جائے (انما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله ویسعون فی الارض فسادًا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیهم وارجلهم من خلاف او ینفوا من الارض)۔

چند اہم نکات

۱۔ خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ روایاتِ اہل بیت علیہم السلام میں آیا ہے اور کم و بیش آیت کی شانِ نزول بھی اس کی گواہی دیتی ہے، خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی ڈرا دھمکا کر مسلح ہو کر لوگوں کے جان و مال پر حملہ آور ہو جاتا ہے تو چوروں ڈاکوؤں کی طرح شہروں سے باہر ایسا کرے یا شہر کے اندر۔ اس بنا پر وہ بدمعاش لٹیرے جو لوگوں کے جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں سب اس حکم میں شامل ہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ اس آیت میں بندگانِ خدا کے ساتھ جنگ کو خدا سے جنگ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں انسانوں کے حقوق اور ان کے امن و سکون کی کس قدر اہمیت ہے۔

۲۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے کا کیا مطلب ہے؟ جیسا کہ فقہی کتب میں نشاندہی کی گئی ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹنے سے مراد اتنی ہی مقدار ہے جو چوری کے بارے میں بیان ہوئی ہے یعنی ہاتھ یا پاؤں کی صرف چار انگلیاں کاٹنا[1]

۳۔ کیا چاروں سزائیں اختیاری ہیں: زیرِ نظر آیت میں چار سزائیں بیان ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے

---

[1] کنز العرفان فی فقہ القرآن ج ۲ صفحہ ۳۵۲



کہ کیا یہ سزائیں اختیاری حیثیت رکھتی ہیں یعنی حکومت اسلامی ان میں سے جسے جس شخص کیلئے مناسب سمجھے جاری کرے یا جرم کی مناسبت سے ان میں سے سزا اختیار کی جائے گی یعنی اگر حملہ آوروں (ڈاکوؤں) نے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے تو ان کے لیے قتل والی سزا انتخاب ہوگی اور اگر مسلح ہوکر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کا مال لوٹا ہے تو ان کی انگلیاں کاٹی جائیں گی اور اگر انھوں نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی چُرایا ہے تو انھیں قتل کیا جائے گا اور لوگوں کی عبرت کے لیے ان کی لاشیں کچھ عرصے کے لیے سُولی پر لٹکائی جائیں گی اور لوگوں کے خلاف ہتھیار لے کر نکلے ہیں لیکن انھوں نے خون نہیں بہایا اور چوری بھی نہیں کی تو انھیں دوسرے شہر کی طرف جلاوطن کیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرا معنی حقیقت سے زیادہ قریب ہے اور یہی مفہوم آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول چند احادیث میں بھی آیا ہے[۱]

یہ صحیح ہے کہ کچھ احادیث میں اس سلسلے میں حکومتِ اسلامی کو اختیار حاصل ہونے کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے لیکن جن احادیث کی پہلے بات کی گئی ہے ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اختیار سے مراد یہ نہیں کہ حکومت اسلامی ان چار میں سے خود ہی کوئی سزا منتخب کرے اور جرم کی کیفیت کو پیش نظر نہ رکھے کیونکہ یہ بہت بعید ہے کہ قتل اور سولی دیئے جانے کو جلاوطنی کا ہم پلّہ قرار دیا جائے یہ سب ایک ہی سطح پر نہیں ہوسکتے۔

اتفاق کی بات ہے کہ آج کی دنیا میں جرائم اور سزا کے بہت سے قوانین میں بھی یہ بات صریح طور پر دیکھی جاتی ہے کہ ایک قسم کے جُرم کے لیے متعدد سزائیں مقرر کی جاتی ہیں مثلاً بعض جرائم کے لیے قانون میں تین سے لے کر دس سال تک قید معیّن کی جاتی ہے اور قاضی کا ہاتھ اس سلسلے میں کھلا رکھا جاتا ہے اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ جج اپنی مرضی سے قید کی مُدّت کا تعین کرے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سزا کی مُدّت جرم کے خفیف یا شدید ہونے کے حوالے سے معیّن کرے اور مناسب سزا کا انتخاب کرے۔

اس اہم اسلامی قانون میں بھی حملہ آوروں کے لیے سزا کی کیفیت مختلف بیان کی گئی ہے کیونکہ جرم کی کیفیت بھی اس سلسلے میں مختلف ہوتی ہے اور سب حملہ آور یقیناً ایک جیسے نہیں ہوتے۔

کہے بغیر واضح ہے کہ اسلام نے حملہ آوروں کے بارے میں اتنی شدید سزا اس لیے مقرر کی ہے تاکہ بے گناہوں کے خون، جان، مال اور ناموس کی ہٹ دھرم، منہ زور، اوباش اور فسادی لوگوں کے حملوں اور تجاوزات سے حفاظت کی جائے[۲]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ رسوائی اور سزا تو ان کے لیے دنیا میں ہے لیکن صرف اسی سزا پر اکتفا نہیں کی جائے گی بلکہ آخرت میں بھی انھیں سخت سزا دی جائے گی (ذٰلک لھم خزی فی الدنیا و لھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم) اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حدود اور سزائیں اگر دنیا میں جاری ہوجائیں تو وہ آخرت کی سزاؤں سے

---

[۱] نورالثقلین جلد ۱ صفحہ ۶۲۲

[۲] سطور بالا میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں وہ اجمال اور خلاصہ کے طور پر ہیں اس اسلامی قانون کی تفصیل اور شرائط کا مطالعہ فقہی کتب میں کیا جانا چاہیے۔



مانع نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ لوٹ آنے کا راستہ ایسے خطرناک مجرموں پر بھی بند نہ کیا جائے اور اگر وہ مائل بہ اصلاح ہو جائیں تو ان کے تلافی اور تجدید نظر کا راستہ کھلا رکھا جائے، ارشاد ہوتا ہے: مگر وہ لوگ کہ جو قابو آنے سے پہلے توبہ کرلیں تو عفوالٰہی ان کے شاملِ حال ہوگا اور جان لو کہ خدا غفور و رحیم ہے (الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انھیں صرف اس صورت میں سزا نہیں ملے گی کہ اگر وہ پکڑے جانے سے پہلے اپنے ارادے اور رغبت سے اس جرم سے صرف نظر کرلیں اور پشیمان ہو جائیں۔

یہاں شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ ان کی توبہ اس کا سبب نہیں بنے گی کہ اگر انھوں نے قتل کیا ہے یا چوری کی ہے تو اس کی سزا انھیں نہیں ملے گی بلکہ صرف اسلحہ اٹھا کر لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کی سزا برطرف ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں صرف حقوق اللہ ہیں ان کی سزا توبہ کی صورت میں ساقط ہو جائے گی۔ لیکن حقوق الناس میں صاحبانِ حق کی رضا کے بغیر ساقط نہیں ہوگی (غور کیجیے گا)۔

اس کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ محارب کی سزا عام قاتل یا چور سے زیادہ سخت اور شدید تر ہے لیکن توبہ کرنے سے محارب والی سزا اس سے برطرف ہو جائے گی۔ باقی رہی چور، غاصب یا عام قاتل والی سزا تو وہ اسے ملے گی۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ توبہ تو ایک باطنی امر ہے یہ کس طرح ثابت کیا جائے گا اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ بات ثابت کرنے کے بہت سے راستے ہیں مثلاً دو عادل گواہی دیں کہ فلاں مجلس میں انھوں نے اس کی توبہ سنی ہے اور اس نے بغیر کسی دباؤ کے اپنی رضا و رغبت سے توبہ کی ہے۔ یا مثلاً وہ اپنی زندگی کی روش اور طور طریقہ اس طرح سے بدل لے کہ اس سے توبہ کے آثار ظاہر ہوں۔

۳۵۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

ترجمہ

۳۵۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور قرب خدا کا وسیلہ تلاش کرو اور راہ خدا میں جہاد کرو تاکہ فلاح اور نجات پا جاؤ۔

تفسیر

توسّل کی حقیقت

اس آیت میں روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے اور نجات کے لیے انھیں تین حکم دیئے گئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے



اے ایمان والو! تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو(یا یہا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ)اس کے بعد حکم دیا گیا ہے تقربِ الٰہی کا وسیلہ اختیار کرو(و ابتغوا الیہ الوسیلۃ) آخر میں راہِ خدا میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے(وجاھدوا فی سبیلہ)ان سب احکام پر عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم نجات پا جاؤ گے(لعلکم تفلحون)۔

اس آیت میں جس موضوع کو زیر بحث لایا جانا چاہیے وہ اس میں اہلِ ایمان کو وسیلہ تلاش کرنے کے لیے دیا جانے والا حکم ہے۔

"وسیلہ" قرب حاصل کرنے کو کہتے ہیں یا اس چیز کو کہتے ہیں جو لگاؤ اور رضا و رغبت سے دوسرے کا قرب حاصل کرنے کا باعث بنے لہٰذا آیت میں لفظ "وسیلہ" ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اس کے مفہوم میں ہر وہ کام اور چیز شامل ہے جو پروردگار کی بارگاہِ مقدس سے قریب ہونے کا باعث ہو اس میں اہم ترین خدا اور پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانا اور جہاد کرنا، نیز نماز، زکوٰۃ، روزہ اور خانہ خدا کا حج، اسی طرح صلہ رحمی، راہِ خدا میں پنہاں و یا آشکار خرچ کرنا اور ایسا ہر اچھا اور نیک کام اس کے مفہوم میں داخل ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

ان افضل ما توسل بہ المتوسلون الی اللہ سبحانہ و تعالٰی الایمان بہ و برسولہ والجہاد فی سبیلہ فانہ ذروۃ الاسلام، وکلمۃ الاخلاص فانہا الفطرۃ واقام الصلٰوۃ فانہا الملۃ وایتاء الزکوٰۃ فانہا فریضۃ واجبۃ وصوم شہر رمضان فانہ جنۃ من العقاب وحج البیت واعتمارہ فانہما ینفیان الفقر ویرحضان الذنب وصلۃ الرحم فانہا مثراۃ فی المال ومنساۃ فی الاجل، وصدقۃ السر فانہا تکفر الخطیئۃ وصدقۃ العلانیۃ فانہا تدفع میتۃ السوء وصنائع المعروف فانہا تقی مصارع الھوان

یعنی ...... بہترین چیز جس کے ذریعے اور وسیلے سے تقربِ الٰہی حاصل ہو سکتا ہے وہ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لانا اور جہاد کرنا ہے کہ جو کہ سارے اسلام کی چوٹی ہے اسی طرح جملۂ اخلاص (لا الٰہ الا اللہ) کہ جو وہی فطرتِ توحید ہے اور نماز قائم کرنا کہ جو آئینِ اسلام ہے اور زکوٰۃ کہ جو واجب فریضہ ہے اور ماہِ رمضان کے روزے کہ جو گناہ اور عذابِ خدا کے سامنے سپر ہیں اور حج و عمرہ کہ جو فقر و فاقہ اور پریشانی کو دور کرتے ہیں اور گناہوں کو دھو ڈالتے ہیں اور صلہ رحمی کہ جو مال و ثروت کو زیادہ اور زندگی کو طویل کرتا ہے اور مخفی طور پر خرچ کرنا کہ جو گناہوں کی تلافی کا باعث بنتا ہے اور ظاہری طور پر خرچ کرنا کہ جو ناگہانی اور بری موت کو دور کرتا ہے اور نیک کہ جو انسان کو ذلت و خواری کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے ہیں (سب تقربِ الٰہی کا وسیلہ ہیں [1])

---

[1] یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ یہاں یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کوئی چیز ذاتِ پیغمبر یا امام سے مستقل طور پر مانگی جائے بلکہ مراد اعمالِ صالح بجا لانا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)



انبیاء، آئمہ اور خدا کے نیک بندوں کی شفاعت بھی کہ جو صراحتِ قرآنی کے مطابق تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہے وسیلہ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔ اسی طرح پیغمبر اور امام کی پیروی بھی بارگاہِ الٰہی کی قربت کا موجب ہیں یہاں تک کہ خدا کو انبیاء، آئمہ اور صالحین کے مرتبہ و مقام کا واسطہ دینا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے کیونکہ ان کا ذکر در اصل ان کے مقام اور مکتب کو اہمیت دینے کے مترادف ہے۔

جن لوگوں نے زیرِ نظر آیت کو ان مفاہیم میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے ان کے پاس درحقیقت اس تخصیص کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہر چیز جو تقربِ الٰہی کا سبب بنے "وسیلہ" ہے۔

قرآن اور توسّل

قرآن کی دیگر آیات سے بھی اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نیک انسان کے مقام کو بارگاہِ خدا میں وسیلہ قرار دینا اور اسکی وجہ سے خدا سے کوئی چیز طلب کرنا کسی طرح بھی ممنوع نہیں ہے اور یہ توحید کے منافی نہیں ہے سورۂ نساء آیت ۶۴ میں ہے؛

ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما

اور جب ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا (اور گناہ کے مرتکب ہوئے) اگر تمھارے پاس آ جاتے اور خدا سے مغفرت طلب کرتے اور تم بھی ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنیوالا اور رحیم و مہربان پاتے۔

نیز سورۂ یوسف آیہ ۹۷ میں ہے کہ برادرانِ یوسف نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں ان کے لیے استغفار کریں اور حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔

سورۂ توبہ آیت ۱۱۴ میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے اپنے باپؑ[۱] کے لیے طلب مغفرت کی یہ امر بھی دوسرے لوگوں کے لیے انبیاء کی دعا کے مؤثر ہونے کی تائید کرتا ہے اسی طرح قرآن کی دیگر متعدد روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) پیغمبر و امام کی پیروی کرنا ہے، ان کی شفاعت کا حصول ہے یا پھر ان کے مقام و مکتب کا واسطہ دینا ہے (جو کہ خود ایک قسم کا احترام ہے اور اس سے واسطہ دینے والے کی نظر میں ان کی حیثیت و مقام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی ایک قسم کی خدا کی عبادت ہے) اور اس ذریعے خدا سے کچھ مانگا جائے تو اس میں کوئی بوئے شرک نہیں اور نہ ہی یہ قرآن کی دوسری آیات کے خلاف ہے اور نہ ہی یہ زیرِ بحث آیت کے عمومی مفہوم سے متجاوز ہے (غور کیجیے گا)۔

[۱] یہ حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی طرف اشارہ ہے جنھیں وہ اپنے باپ کے بمنزلہ سمجھتے تھے (مترجم)۔



روایاتِ اسلامی اور توسّل

بہت سی شیعہ سنی روایات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ توسل کے مذکورہ مفہوم میں کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ایک اچھا طریقہ شمار ہوتا ہے۔ ایسی روایات بہت زیادہ ہیں اور بہت سی کتب میں مذکور ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر اہلِ سنت کی کتب سے چند روایات نقل کرتے ہیں:

۱۔ کتاب "وفاء الوفا" اہل سنت کے ایک مشہور عالم سمہودی کی تالیف ہے اس کتاب میں ہے:

بارگاہِ خدا میں رسول اللہؐ اور ان کے مقام و مرتبہ کے وسیلے سے آپ کی ولادت سے پہلے، آپ کی ولادت کے بعد، آپ کی رحلت کے بعد، عالمِ برزخ کے دوران میں اور قیامت کے دن، شفاعت طلب کرنا جائز ہے۔

اس کے بعد وہ اس روایت کو نقل کرتے ہیں جس میں ہے کہ حضرت آدمؑ نے پیغمبرِ اسلام کو وسیلہ قرار دیا چونکہ آپ پیغمبرِ اسلام کے آئندہ پیدا ہونے کے بارے میں جانتے تھے حضرت آدمؑ نے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا:

"یارب اسئلك بحق محمد لما غفرت لی"

خداوندا! بحق محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے[1]

اس کے بعد صاحب "وفاالوفاء" نے ایک اور حدیث راویانِ حدیث کی ایک جماعت جس میں نسائی اور ترمذی جیسے مشاہیر علماء شامل ہیں کے حوالے سے پیغمبرِ اکرمؐ کی زندگی کے دوران میں توسل کے جواز کے بارے میں بطور شاہد نقل کی ہے حدیث کا خلاصہ یہ ہے:

ایک نابینا نے پیغمبرِ اکرمؐ سے اپنی بیماری سے شفا کے لیے دعا کی درخواست کی تو پیغمبرِ اکرمؐ نے اسے حکم دیا کہ اس طرح دعا کرو۔

"اللھم انی اسئلك واتوجه الیك بنبیك محمد نبی الرحمة یامحمد انی توجھت بك الی ربی فی حاجتی لتقضی لی اللھم شفعه فی"

یعنی... خدایا! میں تجھ سے تیرے پیغمبر جو نبیؐ رحمت ہے کے صدقے میں سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمد! میں آپ کے وسیلے سے اپنی حاجت روائی کے لیے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، خدایا! انھیں میرا شفیع قرار دے[2]

اس کے بعد صاحب وفاالوفا نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپؐ سے توسل کے جواز میں یہ روایت نقل کی ہے:

---

[1] وفاء الوفاء جلد ۳ صفحہ ۱۳۷۱، کتاب "التوصل الی حقیقۃ التوسل" میں بھی بیہقی کی "دلائل النبوۃ" کے حوالے سے یہ روایت مذکور ہے۔

[2] وفاء الوفا، صفحہ ۱۳۷۲



حضرت عثمان کے زمانے میں ایک حاجت مند پیغمبر اکرمؐ کی قبر کے پاس آیا اور نماز پڑھ کر اس نے اس طرح دعا کی :

"اللّٰھم انی اسئلك و اتوجه الیك بنبینا محمد (ص) نبی الرحمة ، یا محمد انی اتوجه بك الی ربك ان تقضی حاجتی"

یعنی ...... خداوندا ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اپنے پیغمبر جو نبیٔ رحمت کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمدؐ! میں آپ کے وسیلے سے آپ کے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری مشکل آسان ہو جائے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ فوراً اس کی مشکل حل ہو گئی[1]

۲۔ کتاب "التوصل الی حقیقة التوسل" کا مؤلف جو توسل کے بارے میں بہت سخت گیر ہے، ۲۶ احادیث مختلف کتب اور مصادر سے نقل کی ہیں جن سے توسل کا جواز ظاہر ہوتا ہے اگرچہ موصوف نے ان احادیث کی اسناد میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن واضح ہے کہ روایات جب بہت زیادہ ہوں اور حد تواتر تک پہنچ جائیں تو پھر سند حدیث میں کوئی خدشہ اور رد و قدح کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور توسل و وسیلہ کے بارے میں منابع اسلامی میں مذکورہ روایات حد تواتر سے بھی زیادہ ہیں۔

ان میں سے ایک روایت صواعق میں اہلِ سنت کے مشہور امام شافعی سے نقل کی گئی ہے وہ اہلِ بیتِ رسولؐ سے متوسل ہونے کے بارے میں کہتے ہیں :

آل النبی ذریعتی   وھم الیه وسیلتی
ارجو بھم اعطی غدًا   بید الیمین صحیفتی

اہلِ بیتِ رسول میرا وسیلہ ہیں۔
وہ اس کی بارگاہ میں میرے تقرب کا ذریعہ ہیں
میں امید کرتا ہوں کہ ان کے ذریعے سے کل قیامت کے دن
میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا[2]

نیز بیہقی سے صاحبِ صواعق نے نقل کیا ہے کہ خلیفہ دوم کی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا۔ حضرت بلال چند صحابہ کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی قبر انور کے پاس آئے اور یوں کہنے لگے :

"یارسول الله استسق لامتك ...... فانھم قد ھلکوا ...."

---

[1] وفاء الوفاء صفحہ ۱۳۷۳
[2] التوصل صفحہ ۳۲۹



یعنی ــــــ اے رسول خدا! اپنی امت کے لیے اپنے خدا سے بارانِ رحمت طلب کیجیے
ــــــ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ہلاک ہوجائے [1]

یہاں تک کہ ابن حجر سے کتاب "الخیرات الحسان" میں منقول ہے کہ امام شافعی جن دنوں بغداد میں تھے امام ابوحنیفہ کی زیارت کے لیے گئے اور اپنی حاجات کے لیے ان سے متوسل ہوئے [2]

نیز صحیح دارمی میں ابوالجوزاء سے منقول ہے:

ایک سال مدینہ میں سخت قحط پڑا تو بعض لوگوں نے حضرت عائشہ سے شکایت کی، انھوں نے کہا: قبر پیغمبر کے اوپر چھت میں ایک سوراخ کریں تاکہ قبر پیغمبر کی برکت سے خدا کی طرف سے بارش نازل ہو۔ ان لوگوں نے ایسا کیا تو بہت زیادہ بارش برسی۔

تفسیر آلوسی میں مندرجہ بالا احادیث میں سے متعدد نقل کی گئی ہیں اس کے بعد ان کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے حتی کہ ان احادیث کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے آخر میں مجبوراً صاحب تفسیر نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

ان تمام باتوں کے باوجود میں بارگاہ خدا میں مقام پیغمبرؐ سے متوسل ہونے سے نہیں روکتا، خواہ حیات پیغمبرؐ میں ہو یا آپ کی رحلت کے بعد۔

پھر مزید تفصیلی بحث کے بعد کہا ہے۔

خدا کی بارگاہ میں رسول اللہؐ کے علاوہ کسی اور سے متوسل ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ جسے وسیلہ بنایا جائے وہ بارگاہِ الٰہی میں مقام و منزلت رکھتا ہو [3]

رہیں شیعہ کتب تو ان میں یہ بات اتنی واضح ہے کہ کوئی حدیث نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

چند قابل توجہ باتیں

۱۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ توسل سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص پیغمبرؐ یا ائمہؑ سے حاجت طلب کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انکے مقام و منزلت کو بارگاہِ خدا میں رابطے کا وسیلہ قرار دے۔ یہ درحقیقت خدا کی طرف ہی توجہ کرنا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کا احترام بھی اس بنا پر ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور انھوں نے اسی راہ میں قدم بڑھایا ہے۔ ہمیں ایسے لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو اس قسم کے توسل کو شرک کی ایک قسم خیال کرتے ہیں حالانکہ شرک تو یہ ہے کہ خدا کی صفات اور افعال میں کسی کو خدا کا شریک سمجھا جائے لیکن ایسا توسل جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کسی طرح سے بھی شرک سے مشابہ نہیں ہے۔

۲۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کی حیات اور وفات میں فرق کریں حالانکہ مذکورہ روایات جن میں سے اکثر وفات کے بعد کے زمانے سے مربوط ہیں سے قطع نظر بھی ایک مسلمان کی نظر میں انبیاء اور آئمہ علیہم السلام وفات کے بعد برزخ میں ایسی حیات رکھتے ہیں جیسی قرآن نے شہداء کے بارے میں بیان کی ہے اور کہا ہے:

---

[1] التوصل صفحہ ۲۵۲ [2] التوصل صفحہ ۳۳۱ [3] روح المعانی جلد ۴ ج ۶ صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵۔

انھیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ (آل عمران ..... ۱۶۹)

۳۔ بعض پیغمبر اکرم ؐ سے دعا کی درخواست کرنے اور خدا کو ان کے مقام کی قسم دینے میں بھی فرق پر اصرار کرتے ہیں وہ دعا کی درخواست کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ کو ممنوع سمجھتے ہیں حالانکہ منطقی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں۔

۴۔ اہل سنت کے بعض مؤلفین اور علماء خصوصاً وہابی حضرات بڑی ہٹ دھرمی سے توسّل کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات کو ضعیف ثابت کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ وہ فضول اور بے بنیاد اعتراضات کے ذریعے انھیں طاق نسیاں کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی بحث اس طرح سے ہوتی ہے کہ ایک غیر جانبدار شخص محسوس کرتا ہے کہ عقیدہ انھوں نے پہلے بنا لیا ہے اور پھر اپنے عقیدے کو روایات اسلامی پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کے عقیدے کے خلاف ہے اسے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایک محقق ایسی غیر منطقی اور تعصب آمیز بحث کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

۵۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں توسل والی روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں یعنی اس قدر زیادہ ہیں کہ ہمیں اسناد کی تحقیق سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں صحیح روایات بھی بہت سی ہیں لہٰذا بعض دیگر کی اسناد میں ردو قدح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۶۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ روایات جو اس آیہ کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں ہے کہ پیغمبر اکرم ؐ لوگوں سے فرماتے تھے کہ خدا سے میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو۔ یا کتاب کافی میں حضرت علیؑ کا یہ فرمان کہ "وسیلہ" جنت میں بالاترین مقام ہے ـــــ ایسی روایات آیت کی مذکورہ بالا تفسیر کے منافی نہیں ہیں کیونکہ جیسے ہم نے بارہا نشاندہی کی ہے، وسیلہ میں تقرب پروردگار کا ہر مفہوم شامل ہے اور خدا سے پیغمبر اکرم ؐ کا تقرب اور جنت میں بلند ترین درجہ اس کا ایک مصداق ہے۔

۳۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۳۷۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○

ترجمہ

۳۶۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں، اگر روئے زمین میں جو کچھ ہے اس کے برابر ان کے پاس ہو اور وہ روز قیامت



سزا سے نجات کے لیے فدیہ کے طور پر دے دیں تو بھی ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

۳۷۔ وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل آئیں لیکن وہ اس سے نکل نہ پائیں گے، اور ان کے لیے پائیدار عذاب ہوگا۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں مومنین کو تقوٰی، راہِ جہاد اور وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب ان دو آیات میں گذشتہ حکم کا سبب بیان کرنے کے حوالے سے بے ایمان اور آلودۂ گناہ افراد کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اگر جو کچھ روئے زمین میں ہے اس جتنا سرمایہ رکھتے ہوں اور اسے روزِ قیامت سے سزا سے نجات کے لیے دے دیں تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا (ان الذین کفروا لو ان لھم ما فی الارض جمیعًا و مثلہ معہ لیفتدوا بہ من عذاب یوم القیٰمۃ ما تقبل منھم و لھم عذاب الیم)۔

یہی مضمون سورۂ رعد آیہ ۱۸ میں بھی ہے۔ اس سے خدائی سزا کے بارے میں انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے اور یہ کہ کسی بھی سرمائے اور طاقت کے ذریعے اس سے رہائی حاصل نہیں کی جا سکتی چاہے وہ سرمایہ ساری زمین کے برابر یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہو۔ نجات فقط ایمان، تقویٰ، جہاد اور عمل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد اس سزا کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ جہنم کی آگ سے باہر نکل آئیں لیکن نکل نہ سکیں گے اور ان کی سزا باقی اور برقرار رہے گی (یریدون ان یخرجوا من النار و ما ھم بخارجین منھا و لھم عذاب مقیم)۔

دائمی سزا اور کفار کے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی بحث انشاء اللہ سورۂ ہود آیہ ۱۰۸ کے ذیل میں آئے گی۔

۳۸۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

۳۹۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۴۰۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝



ترجمہ

۳۸۔ چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ اس کے انجام دیئے گئے عمل کی پاداش میں خدائی سزا کے طور پر کاٹ دو، خدا توانا اور حکیم ہے۔

۳۹۔ لیکن جو شخص ظلم کرنے کے بعد توبہ، اصلاح اور تلافی کرلے تو خدا اس کی توبہ قبول کرلے گا، کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۴۰۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک اور حکمران ہے جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

چور کی سزا

قبل ازیں چند آیات میں "محارب" یعنی ڈرا دھمکا کر یا اعلان مسلح ہوکر لوگوں کی جان و مال اور ناموس کے خلاف حملہ کرنے والے شخص کے بارے میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی مناسبت کی بنا پر ان آیات میں چور کر جو مخفی طور پر لوگوں کا مال لے جاتا ہے، کے بارے میں حکم بیان ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو (والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما)۔ یہاں چور مرد کو چور عورت پر مقدم رکھا گیا ہے چونکہ چوری کے سلسلے میں اصلی عامل زیادہ تر مرد ہوتے ہیں لیکن ارتکاب زنا کے موقع پر زیادہ اہم عامل اور محرک بے لگام عورتیں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ سزا ان اعمال پر ہے جو انھوں نے انجام دیئے ہیں اور یہ خدا کی طرف سے عذاب ہے (جزاء بما کسبا نکالا من اللہ)۔ اس جملے میں درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ اول تو یہ سزا ان کے کام کا نتیجہ ہے اور ایسی چیز ہے جو انھوں نے خود اپنے لیے خریدی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے پیش بندی اور حق و عدالت کی طرف بازگشت ہے کیونکہ "نکال" کا معنی ہے ایسی سزا جو پیش بندی کے لیے اور ترک گناہ کے مقصد کے لیے ہو۔ دراصل اس لفظ کا معنی ہے "لگام" بعد ازاں ہر اس کام کے لیے استعمال ہونے لگا جو انحراف اور کج روی سے روکے۔

آیت کے آخر میں اس لیے کہ مبادہ یہ وہم ہو کہ مذکورہ سزا عادلانہ نہیں، فرمایا گیا ہے: خدا قادر و توانا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی سے انتقام لے اور حکیم بھی ہے اس لیے وہ کسی کو بلاوجہ سزا نہیں دیگا (واللہ عزیز حکیم)۔



بعد والی آیت میں ان کے لیے لوٹ آنے کا راستہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے: اس ظلم کے بعد جو شخص توبہ کرلے اور اصلاح و تلافی کی راہ اپنائے خدا اسے بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے (فمن تاب من بعد ظلمه و اصلح فان الله یتوب علیه ان الله غفور رحیم)

کیا توبہ کرنے سے صرف اس کا گناہ بخشا جائے گا یا چوری کی سزا (ہاتھ کاٹنا) بھی ساقط ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں ہمارے فقہاء میں یہی مشہور ہے کہ اگر وہ اسلامی عدالت میں چوری ثابت ہوجانے سے پہلے توبہ کرلے تو چوری کی حد بھی برطرف ہوجائے گی لیکن جب دو عادل گواہوں کے ذریعے اس کا جرم ثابت ہوجائے تو پھر توبہ سے حد ساقط نہیں ہوگی۔

دراصل حقیقی توبہ جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ ہے جو عدالت میں ثبوت جرم سے پہلے انجام پائے ورنہ تو ہر چور جب اپنے آپ کو سزا کے سامنے پائے گا اظہار توبہ کرے گا اور اس طرح تو کسی پر سزا جاری ہی نہ ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں "اختیاری توبہ" وہ ہے جو شرعی عدالت میں جرم ثابت ہونے سے پہلے انجام پائے ورنہ "اضطراری توبہ" ہوگی اور اضطراری توبہ تو ایسی ہے جیسے عذابِ الٰہی یا آثارِ موت دیکھ کر کی جائے اور ایسی توبہ کی کوئی قیمت نہیں۔

چوروں کے بارے میں توبہ کا حکم بیان کرنے کے بعد روئے سخن اسلام کے عظیم پیغمبر کی طرف کیا گیا ہے، فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور جس طرح مناسب سمجھتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے، جس شخص کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے سزا دیتا ہے اور جسے بخشش کے لائق سمجھتا ہے بخش دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (الم تعلم ان الله له ملك السمٰوٰت و الارض یعذب من یشاء و یغفر لمن یشاء و الله علی کل شیء قدیر)۔

چند اہم نکات

۱۔ چور کو سزا دینے کی شرائط: دیگر احکام کی طرح اس حکم میں قرآن نے بنیادی بات بیان کی ہے اس کی تفصیل سنتِ پیغمبر پر چھوڑ دی ہے۔ روایاتِ اسلامی سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی اس اسلامی حد کے اجراء کے لیے بہت سی شرائط ہیں جن کے بغیر اسے جاری کرنا جائز نہیں ہے ان میں سے کچھ شرائط یہ ہیں:

(i) چوری کیا ہوا مال کم از کم ایک چوتھائی دینار کی مالیت کا ہونا چاہیے[1]

(ii) مال محفوظ جگہ سے مثلاً گھر، دوکان یا اندر کی جیب سے چوری کیا جائے۔

(iii) چوری قحط سالی کے زمانے میں جبکہ لوگ بھوک زدہ ہوتے ہیں اور انھیں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی، نہ ہوئی ہو۔

(iv) چور عاقل و بالغ ہو اور اس نے حالت اختیار میں یہ کام کیا ہو۔

(v) باپ کا بیٹے کے مال سے چوری کرنا یا ایک شریک کا شرکت والے مال سے چوری کرنا اس حکم میں نہیں آتا۔

(vi) باغ کے درختوں سے پھل کی چوری کو بھی اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] دینار سے مراد ہے سکہ دار سونے کا ایک مثقالِ شرعی اور مثقالِ شرعی برابر ہے ۱۸ چنے کے دانوں کے یعنی عام مثقال کا ۳/۴ حصہ



(viii) ہر وہ موقع جہاں چور کے لیے اشتباہ کا احتمال ہو کہ اس نے دوسرے کے مال کو اشتباہ سے اپنا مال سمجھتے ہوئے لیا ہے بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔

کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی تفصیل فقہی کتب میں آئی ہے۔

اشتباہ نہ ہو کہ مذکورہ شرائط کی صورت ہی میں چوری حرام ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ مذکورہ حد کا اجراء ان شرائط سے مخصوص ہے ورنہ چوری تو ہر شکل وصورت، ہر مقدار، اور ہر کیفیت سے اسلام میں حرام ہے۔

۲۔ **ہاتھ کاٹنے کی مقدار:** روایات اہل بیت علیہم السلام سے استفادہ کرتے ہوئے ہمارے فقہا میں مشہور یہی ہے کہ دائیں ہاتھ کی صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں نہ کہ اس سے زیادہ۔ اگرچہ فقہاء اہل سنت اس سے زیادہ کے قائل ہیں۔

۳۔ **کیا یہ سخت سزا ہے؟:** مخالفینِ اسلام اور کچھ ناواقف مسلمانوں کی طرف سے بارہا یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ اسلامی سزا بہت سخت ہے اور اگر آج کی دنیا میں یہ سزا نافذ ہو جائے تو بہت سے ہاتھ کٹ جائیں، علاوہ ازیں اس حکم کے اجراء سے ایک شخص نہ صرف اپنے بدن کے ایک اہم حصے سے محروم ہو جائے گا بلکہ ساری عمر کے لیے لوگوں کی انگشت نمائی کا شکار بھی ہو جائے گا۔

اس سوال کے جواب میں ان حقائق کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

(i) جیسا کہ ہم نے اس حکم کی شرائط میں کہا ہے کہ یہ حکم ہر چور کے لیے نہیں ہے، بلکہ چوروں کے ایک خطرناک گروہ کے لیے ہے۔

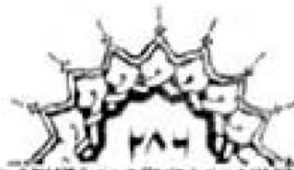
(ii) اس جرم کے ثبوت کے لیے اسلام میں چونکہ خاص شرائط معین ہیں لہٰذا اس سے بہت کم لوگوں پر یہ سزا جاری ہوگی۔

(iii) کم معلومات رکھنے والے لوگ جو بہت سے اعتراضات اسلامی قوانین پر کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے وہ ایک حکم کو مستقل طور پر دوسرے تمام احکام سے الگ کر کے بحث کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس حکم کو سو فی صد غیر اسلامی معاشرے میں فرض کرتے ہیں لیکن اگر ہم توجہ رکھیں کہ اسلام صرف اسی ایک حکم کا نام نہیں بلکہ وہ احکام کے ایک مجموعے کا نام ہے اور اگر یہ تمام احکام کسی معاشرے پر حکمران ہوں تو عدالتِ اجتماعی وجود میں آجائے، فقر و تنگدستی کے خلاف جنگ کی جائے، تعلیم و تربیت صحیح ہو اور آداب و اخلاق، آگاہی، بیداری اور تقویٰ کا دور دورہ ہو۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس حکم کے زیر اثر آنے والے لوگوں کی تعداد کس قدر کم ہوگی۔

کہیں اشتباہ نہ ہو، مقصد یہ نہیں کہ آج کے مختلف معاشروں میں یہ حکم جاری نہ ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ فیصلہ اور قضاوت کرتے وقت ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو بنیادی ضروریات مہیا کرے، انھیں ضروری تعلیم دلائے اور ان کی اخلاقی تربیت کرے واضح ہے کہ پھر ایسے ماحول میں غلط کار افراد بہت کم ہوں گے۔

(iv) اگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ چور زیادہ ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا حکم جاری نہیں ہوا لہٰذا جس علاقے میں یہ اسلامی حکم



جاری ہوتا ہے (مثلاً سعودی عرب میں گذشتہ سالوں میں یہ حکم جاری ہوتا تھا) وہاں بہت اچھا مالی امن امان ہوتا ہے۔ خانہ خدا کے بہت سے زائرین سوٹ کیس، بٹوے اور تھیلے حجاز کے گلی کوچوں میں پڑے دیکھتے ہیں انھیں کوئی شخص ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرتا یہاں تک کہ گمشدہ چیزوں کے ادارے کے مامورین آتے ہیں اور انھیں اس ادارے میں لے جاتے ہیں اور مالک نشانی بتا کرلے جاتے ہیں اسی طرح رات کو بغیر دروازوں کے اکثر دکانیں کھلی پڑی رہتی ہیں اور کوئی ان میں چوری نہیں کرتا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ اسلامی حکم اگرچہ صدیوں تک جاری ہوتا رہا اور اس کی پناہ میں صدرِ اسلام کے مسلمان امن و امان کی زندگی بسر کرتے رہے لیکن صدیوں میں گنتی کے صرف چند افراد پر یہ حکم جاری ہوا۔

ایک ملت کی صحیح زندگی کے لیے اگر چند غلط کار افراد کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں تو کیا یہ کوئی زیادہ قیمت ہے۔

۴۔ **ایک اعتراض کا جواب:** بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک چوتھائی دینار کی چوری پر حد کا اجراء کیا مسلمان کی جان کے بارے میں احترامات کے اسلامی احکام کے منافی نہیں کیونکہ اسلام تو مسلمان کے لیے ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہنے کا قائل ہے اور ایک انسان کی چار انگلیاں کاٹنے کی دیت اسلام نے بہت زیادہ معیّن کی ہے۔

جیسا کہ بعض تواریخ سے معلوم ہوتا ہے، اتفاقاً یہی سوال اسلام کے ایک عظیم عالم مرحوم سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوا تھا۔ سائل نے شعر کی صورت میں اپنا سوال یوں پیش کیا:

ید بخمس مئین عسجد وُدیت
ما بالها قطعت فی ربع دینار

یعنی ———— وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار ہے[1] ایک چوتھائی دینار کے بدلے کیوں کاٹا جاتا ہے۔

سید مرتضیٰ نے اس کے جواب میں یہ شعر ارشاد فرمایا:

عز الامانة اغلاها و ارخصها
ذل الخیانة فافهم حکمة الباری

یعنی ———— امانت کی عزت نے اس ہاتھ کو گراں قیمت بنا دیا تھا لیکن خیانت کی ذلت نے اس کی قیمت گرا دی۔ تم ذرا حکمتِ الٰہی کو سمجھو[2]

۴۱۔ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا

---

[1] توجہ رہے کہ پانچسو دینار پانچ انگلیاں کاٹنے پر ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں فقہائے اہل بیتؑ کے نزدیک چوری میں چار انگلیاں کاٹی جاتی ہیں۔

[2] تفسیر آلوسی جلد ۶ صفحہ ۱۰ پر بھی یہ واقعہ منقول ہے لیکن وہاں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی بجائے علم الدین سخاوی کا نام آیا ہے۔



بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ
لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ
بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ
فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ
وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

۴۲- سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ
اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

ترجمہ

۴۱- اے (خدا کے) رسول! وہ لوگ جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور وہ راہ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، تم ان کے بارے میں غم نہ کرو اور یونہی یہودیوں بارے میں (جو اسی راہ پر چلتے ہیں) وہ زیادہ آپ کی باتیں سنتے ہیں تاکہ انھیں تمھاری تکذیب کے لیے کوئی بات ہاتھ آجائے وہ دوسرے لوگوں کے جاسوس ہیں جو لوگ خود تمھارے پاس نہیں آئے وہ باتوں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ (جو ہم چاہتے ہیں) تمھیں دیں (اور محمد تمھاری خواہش کے مطابق فیصلہ کریں) تو اسے قبول کر لو، ورنہ دوری اختیار کرو (اور اس پر عمل نہ کرو) اور جسے خدا (اس کے پے در پے گناہوں کی وجہ سے) سزا دینا چاہے تو کوئی اسے بچا نہیں سکتا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کی پاکی نہیں چاہتا۔ انھیں دنیا میں رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں وہ عذاب عظیم سے دوچار ہوں گے۔



۴۲- وہ تمھاری باتیں بہت غور سے سنتے ہیں تاکہ انھیں جھٹلائیں وہ مالِ حرام زیادہ کھاتے ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو ان کے درمیان قضاوت کرو یا (اگر مصلحت ہو) تو انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دو اور اگر ان سے صرف نظر کر لو تو وہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت سے کام لو کہ خدا عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں ان میں سے زیادہ واضح روایت وہ ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

خیبر کے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی نے جو شادی شدہ تھا، ایک شوہر دار عورت سے خلاف عفت کام کیا وہ عورت بھی خیبر کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

تورات میں اس سلسلے میں سنگساری کا حکم تھا۔ یہودی اس کے اجراء میں پریشان تھے اور ایسے حل کی تلاش میں تھے جس میں دونوں کی معافی ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو احکام الٰہی کا پابند بھی کہیں۔

انھوں نے اپنے ہم مذہب اہل مدینہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اس حادثہ کے بارے میں پیغمبرِ اسلام سے حکم دریافت کریں (تاکہ اگر اسلام میں اس سے کوئی آسان حکم ہو تو اسے انتخاب کر لیا جائے ورنہ اس سے بھی صرف نظر کر لیا جائے اور شاید اس طرح سے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پیغمبرِ اسلام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں اور اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست ظاہر کریں)۔

اسی مقصد کے لیے مدینہ کے بڑے یہودی پیغمبرِ اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: میں جو حکم کروں گا کیا اسے قبول کرو گے؟

وہ کہنے لگے: ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔

اس موقع پر زنائے محصنہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سنگسار کیے جانے کا حکم نازل ہوا لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا (اور عذر یہ پیش کیا کہ ہمارے مذہب میں تو ایسا حکم نہیں آیا)۔

پیغمبرِ اسلام نے مزید فرمایا: یہ وہی حکم ہے جو تمھاری تورات میں بھی آیا ہے کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ میں تم میں سے ایک شخص کو فیصلے کے لیے بلاؤں اور جو کچھ وہ تورات سے بیان کرے اسے قبول کر لوں۔

وہ کہنے لگے: جی ہاں۔



پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا: ابن صوریا ۔ ۔ ۔ ۔ جو کہ فدک میں رہتا ہے، کیسا عالم ہے؟

وہ بولے: وہ تو تورات کا سب سے بڑا عالم ہے۔

کسی کو اسے لینے کے لیے بھیجا گیا جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے اس سے فرمایا: تجھے اس خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰؑ پر نازل کیا، تمھارے لیے دریا شگاف کیا، تمھارے دشمن فرعون کو غرق کیا اور تمھیں بیابان میں اپنی نعمتوں سے نوازا ۔ ۔ ۔ ۔ کہو کیا ایسے موقع پر تورات میں تمھارے لیے سنگسار کرنے کا حکم نازل ہوا ہے یا نہیں؟

وہ کہنے لگا: آپ نے مجھے ایسی قسم دی ہے کہ میں مجبور ہو گیا ہوں کہ کہوں جی ہاں! ایسا ہی حکم تورات میں موجود ہے پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا: پھر اس حکم کے اجراء کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟

وہ بولا: حقیقت یہ ہے کہ ہم گذشتہ زمانے میں یہ حد عام افراد پر تو جاری کر دیتے تھے لیکن دولتمندوں اور بڑے لوگوں پر نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہمارے معاشرہ کے خوش حال طبقوں میں یہ گناہ رائج ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ایک سردار کا چچا زاد بھائی اس قبیح عمل کا مرتکب ہوا اور حسب معمول اسے سزا نہ دی گئی۔ اسی اثنا میں ایک عام آدمی اس کا مرتکب ہوا۔ جب اسے سنگسار کرنے لگے تو اس کے رشتہ داروں نے اعتراض کیا اور کہنے لگے اگر یہ حکم جاری ہونا ہے تو پھر دونوں پر ہو، اس صورت حال کے پیش نظر ہم بیٹھ گئے اور سنگسار کے قانون کی جگہ ایک آسان قانون بنا لیا اور وہ یہ تھا کہ ہر ایک کو چالیس کوڑے لگائے جائیں اور ان کا منہ کالا کر کے اور سواری پر بٹھا کر انھیں گلی کوچوں میں پھرایا جائے۔

اس وقت پیغمبرؐ اکرمؐ نے حکم دیا کہ اس مرد اور عورت کو مسجد کے سامنے سنگسار کیا جائے۔[1]

پھر آپؐ نے فرمایا: خدایا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا، جبکہ یہودی اسے ختم کر چکے تھے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تفسیر

دوست اور دشمن کے درمیان فیصلہ

زیر نظر آیات اور بعد کی چند آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے قاضی حق رکھتے ہیں کہ مخصوص شرائط کے ساتھ غیر مسلموں کے

---

[1] بیہقی نے اپنی سنن جلد ۸ صفحہ ۲۴۶ میں جو روایت نقل کی ہے۔ اس کے مطابق علماءِ یہود جب پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں آئے تھے تو اس عورت اور مرد کو بھی ساتھ لائے تھے۔



مقدمات کا بھی فیصلہ کریں، تفصیل آیات کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

زیر نظر آیات میں سے پہلی آیت یا ایھا الرسول (اے بھیجے ہوئے) سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں یہ تعبیر صرف دو جگہ پر نظر آتی ہے ایک اس مقام پر اور ایک اسی سورہ کی آیہ ۶۷ میں جہاں ولایت وخلافت کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے، معاملہ چونکہ اہم ہے اور دشمن کا خوف بھی ہے لہذا چاہتا ہے پیغمبر میں احساس مسئولیت کو اور متحرک کرے اور ان کے ارادے کو تقویت پہنچائے یہ کہتے ہوئے کہ تو صاحبِ رسالت ہے اور رسالت بھی ہماری .... اس لیے حکم بیان کرنے میں استقامت اور پامردی سے کام لو۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلجوئی اور تسلی کے لیے بعد والے حکم کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور ان کا دل کبھی ایمان نہیں لایا اور کفر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں وہ تمہارے غم واندوہ کا سبب نہ بنیں (کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) (لا یحزنك الذین یسارعون فی الکفر من الذین قالوا اٰمنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم)۔

بعض کا نظریہ ہے کہ "یسارعون فی الکفر" اور "یسارعون الی الکفر" میں فرق ہے کیونکہ پہلا جملہ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے جو کافر ہیں اور کفر کے اندر غوطہ زن ہیں اور کفر کے آخری مرحلے تک پہنچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں لیکن دوسرا جملہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو باہر سے کفر کی چار دیواری کی طرف حرکت میں ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں [1]

منافقین اور داخلی دشمنوں کی کارستانیوں پر ان کی حوصلہ شکنی کے بعد خارجی دشمنوں اور یہودیوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اسی طرح یہودیوں میں سے بھی جو لوگ اس راہ پر چل رہے ہیں وہ بھی تمہارے لیے حزن وملال کا باعث نہ ہوں (ومن الذین ھادوا)۔

اس کے بعد ان کے منافقانہ افعال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سنتے ہیں لیکن ان کی یہ توجہ اطاعت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انھیں تمہاری تکذیب کے لیے اور تم پر افترا باندھنے کے لیے کوئی عذر ہاتھ آجائے (سمّٰعون للکذب)۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ: وہ اپنے گذشتہ لوگوں کے جھوٹ اور افتراء کی طرف زیادہ کان دھرتے ہیں، لیکن حق بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں [2]

ان کی ایک اور صفت یہ ہے کہ یہ نہ صرف جھوٹ باندھنے کے لیے تمہاری مجلس میں آتے ہیں بلکہ جو لوگ تمہارے پاس نہیں آتے ان کے جاسوس کا کردار بھی ادا کرتے ہیں (سمّٰعون لقوم اٰخرین لم یأتوك)۔

---

[1] المنار ج ۲ صفحہ ۳۸۸

[2] پہلی صورت میں "للکذب" کی لام "لام تعلیل" ہے اور دوسری صورت میں "لام تعدیہ" ہے۔

دوسری تفسیر کے مطابق وہ اپنے گروہ کے حکم پر کان دھرتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی حکم اپنی منشاء کے مطابق سُن لیں تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور اگر کوئی حکم ان کے میلانِ طبع کے خلاف ہے تو اس کی مخالفت کرتے ہیں لہٰذا وہ اپنے بڑوں کا فرمان سنتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں نہ کہ تمھاری ۔ ان حالات میں ان کی مخالفت تمھارے لیے باعثِ غم واندوہ نہیں ہونا چاہیے ، کیونکہ وہ ابتداء سے ہی تمھارے پاس قبولِ حق کی غرض سے نہیں آئے ۔ ان کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ کلامِ الٰہی میں تحریف کرتے ہیں (چاہے تحریفِ لفظی ہو یا تحریفِ معنوی) جس حکم کو وہ اپنے مفاد اور ہوا و ہوس کے خلاف سمجھتے ہیں اس کی کوئی توجیہ کر لیتے ہیں یا اسے بالکل ستر کر دیتے ہیں (یحرفون الکلم من بعد مواضعہ)۔[۱]

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ تمھارے پاس آنے سے پہلے ہی پختہ ارادہ کر لیتے ہیں ان کے بڑوں نے انھیں حکم دیا ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی حکم ہماری خواہش کے مطابق دے تو اسے قبول کر لو اور اگر ہماری خواہش کے خلاف ہو تو اس سے دور رہو (یقولون ان اوتیتم ھذا فخذوہ و ان لم تؤتوہ فاحذروا)۔

وہ اس طرح سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے ان افکار و نظریات میں اتنے پختہ ہیں کہ بغیر کسی سوچ بچار اور تحقیق و مطالعہ کے جو کچھ بھی ان کے تحریف شدہ مطالب کے خلاف ہو اسے رد کر دیتے ہیں اس طرح ان کی ہدایت کی کوئی امید نہیں اور خدا چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے سزا دے کہ انھیں رسوا کرے اور جس کی سزا اور رسوائی کا خدا ارادہ کر لے تو تم ہرگز اس کا دفاع نہیں کر سکتے (ومن یرد اللہ فتنتہ فلن تملک لہ من اللہ شیئًا)۔

وہ اس قدر آلودہ ہیں کہ ان کی آلودگی دھلنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا (اولٓئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم) کیونکہ خدا کا کام ہمیشہ حکمت آمیز ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنے ارادے سے زندگی کا ایک حصہ کجروی میں گزار چکے ہیں اور نفاق، جھوٹ، مخالفتِ حق اور قوانینِ الٰہی میں تحریف کا جرم کر چکے ہیں ان کے لیے پلٹنا عادتاً ممکن نہیں ہے ۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : وہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی انھیں عذابِ عظیم ہوگا (لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم)۔

دوسری آیت میں قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے کہ ان کے سننے والے کان تو تمھاری بات سن کر اس کی تکذیب کرنے کے لیے ہیں (یا پھر وہ اپنے بڑوں کے جھوٹ سننے کے لیے گوشِ شنوا رکھتے ہیں) (سمٰعون للکذب) یہ جملہ تاکید کے طور پر ہے اور اس بُری صفت کے اثبات کے لیے تکرار ہے ۔

اس کے علاوہ وہ ناحق، حرام اور رشوت زیادہ کھاتے ہیں (اکالون للسحت)۔[۲]

---

[۱] تحریف کی کیفیت اور اقسام کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۱۳ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے ۔

[۲] "سحت" (بروزن "جفت") دراصل درخت کے چھلکا اتارنے اور شدید حرکت کے معنی میں ہے بعد ازاں ناجائز مال اور خصوصاً رشوت کے لیے بولا جانے لگا کیونکہ ایسا مال معاشرے سے تازگی، پاکیزگی اور برکت چھین لیتا ہے جیسے درخت سے چھلکے اگر دیئے جائیں تو اس پر پژمردگی چھا جاتی ہے اور وہ خشک ہو جاتا ہے اس بنا پر "سحت" کا ایک وسیع معنی ہے اگر بعض روایات میں اس کا کوئی خاص مصداق بیان کیا گیا ہے تو وہ اختصاص کی دلیل نہیں ہے ۔



اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کریں تو وہ احکام اسلام کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ان سے منہ پھیر بھی سکتے ہیں (فان جاؤك فاحكم بينهم او اعرض عنهم)۔

البتہ یہاں یہ مراد نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کسی ذاتی میلان کی بنیاد پر کوئی راستہ اپنائیں بلکہ مراد یہ ہے کہ حالات و اوضاع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر مصلحت ہو تو حکم جاری کریں ورنہ صرفِ نظر کر لیں۔

روحِ پیغمبر کی تقویت کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: اگر مصلحت اس میں ہو کہ ان سے منہ پھیر لو تو وہ تمہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے (و ان تعرض عنهم فلن يضروك شيئًا)۔

اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو یقیناً تمہیں اصولِ عدالت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ خدا، حق، انصاف اور عدالت کے مطابق فیصلہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (و ان حكمت فاحكم بينهم بالقسط ان الله يحب المقسطين)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومتِ اسلامی کو آج بھی یہ اختیار ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بارے میں احکامِ اسلام کے مطابق فیصلہ کر دے یا فیصلہ کرنے سے اعراض کرے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ اسلامی ماحول میں جو شخص بھی زندگی بسر کرتا ہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، حقوق اور جزاو سزا کے اسلامی قوانین سب کے بارے میں یکساں ہیں۔ اس بنا پر مندرجہ بالا آیت کا حکم یا تو منسوخ ہو چکا ہے یا غیر ذمی کفار سے مخصوص ہے (یعنی وہ کفار جو ایک اقلیت کے طور پر اسلامی ملک میں زندگی بسر نہیں کرتے لیکن مسلمانوں کے ساتھ معاہدوں میں شریک ہیں اور ان سے میل جول رکھتے ہیں)

بعض دیگر حضرات کا نظریہ ہے کہ اسلامی حکومت اس وقت بھی غیر مسلموں کے بارے میں یہ اختیار رکھتی ہے کہ وہ حالات و اوضاع کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصلحت سمجھے تو ان کے بارے میں احکامِ اسلام کے مطابق فیصلہ کرے اور یا انھیں ان کے اپنے قوانین کی طرف رجوع کرنے کی اجازت دے دے (تفصیلی مطالعہ اور تحقیق کے لیے فقہی کتب میں قضاوت کی بحث سے رجوع کریں)

۴۳- وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۟ؑ

ترجمہ

۴۳- وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات ہے اور اس میں خدا کا حکم موجود ہے (اور پھر) فیصلہ کے بعد انھوں نے چاہا کہ تجھ سے منہ پھیر لیں اور وہ مومن نہیں ہیں۔



تفسیر

گذشتہ آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے یہودیوں کے فیصلہ طلب کرنے کا ذکر تھا یہ آیت بھی اسی معاملے کے بارے میں ہے۔ یہاں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں جب کہ تورات ان کے پاس ہے اور اس میں خدا کا حکم بھی آچکا ہے (وکیف یحکمونك وعندهم التوریة فیها حکم الله)۔

یاد رہے کہ زنائے محصنہ کے مرتکب مرد و عورت کو سنگسار کرنے کا مذکورہ حکم موجودہ تورات کے سفر تثنیہ فصل بائیس میں موجود ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ وہ تو تورات کو ایک منسوخ کتاب نہیں مانتے اور دین اسلام کو باطل سمجھتے ہیں اس کے باوجود وہ تورات کے ان احکام کو چھوڑ کر جو ان کی طبیعت کے مطابق نہیں ہیں ایسے حکم کی تلاش کرتے ہیں جو اصولی طور پر ان کے موافق نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ تجھے فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لینے کے بعد تیرا حکم قبول نہیں کرتے کہ جو حکم تورات کے مطابق ہے کیونکہ یہ حکم ان کے میلان اور رغبت کے خلاف ہے (ثم یتولون من بعد ذلك) حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان ہی نہیں رکھتے ورنہ احکامِ خدا کے ساتھ ایسا کھیل نہ کھیلتے (وما اولئك بالمؤمنین)۔

ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ مندرجہ بالا آیت یہ کیونکر کہتی ہے کہ حکم خدا تورات میں مذکور ہے حالانکہ قرآنی آیات اور تاریخی اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات تحریف شدہ کتاب ہے اور یہی تحریف شدہ کتاب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھی۔

اس سلسلے میں توجہ رہے کہ اول تو ہم تمام تورات کو تحریف شدہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کے کچھ حصے کو واقع کے مطابق جانتے ہیں اور اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث حکم غیر تحریف شدہ احکام میں سے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تورات جو کچھ بھی تھی یہودیوں کے نزدیک تو ایک آسمانی کتاب تھی جو تحریف شدہ نہیں سمجھی جاتی تھی لہٰذا ان حالات میں کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس پر عمل نہ کریں۔

۴۴۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ‌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ
اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ
كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ‌ ۚ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَاخۡشَوۡنِ
وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا‌ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ
هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ○



ترجمہ

۴۴۔ ہم نے تورات کو نازل کیا کہ جس میں ہدایت اور نور تھا اور انبیاء کہ جو حکم خدا کے سامنے تسلیم تھے اس کے مطابق یہودیوں میں فیصلہ کرتے تھے اور (اسی طرح) علماء بھی اس کتاب کے مطابق حکم کرتے تھے کہ جو ان کے سپرد تھی اور وہ اس پر گواہ تھے اس بنا پر (آیاتِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کے بارے ہیں) لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات معمولی قیمت پر نہ بیچو اور جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

تفسیر

زیرِ نظر اور آئندہ آیت گذشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ حضرت موسٰیؑ کی آسمانی کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے، ہدایت حق کی طرف راہنمائی کے لیے اور نور جہل و نادانی کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے (انا انزلنا التورٰىة فیھا ھدی و نور)۔

اس بنا پر وہ پیغمبرانِ خدا جو حکم خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور نزولِ تورات کے بعد مصروف کار تھے، سب یہودیوں کے لیے اس کے مطابق حکم کرتے تھے (یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا)

صرف وہی ایسا نہ کرتے تھے بلکہ یہودیوں کے بزرگ علماء اور صاحبِ ایمان پاکباز دانشور اس آسمانی کتاب کے ہی مطابق فیصلہ کرتے تھے جو ان کے سپرد کی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے (و الربانیون و الاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ و کانوا علیہ شھداء)۔[1]

یہاں روئے سخن اہلِ کتاب کے ان علماء کی طرف ہے جو اس زمانے میں موجود تھے ارشاد ہوتا ہے: لوگوں سے نہ ڈرو اور خدا کے حقیقی احکام بیان کرو اور چاہیے تو یہ کہ میری مخالفت سے ڈرو کیونکہ اگر تم نے حق کو چھپایا تو تمہیں سزا دی جائے گی (فلا تخشوا الناس و اخشون) اور اسی طرح آیاتِ خدا کو کم قیمت پر نہ بیچو (و لا تشتروا

---

[1] "ربانی" کے معنی اور اس کے اصلی مادہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد دوم ص۔۔۔ (اردو ترجمہ) میں بحث کی جا چکی ہے نیز "احبار" "حبر" (بروزن "فکر") کی جمع ہے اور اسی طرح بروزن "ابر" ہو تو اس کا معنی ہے "نیک اثر"۔ بعد از اں یہ لفظ ایسے علماء کے بارے میں استعمال ہونے لگا جو معاشرے میں اچھا اور نیک اثر رکھتے ہوں۔ دوات کی سیاہی کو بھی "حبر" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ نیک آثار رکھتی ہے۔

بآیاتی ثمناً قلیلاً)۔

دراصل حق کو چھپانے کی وجہ یا لوگوں کا خوف ہے یا پھر ذاتی مفاد کا حصول بہر حال جو کچھ بھی ہو ضعفِ ایمان کی دلیل اور مقامِ انسانیت کی نفی ہے اور مندرجہ بالا جملوں میں دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایسے اشخاص کے بارے میں آیت کے آخر میں قطعی فیصلہ صادر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

جو لوگ احکامِ خدا کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون)۔

واضح ہے کہ حکم خدا کے مطابق فیصلہ نہ کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ خاموش رہا جائے اور بالکل کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور اپنی خاموشی سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا جائے اور یہ بھی کہ بات کی جائے اور حکم خدا کے خلاف فیصلہ دیا جائے۔

یہ بھی واضح ہے کہ کفر کے کئی مراتب اور مختلف درجات ہیں اور یہ اصل وجود خدا کے انکار سے شروع ہوتا ہے اور اس کی نافرمانی اور معصیت تک جا پہنچتا ہے کیونکہ ایمان کامل انسان کو حکم خدا کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور وہ جو عمل نہیں کرتے ان کا ایمان کامل نہیں ہے۔

یہ آیت ہر اُمّت کے علماء اور دانشوروں پر عائد ہونے والی بھاری ذمہ داری اور جوابدہی کو واضح کرتی ہے۔ آیت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے گرد و نما ہونے والے معاشرتی طوفانوں اور حوادث کا مقابلہ کریں۔ کجرویوں کے خلاف فیصلہ کن انداز میں ڈٹ جائیں اور کسی سے خوف نہ کھائیں۔

۴۵۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ
بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ
تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ
هُمُ الظَّالِمُونَ ○

ترجمہ

۴۵۔ اور ہم نے اس (تورات) میں ان (بنی اسرائیل) کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان ہے اور ہر زخم کے لیے قصاص ہے اور اگر کوئی (قصاص سے صرفِ نظر کرتے ہوئے) اسے بخش دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور



جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

تفسیر

قصاص اور درگذر

اس آیت میں ان حدود الٰہی کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو تورات میں ہیں، فرمایا گیا ہے: ہم نے تورات میں قانونِ قصاص مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو مقتول کے اولیاء قاتل کو اس کے بدلے قتل کر سکتے ہیں (وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس)۔

اور اگر کوئی دوسرے کی آنکھ کو نقصان پہنچائے اور اسے ختم کر دے تو وہ اس کی آنکھ نکال سکتا ہے (والعین بالعین)

اسی طرح کسی کی ناک کاٹنے کے بدلے جائز ہے کہ مجرم کی ناک کاٹی جائے (والانف بالانف)۔

نیز کان کاٹنے کے بدلے مد مقابل کا کان کاٹا جا سکتا ہے (والاذن بالاذن)۔

اور اگر کوئی کسی کا دانت توڑ دے تو وہ بھی اس کا دانت توڑ سکتا ہے (والسن بالسن)۔

اسی طرح جو بھی کسی کو کوئی زخم لگائے تو وہ اس کے بدلے قصاص لے سکتا ہے (والجروح قصاص)

لہٰذا حکم قصاص بغیر کسی نسلی، طبقاتی، اجتماعی، قبائلی اور شخصی امتیاز کے جاری ہوگا اور اس سلسلے میں کسی کے لیے بھی کسی پہلو سے کوئی فرق اور تبعیض نہیں ہے (البتہ دیگر اسلامی احکام کی طرح اس حکم کی بھی کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں موجود ہیں کیونکہ یہ حکم بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے اسلام میں بھی اس کی نظیر موجود ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۷۸ میں مذکور ہے کہ جو آیہ قصاص ہے)۔

ناروا امتیازات اور تفریقات جو اس زمانے میں مروج تھیں انھیں یہ آیت ختم کرتی ہے جیسا کہ بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں یہود مدینہ کے دو گروہوں میں ایک عجیب عدم مساوات موجود تھی اور وہ یہ کہ بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو اس سے قصاص نہ لیا جاتا لیکن اس کے برعکس بنی قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو وہ اس کے بدلے قتل کیا جاتا۔

جب مدینہ میں اسلام آیا تو بنی قریظہ نے اس بارے میں پیغمبر اسلام سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا،

خون کسی کا ہو کوئی فرق نہیں۔

اس پر بنی نضیر اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے:

آپ ہمارا مقام نیچے لے آئے ہیں اور اسے پست کر دیا ہے۔

زیر نظر آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ نہ صرف اسلام میں بلکہ یہودیوں کے دین میں بھی مساوات کا



یہ قانون موجود ہے[1]

لیکن اس بنا پر کہیں یہ گمان نہ ہو کہ خدا نے قصاص کو لازمی قرار دیا ہے اور مقابلہ بمثل کی دعوت دی ہے، مزید فرمایا گیا ہے: اگر کوئی اپنے حق سے درگذر کرے اور عفو و بخشش سے کام لے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور جس طرح اس نے درگذر سے کام لیا ہے خدا اس سے درگذر کرے گا[2] (فمن تصدق به فهو كفارة له)۔

گویا قصاص ایک صدقہ و عطیہ ہے جو مجرم کو بخش دیا گیا ہے یہاں "تصدق" کی تعبیر اور خدا کی طرف سے "تصدق کرنے والے کو عفو کا وعدہ، یہ سب کچھ عفو و درگذر کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ قصاص کے ذریعے کھوئی ہوئی چیز تو ہاتھ میں نہیں آسکتی یہ تو فقط وقتی سکون و اطمینان دیتا ہے لیکن خدا کی طرف سے عفو و بخشش کا وعدہ دراصل ایک دوسری صورت میں اس کی تلافی ہے جو وہ ہاتھ سے دے بیٹھا ہے اور اس طرح سے اس کی پریشانی ختم ہو جاتی ہے اور یہ ایسے لوگوں کے لیے عمدہ اور بہترین تشویق ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

جو شخص معاف کر دیتا ہے، خدا بھی اسی طرح اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے[3]

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے جو قانون قصاص کو غیر عادلانہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک آدم کش قانون قرار دیتے ہیں۔ پوری آیت پر غور و خوض سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص کی اجازت مجرموں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہے تا کہ بے گناہ لوگ ان کے اقدام جرم سے مامون رہیں لیکن اس کے باوجود عفو و بازگشت کا راستہ بھی کھلا رکھا گیا ہے۔ خوف و امید کی یہ کیفیت پیدا کرتے ہوئے اسلام چاہتا ہے کہ ظلم و زیادتی کو بھی روکے اور جتنا ہو سکے اور مناسب ہو خون کو خون سے پاک کرنے کی پیش بندی بھی کرے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں (ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الظلمون)۔

اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوگا کہ ہم جھوٹے احساسات اور جذبات سے مغلوب ہو کر قاتل سے اس بہلنے سے صرف نظر کر لیں کہ خون کو خون سے نہ دھویا جائے اور قاتلوں کے ہاتھ دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کے لیے کھلے چھوڑ دیں، اور اس طرح سے بے گناہوں پر ظلم و ستم کریں۔

توجہ رہے کہ موجودہ تورات میں بھی سفر خروج کی اکیسویں فصل میں ہے کہ:

اور اگر دوسرے کو اذیت پہنچائی گئی ہو تو اس وقت جان کے عوض جان دی جائے، آنکھ کے

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۳ صفحہ ۲۱۸۸

[2] بہت سے مفسرین نے آیت کے بارے میں ایک اور احتمال بھی پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ "لہ" کی ضمیر مجرم کے بارے میں ہے اسطرح آیت کا معنی یہ ہوگا: جو شخص اپنے حق سے درگذر کرے تو اس سے جان کا قصاص برطرف ہو جائے گا اور یہ اس کے عمل کا کفارہ شمار ہوگا لیکن آیت کا ظہور وہی ہے جو ذکر ہو چکا ہے۔

[3] نور الثقلین ج ۱ ص ۶۳۷



عوض آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں اور
جلانے کے بدلے جلایا جائے، زخم کے عوض زخم اور تھپیڑ کے بدلے تھپیڑ[1]

۴۶- وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً
لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ؕ

ترجمہ

۴۶- اور ان (گذشتہ انبیاء) کے بعد ہم نے عیسٰی کو مقرر کیا تاکہ اس سے پہلے جو تورات میں بھیجا گیا تھا اس کی تصدیق کرے اور ہم نے اسے انجیل دی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا (اور اس کی یہ آسمانی کتاب بھی) تورات کی تصدیق کرتی تھی جو اس سے پہلے تھے اور متقیوں کے لیے ہدایت اور موعظہ ہے۔

تفسیر

تورات سے مربوط آیات کے بعد یہ آیت انجیل کی کیفیت بیان کر رہی ہے ارشاد ہوتا ہے، گذشتہ رہبروں اور پیغمبروں کے بعد ہم نے مسیح کو مبعوث کیا جبکہ اس کی نشانیاں بالکل ان نشانیوں کے مطابق تھیں جو تورات نے بیان کی تھیں (وقفینا علی اٰثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التورٰۃ)۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیح نے تورات کی حقانیت کا اعتراف کیا کہ جو حضرت موسیٰ بن عمران پر نازل ہوئی تھی جیسے تمام آسمانی پیغمبر اپنے سے پہلے انبیاء کی حقانیت کے معترف تھے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے انجیل سونپی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا (و اٰتینٰہ الانجیل فیہ ھدی و نور)

قرآن مجید میں تورات، انجیل اور قرآن تینوں کو نور کہا گیا ہے۔ تورات کے بارے میں ہے:

انا انزلنا التورٰۃ فیھا ھدی و نور (مائدہ - ۴۴)

---

[1] سفر خروج - جملہ ۲۳، ۲۴ اور ۲۵



انجیل کے بارے میں تو مندرجہ بالا آیت شاہد ہے اور قرآن کے بارے میں ہے:

"قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین"

(مائدہ ۔ ۱۵)

درحقیقت جیسے تمام موجودات عالم اپنی زندگی کے تسلسل کے لیے نور کے سخت محتاج ہیں۔ اسی طرح خدا کے دین اور آسمانی کتب کے احکام و قوانین انسانوں کے رشد و تکامل اور ارتقاء کے لیے ناگزیر ہیں۔ اصولی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ تمام توانائیوں اور حرکات اور زیبائیوں کا سرچشمہ نور ہے اور نور نہ ہو تو خاموشی اور موت تمام جگہوں پر چھا جائے۔ اسی طرح پیغمبروں کی تعلیمات نہ ہوں تو تمام انفرادی و اجتماعی انسانی قدریں موت کی نیند سو جائیں اور اس کے نمونے ہم مادی معاشروں میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

قرآن نے کئی ایک مقامات پر تورات اور انجیل کو آسمانی کتاب کے عنوان سے یاد کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اصل میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ اپنے پیغمبروں کے بعد یہ دونوں آسمانی کتابیں تحریف کی نذر ہو گئیں کچھ حقائق ان میں سے کم کر دیئے گئے اور کچھ بے ہودہ باتیں اور خرافات ان میں شامل کر دی گئیں اور یوں ان کی قدر و قیمت گرا دی گئی بلکہ اصلی کتب تو بھلا دی گئیں اور کچھ اور کتب نے ان کی جگہ لے لی۔ جن میں کچھ حصّہ اصلی کتب کا بھی تھا۔[۱] لہٰذا نور کا اطلاق اصلی تورات اور انجیل پر ہوتا ہے۔ تحریف شدہ کتب پر نہیں۔

دوبارہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے کہ: نہ صرف یہ کہ عیسیٰ بن مریم، تورات کی تصدیق کرتے تھے بلکہ ان کی آسمانی کتاب انجیل بھی تورات کی صداقت پر گواہ تھی (مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ)۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے: یہ آسمانی کتاب پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت کا سرمایہ ہے (وھدًی وموعظۃً للمتقین)۔

یہ تعبیر بھی ویسی ہی ہے جیسی سورۂ بقرہ کی ابتداء میں قرآن کے بارے میں آئی ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

ھدی للمتقین

یعنی ...... قرآن پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

نہ صرف قرآن بلکہ تمام آسمانی کتب اسی طرح پرہیزگاروں کی ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ پرہیزگاروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کی تلاش میں رہتے ہیں اور اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ واضح ہے کہ جو لوگ ہٹ دھرمی اور دشمنی کی بنا پر اپنے دل کا دریچہ حق کے سامنے بند کر لیتے ہیں وہ کسی بھی حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔

---

[۱] تورات اور انجیل میں تحریف اور اس کی تاریخی اسناد کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کتاب "الہدیٰ الی دین المصطفیٰ" اور "انیس الاعلام" کی طرف رجوع فرمائیں۔



یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں پہلے انجیل کے بارے میں " فیہ ھدًی " کہا گیا ہے اور بعد میں بطور مطلق " ھدی " کہا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ انجیل اور دوسری آسمانی کتب میں ہر شخص کے لیے بلا استثناء ہدایت کے دلائل موجود ہیں لیکن پرہیزگاروں کے لیے کہ جو اس میں وقت نظر کرتے ہیں وہ ہدایت زتبیت، تکامل اور ارتقاء کا باعث ہے۔

۴۷۔ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

ترجمہ

۴۷۔ ہم نے اہل انجیل (پیروان مسیح) سے کہا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے وہ اس کے مطابق حکم کریں اور جو لوگ اس کے مطابق حکم نہیں کرتے جو خدا نے نازل کیا ہے، وہ فاسق ہیں۔

تفسیر

وہ جو قانونِ الٰہی کے مطابق حکم نہیں کرتے

گذشتہ آیات میں انجیل کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اہل انجیل کو حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق حکم اور فیصلہ کریں (و لیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ)۔

اس میں شک نہیں کہ اس جملے سے یہ مراد نہیں کہ قرآن عیسائیوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ انھیں اس وقت انجیل کے احکام پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ یہ بات تو قرآن کی دیگر آیات اور خود وجود قرآن سے مناسبت نہیں رکھتی کہ جو نئے آئین اور دین کا اعلان کر رہا ہے، پرانے دین کو منسوخ کر رہا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم نے عیسیٰ پر انجیل نازل کرنے کے بعد اس کے پیروکاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں[1]

آیت کے آخر میں پھر بطور تاکید فرماتا ہے: جو لوگ حکم خدا کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ فاسق ہیں (و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون)۔

---

[1] درحقیقت اسی طرح جیسے بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "قلنا" یہاں مقدر ہے اور آیت کا مفہوم ہے: و قلنا لیحکم اھل الانجیل......



یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک مقام پر انھی افراد کو "کافر" کہا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر "ظالم" قرار دیا گیا ہے اور تیسرے مقام پر "فاسق" کہا گیا ہے۔ تعبیر میں یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ ہر حکم تین پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف سے وہ قانون بنانے والے (خدا) پر منتہی ہوتا ہے دوسری طرف قانون جاری کرنے والے (حاکم و قاضی) تک پہنچتا ہے اور تیسری طرف اس شخص کہ جس پر قانون جاری ہو رہا ہے (محکوم) تک پہنچتا ہے۔ گویا ہر تعبیر تین میں سے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ جو شخص خدا کے ایک حکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ ایک طرف سے قانون الٰہی کو پاؤں تلے روند کر "کفر" اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف ایک بے گناہ انسان پر "ظلم" کرتا ہے اور تیسری طرف وہ اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کی سرحد سے انحراف کرکے "فاسق" بن جاتا ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ فسق کا معنی بندگی اور مسئولیت کی سرحد سے تجاوز ہے۔

۴۸۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ
وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ

ترجمہ

۴۸۔ اور اس کتاب کو ہم نے حق کے ساتھ تم پر نازل کیا جبکہ یہ گذشتہ کُتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ و نگہبان ہے لہٰذا خدا نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کے مطابق حکم کرو اور ان کے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور احکامِ الٰہی سے منہ نہ پھیرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے واضح آئین اور طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمّت قرار دیتا لیکن خدا چاہتا ہے کہ اس نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے اس میں تمھیں آزمائے (اور تمھاری صلاحیتوں کی نشوونما کرے) اس لیے تم کوشش کرو اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔ تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور جس میں تم نے اختلاف کیا ہے وہ تمھیں اس کی



خبر دیتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ انبیاءؑ کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں قرآن کے مقام و مرتبے کا تذکرہ ہے۔ "مهیمن" دراصل ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی محافظ، شاہد، امین اور نگہدار ہو۔ قرآن چونکہ گذشتہ آسمانی کتب کے اصولوں کی مکمل حفاظت و نگہداری کرتا ہے اور ان کی تکمیل کرتا ہے لہٰذا اسے "مهیمن" قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ہم نے اس آسمانی کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے، جبکہ یہ گذشتہ کتب کی تصدیق کرتا ہے (اور اس کی نشانیاں اور علامات اُن کے مطابق ہیں جو گذشتہ کتب نے بتائی ہیں) اور یہ ان کا محافظ و نگہبان ہے (وانزلنا الیك الكتاب بالحق مصدقا لما بین یدیه من الكتاب و مهیمنا علیه)۔

بنیادی طور پر تمام آسمانی کتابیں اصولِ مسائل میں ہم آہنگ ہیں اور سب کا ہدف و مقصد ایک ہی ہے یعنی سب انسانی تربیت، ارتقاء اور تکامل کے درپے ہیں اگرچہ فروعی مسائل میں تکامل وارتقاء کے تدریجی قانون کے مطابق مختلف ہیں اور ہر نیا دین بالاتر مرحلے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور جامع تر پروگرام پیش کرتا ہے۔

"مصدقا لما بین یدیه" کے بعد "مهیمنا علیه" کا ذکر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی گذشتہ کتب کے اصول کی تصدیق کرتے ہوئے قرآن جامع ترین پروگرام پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ جب ایسا ہے تو ان احکام کے مطابق فیصلہ کرو جو تم پر نازل ہوئے ہیں (فاحكم بینهم بما انزل الله) یہ جملہ فاءِ تفریع کے ساتھ آیا ہے جو گذشتہ ادیان کے احکام کی نسبت احکامِ اسلام کی جامعیت کا نتیجہ ہے۔ یہ حکم گذشتہ آیات کے اس حکم کے منافی نہیں کہ جن میں پیغمبر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان کے درمیان خود فیصلہ کریں یا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ جب اہلِ کتاب کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو قرآن کے احکام کے مطابق فیصلہ کرو۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ احکامِ الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیں، تم ان کے ہوا و ہوس اور خواہشات کی اتباع نہ کرو۔ اور حق میں سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس سے منہ نہ پھیرو (ولا تتبع اهواءهم عما جاءك من الحق)۔

بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے دین، شریعت، طریقہ اور واضح راستے کا تعین کر دیا ہے (لكل جعلنا منكم شرعة و منهاجا)" شرع" اور "شريعة" اس راستے کو کہتے ہیں جو پانی کی طرف جاتا ہو اور وہاں جا کر ختم ہوتا ہو اور دین کو شریعت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حقائق اور ایسی تعلیمات تک پہنچاتا ہے جو پاکیزگی، طہارت اور انسانی زندگی کا سرمایہ ہیں "نهج" اور "منهاج" واضح راستے کو کہتے ہیں راغب نے مفردات میں ابن عباس سے نقل کیا ہے۔



"شرعۃ" اور "منہاج" میں یہ فرق ہے کہ "شرعۃ" اسے کہا جاتا ہے جو قرآن میں وارد ہوا ہے اور منہاج سے مرادوہ امور ہیں جو سنتِ پیغمبرؐ میں وارد ہوئے ہیں۔

یہ فرق اگرچہ جاذبِ نظر ہے لیکن اس کے لیے کوئی مُقطعی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا میں یہ طاقت تھی کہ وہ تمام لوگوں کو ایک ہی امت قرار دے دیتا اور سب کو ایک ہی دین کا پیرو بنا دیتا لیکن یہ بات تدریجی تکامل کے قانون اور مختلف تربیتی مراحل کے اصول سے مناسبت نہیں رکھتی تھی (ولو شاء اللّٰہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن لیبلوکم فیما اٰتاکم)۔

لیبلوکم فیما اٰتاکم ــــ یعنی تاکہ تمھیں ان چیزوں کے متعلق آزمائے جو تمھیں دی گئی ہیں۔

یہ جملہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ خدا نے وجودِ انسانی میں مختلف قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور وہ آزمائشوں کے ذریعے اور تعلیماتِ انبیاء کے ذریعے لوگوں کی تربیت اور پرورش کرتا ہے۔ اسی لیے ایک مرحلہ طے کرنے کے بعد انھیں بالاتر مرحلے میں لے جاتا ہے ایک دور کے ختم ہونے پر دوسرے پیغمبر کے ذریعے بالاتر دور میں لے جاتا ہے بالآخر تمام اقوام و ملل کو مخاطب کرکے دعوت دیتا ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیاں اختلافات و مشاجرات میں صرف کرو، نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو (فاستبقوا الخیرات) کیونکہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہی روزِ قیامت ان چیزوں سے آگاہ کرے گا، جن میں تم اختلاف کرتے ہو (الی اللّٰہ مرجعکم جمیعًا فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون)۔

۴۹۔ وَ اَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ○

۵۰۔ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ

---

[1] بعض بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ دین اور شریعت کے درمیان فرق یہ ہے کہ دین توحید اور دیگر اصول سے عبارت ہے جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں اسی لیے دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے لیکن شریعت ایسے قوانین و احکام کو کہا جاتا ہے جو ان مذاہب میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ہمارے پاس اس فرق کے لیے بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں الفاظ بہت سے مواقع پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔



يُوقِنُونَ ○

ترجمہ

۴۹- اور ان (اہل کتاب) کے درمیان تمھیں اس کے مطابق حکم کرنا چاہیے جو خدا نے نازل کیا ہے اور انکی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس سے بچو کہ کہیں تمھیں وہ بعض ایسے احکام سے منحرف کر دیں جو تم پر نازل ہوئے ہیں اور اگر وہ (تمھارے کام اور فیصلے سے) روگردانی کریں تو جان لو کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کے بدلے انھیں سزا دے اور بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

۵۰- کیا وہ (تم سے) زمانۂ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے خدا سے بہتر حکم کون کرسکتا ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس پہلی آیت کی شانِ نزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے:

یہودیوں کے بڑوں کی ایک جماعت نے آپس میں سازش کی اور کہا کہ محمد (ص) کے پاس جاتے ہیں۔ شاید اسے ہم اس کے دین سے منحرف کر دیں۔ یہ طے کرکے وہ پیغمبر اسلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم یہودیوں کے علماء اور اشراف ہیں، اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو مسلّم ہے کہ باقی یہودی ہماری اقتداء کریں گے لیکن ہمارے اور ایک اور گروہ کے درمیان ایک نزاع ہے (ایک شخص کے قتل یا کسی اور بات کے بارے میں) اگر اس جھگڑے میں آپ ہمارے فائدے میں فیصلہ کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر پیغمبر اسلام نے ایسے (غیر عادلانہ) فیصلے سے منہ موڑ لیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

اس آیت میں خدا تعالیٰ دوبارہ اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ اہلِ کتاب کے درمیان حکمِ خدا کے مطابق فیصلہ کریں، اور ان کی ہوا و ہوس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں (وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوائھم)۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۲۱



اس حکم کی تکرار یا تو ان مطالب کی وجہ سے ہے جو آیت کے ذیل میں آئے ہیں یا اس بنا پر ہے کہ اس فیصلے کا موضوع گذشتہ آیات کے فیصلے کے موضوع سے مختلف ہے۔ گذشتہ آیات میں موضوع زنائے محصنہ تھا اور یہاں موضوع قتل یا کوئی اور جھگڑا تھا۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کو متوجہ کیا گیا ہے کہ انھوں نے سازش کی ہے کہ تمھیں آئین حق و عدالت سے روگرداں کر دیں تم ہوشیار اور آگاہ رہو(واحذرهم ان يفتنوك عن بعض ما انزل الله اليك)۔

اور اگر اہل کتاب تمھارے عادلانہ فیصلے کے سامنے سر نہیں جھکاتے تو جان لو کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے گناہوں نے ان کا دامن پکڑ رکھا ہے اور ان سے توفیق سلب ہو چکی ہے اور خدا چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دے (فان تولوا فاعلم انما يريد الله ان يصيبهم ببعض ذنوبهم)۔

تمام گناہوں کی بجائے بعض گناہوں کا ذکر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ تمام گناہوں کی سزا اس دنیا میں انجام نہیں پاتی صرف کچھ سزا انسان کو ملتی ہے اور باقی معاملہ دوسرے جہان کے سپرد ہو جاتا ہے۔

انھیں کون سی سزا دامن گیر ہوگی۔ اس کی آیت میں کوئی صراحت نہیں ہے لیکن احتمال ہے کہ یہ اسی انجام کی طرف اشارہ ہے، جس سے مدینہ میں یہودی دوچار ہوئے۔ وہ اپنی پے در پے خیانتوں کے باعث اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ سے باہر چلے جانے پر مجبور ہوئے یا یہ کہ سلب توفیق ان کے لیے ایک سزا شمار ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں پیہم گناہ اور ہٹ دھرمی کی سزا عادلانہ احکام سے محرومی اور بے راہ و سرگرداں زندگی کی صورت میں انھیں ملی ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اگر یہ لوگ راہِ باطل میں ڈوبے ہوئے ہیں تو تم پریشان نہ ہونا کیونکہ بہت سے لوگ فاسق ہیں (وان كثيرًا من الناس لفاسقون)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ہو سکتا ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ زیر بحث آیت اس امر پر دلیل ہے کہ پیغمبرؐ بھی حق سے انحراف کر سکتے ہیں لہٰذا خدا انھیں تنبیہ کر رہا ہے تو کیا یہ بات انبیاء کے معصوم ہونے کے مقام سے مناسبت رکھتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معصوم ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ پیغمبر اور امام کے لیے گناہ محال ہے ورنہ ان کے لیے ایسی عصمت میں تو کوئی فضیلت نہ ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ گناہ کی طاقت رکھنے کے باوجود گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اگر چہ یہ مرتکب نہ ہونا تذکراتِ الٰہی کی وجہ سے ہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں خدائی توجہات گناہ سے پیغمبر کے محفوظ رہنے کا ایک عامل ہے۔

انبیاء اور آئمہ کے مقام عصمت کے بارے میں تفصیلی بحث انشاءاللہ آیت تطہیر (احزاب - ۳۳) کے ذیل میں آئے گی۔

بعد والی آیت میں استفہام انکاری کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا یہ لوگ آسمانی کتب کی پیروی کے مدعی ہیں،



توقع رکھتے ہیں کہ تم زمانہ جاہلیت کے احکام کی طرح اور تبعیض و امتیاز برتتے ہوئے ان کے درمیان قضاوت کرو (افحکم الجاھلیة یبغون) حالانکہ اہلِ ایمان کے لیے حکمِ خدا سے بہتر اور بالاتر کوئی فیصلہ نہیں ہے (ومن احسن من الله حکمًا لقوم یوقنون)۔

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ یہودیوں کے مختلف قبائل میں بھی عجیب و غریب امتیازات تھے۔ مثلاً اگر بنی قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو قصاص لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو قصاص نہ لیا جاتا یا یہ کہ دیت اور خون بہا عام دیت سے دوگنا لیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے امتیازات زمانہ جاہلیت کی نشانیاں ہیں۔ جبکہ خدائی احکام کی نظر میں بندگانِ خدا میں کوئی امتیاز نہیں۔

کافی میں امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

الحکم حکمان حکم الله وحکم الجاهلیة فمن اخطأ حکم الله حکم بحکم الجاهلیة

حکم صرف دو طرح کے ہیں۔ اللہ کا حکم یا جاہلیّت کا حکم۔ اور جو خدا کا حکم چھوڑ دے، اس نے جاہلیّت کا حکم اختیار کر لیا۔[1]

اس سے واضح ہوتا ہے آسمانی احکام کے حامل ہونے کے باوجود آج مسلمان دوسری اقوام و ملل کے جعلی قوانین کے جو پیچھے پڑے ہوئے ہیں، درحقیقت جاہلیت کے راستے پر گامزن ہیں۔

۵۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۵۲۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِىْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ○ؕ

۵۳۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ○

[1] نورالثقلین جلد ۱ ص ۶۴۰



ترجمہ

۵۱۔ اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا سہارا نہ بناؤ۔ وہ تو ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں اور جو اُن پر بھروسہ کرتے ہیں وہ انھی میں سے ہیں اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

۵۲۔ تم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں بیماری ہے جو (ایک دوسرے کی دوستی میں) ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے (کہ جس میں ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑے) شاید خدا کی طرف سے کوئی اور کامیابی یا واقعہ (مسلمانوں کے فائدے میں) رونما ہو جائے اور یہ لوگ اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں۔

۵۳۔ اور وہ جو ایمان لائے ہیں کہتے ہیں کیا یہ وہی (منافق) ہیں جو بڑی تاکید سے قسم کھاتے ہیں کہ وہ تمھارے ساتھ ہیں (ان کا معاملہ یہاں تک کیوں آپہنچا کہ) ان کے اعمال نابود ہو گئے اور وہ خسارے میں جا پڑے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ جنگِ بدر کے بعد عبادہ بن صامت خزرجی پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یہودیوں میں کچھ میرے ہم پیمان ہیں جو تعداد میں بہت ہیں اور طاقت ور ہیں، اب جبکہ وہ ہمیں جنگ کی دھمکی دے رہے ہیں اور مسلمانوں کا معاملہ غیر مسلموں سے الگ ہو گیا ہے تو میں ان کی دوستی اور عہد و پیمان سے برأت کا اظہار کرتا ہوں میرا ہم پیمان صرف خدا اور اس کا رسولؐ ہے۔

عبداللہ بن ابی کہنے لگا: میں تو یہودیوں کی ہم پیمانی سے براءت نہیں کرتا کیونکہ میں مشکل حوادث سے ڈرتا ہوں اور مجھے ان لوگوں کی ضرورت ہے۔

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: یہودیوں کی دوستی کے سلسلہ میں مجھے جس بات کا ڈر عبادہ کے بارے تھا وہی تیرے متعلق بھی ہے (اور اس دوستی اور ہم پیمانی کا خطرہ اس کی نسبت تیرے لیے بہت زیادہ ہے)۔

عبداللہ کہنے لگا: اگر ایسی بات ہے تو میں بھی قبول کرتا ہوں اور ان سے رابطہ منقطع کر لیتا ہوں۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے سے ڈرایا گیا۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیات مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ہم کاری سے شدت کے ساتھ ڈراتی ہیں۔ پہلی آیت میں



فرمایا گیا ہے : اے ایمان والو ! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا سہارا اور ہم پیمان نہ بناؤ (یعنی خدا پر ایمان کا تقاضا ہے کہ مادی مفاد کے لیے ان سے ہم کاری اور دوستی نہ کرو) (یآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود و النصارٰی اولیاء)۔

"اولیاء" "ولی" کی جمع ہے اور "ولایت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان بہت زیادہ قرب، نزدیکی اور دوستی۔ نیز اس میں ہم پیمان ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے لیکن آیت کی شان نزول اور باقی موجود قرائن کو مدنظر رکھا جائے تو پھر اس سے مراد یہاں یہ معنی نہیں کہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے کوئی تجارتی اور سماجی رابطہ نہ رکھیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان سے عہد و پیمان نہ کریں اور دشمنوں کے مقابلے میں ان کی دوستی پر بھروسہ نہ کریں۔

عہد و پیمان کا مسئلہ اس زمانے میں عربوں میں بہت رائج تھا اور اسے "ولاء" سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں "اہل کتاب" نہیں کہا گیا بلکہ یہود و نصاریٰ کہا گیا ہے۔ شاید یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ اپنی آسمانی کتاب پر عمل کرتے تو پھر تمھارے اچھے ہم پیمان ہوتے لیکن ایک دوسرے سے ان کا اتحاد آسمانی کتاب کی رُو سے نہیں ہے بلکہ سیاسی اور نسلی اغراض پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر سے جملے سے اس نہی کی دلیل بیان فرمائی گئی ہے :

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اپنے ہم مسلک لوگوں کے دوست اور ہم پیمان ہیں (بعضھم اولیاء بعض) یعنی جب تک ان کے اپنے اور ان کے دوستوں کے مفادات بیچ میں ہیں وہ تمھاری طرف ہرگز متوجہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی کرے اور عہد و پیمان باندھے وہ اجتماعی اور مذہبی تقسیم کے لحاظ سے انھی کا جزء شمار ہوگا (ومن یتولھم منکم فانہ منھم)۔

اور اس میں شک نہیں کہ خدا ایسے ظالم افراد کو جو اپنے ساتھ اور اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ خیانت کریں اور دشمنوں پر بھروسہ کریں ، ہدایت نہیں کرے گا (ان اللہ لا یھدی القوم الظٰلمین)۔

بعد والی آیت میں ان بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بیمار فکر افراد غیر سے اپنے غیر شرعی روابط کے لیے پیش کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے : جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ اصرار کرتے ہیں کہ انھیں اپنے لیے سہارا سمجھیں اور انھیں اپنا ہم پیمان بنائیں اور ان کا عذر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ قدرت طاقت ان کے ہاتھ میں آجائے اور پھر ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں (فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشٰی ان تصیبنا دائرۃ)۔[1]

---

[1] "دائرۃ" کا مادہ "دور" ہے اس کا معنی ہے ایسی چیز جو گردش میں ہو اور چونکہ تاریخ میں حکومت و سلطنت ہمیشہ گردش میں رہی ہے، اس لیے اسے دائرۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح مختلف حوادث زندگی میں جو افراد کے گرد رہتے ہیں انھیں "دائرۃ" کہا جاتا ہے۔



قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: جیسے انھیں اس بات کا احتمال ہے کہ کسی دن طاقت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ آجائے گی اسی طرح انھیں یہ خیال بھی آنا چاہیے کہ آخر کار ہو سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو کامیاب کرے اور قدرت وطاقت ان کے ہاتھ آجائے اور یہ منافق اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں (فعسی اللّٰہ ان یأتی بالفتح او امر من عندہ فیصبحوا علی ما اسروا فی انفسھم نادمین)۔

اس آیت میں درحقیقت انھیں دو طرح سے جواب دیا گیا ہے: پہلا یہ کہ ایسے خیالات بیمار دلوں سے اٹھتے ہیں اور ان لوگوں کے دلوں سے کہ جن کا ایمان متزلزل ہے اور وہ خدا کے بارے میں بدگمانی رکھتے ہیں ورنہ کوئی صاحب ایمان ایسے خیالات کو اپنے دل میں راہ نہیں دیتا اور دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ ان کی کامیابی کا احتمال ہو بھی تو کیا مسلمانوں کی کامیابی کا احتمال نہیں ہے؟

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی بنا پر "عسٰی" کا مفہوم ہے "احتمال" اور "امید" اس سے اس لفظ کا ہر جگہ استعمال ہونے والا اصلی معنی برقرار رہتا ہے۔ لیکن عام طور پر مفسرین نے یہاں خدا کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ایک قطعی وعدہ مراد لیا ہے جو کہ لفظ "عسٰی" کے ظاہری مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔

لفظ "فتح" کے بعد "او امر من عندہ" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ ممکن ہے مسلمان آئندہ زمانے میں اپنے دشمنوں پر جنگ اور اس میں کامیابی کی وجہ سے غالب آجائیں یا جنگ کے بغیر ان میں اتنی قدرت پیدا ہو جائے کہ دشمن جنگ کیے بغیر گھٹنے ٹیک دے دوسرے لفظوں میں لفظ "فتح" مسلمانوں کی فوجی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے اور "امر من عندہ" اجتماعی، اقتصادی اور دیگر کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا یہ احتمال بیان کر رہا ہے اور وہ آئندہ کی وضع وکیفیت سے آگاہ ہے لہٰذا یہ آیت مسلمانوں کی فوجی، اجتماعی اور اقتصادی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہی سمجھی جائے گی۔

آخری آیت میں منافقین کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب سچے مسلمانوں کو فتح وکامرانی نصیب ہو جائے اور منافقین کا معاملہ الم نشرح ہو جائے تو "مومنین تعجب سے کہیں گے کہ کیا یہ منافق لوگ وہی نہیں ہیں کہ دعویٰ کرتے تھے اور قسمیں کھاتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں اب ان کا یہ انجام کیوں ہوا ہے" (و یقول الذین اٰمنوا اھٰؤلاء الذین اقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم انھم لمعکم)[1] اور اسی نفاق کی وجہ سے ان کے تمام اعمال باطل اور نابود ہو گئے کیونکہ ان کا سرچشمہ پاک اور خالص نیک نہ تھی اور "اسی بنا پر وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خسارے میں ہیں" (حبطت اعمالھم فاصبحوا خاسرین)۔

دراصل آخری جملہ سوال مقدر کے جواب کی طرح ہے گویا کوئی پوچھتا ہے کہ ان کا انجام کار کیا ہوگا تو ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ان کے اعمال بالکل برباد ہو گئے ہیں اور انھیں خسارا اٹھانا پڑا ہے۔ یعنی اگر انھوں نے نیک اعمال خلوص سے

---

[1] مندرجہ بالا آیت میں "ھٰؤلاء" مبتدا ہے اور "الذین اقسموا باللّٰہ" اسکی خبر ہے اور "جھد ایمانھم" "مفعول مطلق" ہے۔



بھی انجام دیئے ہوں لیکن آخرکار انھوں نے چونکہ نفاق اور شرک اختیار کیا ہے لہٰذا ان کے اعمال برباد ہوگئے ہیں جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد دوم (صہ ۲۶ اردو ترجمہ) سورہ بقرہ آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے۔

غیروں پہ تکیہ

شانِ نزول میں تو عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کی گفتگو آئی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ آیات صرف دو تاریخی شخصیتوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے حوالے ہی سے نہیں دیکھی جا سکتیں بلکہ وہ دونوں دو معاشرتی مکاتبِ فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ایک مکتب کہتا ہے کہ دشمن سے الگ رہنا چاہیے اور اپنی مہار اس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے اور اس کی امداد پر اطمینان نہیں کرنا چاہیے۔ جبکہ دوسرا مکتبِ فکر کہتا ہے کہ اس ہنگامہ خیز دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کو ایک سہارے کی ضرورت ہے بعض اوقات مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ غیروں میں سے کسی کو سہارا بنا لیا جائے اور غیروں کی دوستی بھی قدر و قیمت کی حامل ہے اور ایک دن وہ ثمر بخش ثابت ہوگی۔

قرآن دوسرے مکتب کی شدت سے نفی کرتا ہے اور مسلمانوں کو اس طرزِ فکر سے تاکیداً ڈراتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مسلمان یہ عظیم خدائی حکم بھلا چکے ہیں اور غیروں میں سے بعض پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ یہی چیز ہے۔

اُندلس اس کی زندہ نشانی ہے۔ کل کے اندلس اور آج کے اسپانیہ میں مسلمانوں نے کیسے اپنی قوت و طاقت کے بل پر ایک درخشاں تمدن کی بنیاد رکھی اور پھر غیروں پر بھروسہ کر کے کیسے اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس کی دوسری دلیل عظیم عثمانی بادشاہت ہے جو تھوڑی ہی مدت میں گرمیوں میں پگھل جانے والی برف کی طرح بہہ گئی۔

دورِ حاضر میں اس مکتب سے منحرف ہونے سے مسلمانوں نے جو کاری ضربیں کھائی ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں لیکن تعجب ہے کہ ہم اب بھی کیوں بیدار نہیں ہوتے۔

غیر بہرحال غیر ہی ہے۔ مشترک مفادات کی خاطر اگر کوئی غیر چند قدم ہمارے ساتھ چلے بھی تو آخرکار حساس لمحات میں نہ صرف یہ کہ وہ ساتھ چھوڑ دے گا بلکہ ہم پر کاری ضربیں بھی لگائے گا۔ چاہیے یہ کہ آج کا مسلمان اس قرآنی صدا پر سب سے زیادہ کان دھرے اور اپنی طاقت کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہ کرے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جنگِ اُحد کے موقع پر جب بہت سے یہودی مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے آپ سے آملے تو آپ نے دورانِ راہ ہی انھیں واپس کر دیا اور ان کی مدد قبول نہ فرمائی۔ حالانکہ یہ تعداد جنگِ اُحد میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکتی تھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ جنگ کے حساس لمحات میں دشمن سے مل جاتے اور بچے کھچے لشکرِ اسلام کو بھی ختم کر دیتے۔



۵۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۵۴۔ اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا (وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا) خدا آئندہ ایک ایسا گروہ لے آئے گا جسے وہ دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ (بھی) اسے دوست رکھتے ہیں۔ جو مومنین کے سامنے متواضع اور کفار کے مقابلے میں طاقت ور ہیں وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور سرزنش کرنے والوں کی سرزنش سے نہیں ڈرتے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے، وہ جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) عطا کرتا ہے اور (خدا کا فضل) وسیع ہے، اور خدا جاننے والا ہے۔

تفسیر

منافقین کے بارے میں بحث کے بعد مرتدین کے سلسلے میں گفتگو ہے کہ جو قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اس دین سے خارج ہو جائیں گے۔ لیکن خدا، اس کے دین نیز مسلمانوں اور اسلامی معاشرے کی تیز رفتار پیش رفت کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ کیونکہ خدا آئندہ اس دین کی حمایت کے لیے ایک اور گروہ کو مبعوث کرے گا (یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم)۔

اس کے بعد ان لوگوں کی جو یہ عظیم کار رسالت انجام دیں گے، یہ صفات بیان فرمائی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ وہ خدا کے عاشق ہوں گے اور اس کی خوشنودی کے سوا انھیں کوئی فکر دامن گیر نہ ہو گی "خدا انھیں پسند کرتا ہے اور وہ خدا سے محبت کرتے ہیں" (یحبھم و یحبونہ)

دوسری اور تیسری صفت ان لوگوں کی یہ ہے کہ وہ مومنین کے لیے منکسر المزاج اور مہربان ہیں جبکہ دشمنوں اور ستم گروں کے مقابلے میں مضبوط، سخت اور طاقت ور ہیں (اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین)۔

چوتھی صفت ان کی یہ ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرنا ان کے مسلسل پروگرام میں شامل ہے (یجاھدون فی سبیل اللہ)۔



پانچویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ فرمانِ الٰہی کی انجام دہی اور دفاعِ حق کی راہ میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈرتے (ولا یخافون لومۃ لائم)۔

درحقیقت وہ جسمانی طاقت کے علاوہ ایسا عزم رکھتے ہیں کہ غلط رسومات کو توڑنے اور انحراف کرنے والی اکثریت کو خاطر میں نہیں لاتے کثرت کے زعم میں دوسروں کا مذاق اڑانے والوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

ہم ایسے بہت سے افراد کو جانتے ہیں کہ جو ممتاز صفات کے حامل ہیں لیکن معاشرے کی خلاف، عوام کے افکار و نظریات اور منحرف اکثریت کے سامنے بہت محتاط ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت جلد میدان سے ہٹ جاتے ہیں حالانکہ ایک مصلح اور رہبر اور اس کے افکار کی تبلیغ و ترویج کے لیے میدان میں اترنے والوں کے لیے ہر چیز سے پہلے شہامت و جراءت کی ضرورت ہے۔ عوام اور ماحول سے ڈر جانے سے اصلاح نہیں ہو سکتی اور ان سے خوفزدہ ہونا بلند روحانی امتیاز کے منافی ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: ان امتیازات و خصوصیات کا حصول (انسانی کوشش کے علاوہ) خدا کے فضل و کرم کا مرہونِ منت ہے وہ جسے چاہتا اور اہل پاتا ہے عطا کرتا ہے (ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشآء)۔

وہی ذات ہے جس کا دائرہ فضل و کرم بہت وسیع ہے اور جو اس کی لیاقت و اہلیت رکھتے ہیں، ان سے آگاہ ہے (واللّٰہ واسع علیم)

اس سلسلے میں کہ مندرجہ بالا آیت کن یا دورانِ اسلام کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور خدا تعالیٰ یہاں کن افراد کی خصوصیات بیان فرما رہا ہے روایاتِ اسلامی اور اقوالِ مفسرین میں اس سلسلے میں بڑی بحث کی گئی ہے۔ تاہم شیعہ سنی طرق سے وارد ہونے والی بہت سی روایات میں ہے کہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں فتح خیبر کے موقع پر یا ناکثین، قاسطین اور مارقین سے ان کی جنگ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے[1]۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لشکرِ اسلام کے بعض کمانڈر جب خیبر کو فتح نہ کر سکے تو اس کے بعد ایک رات پیغمبرِ اسلام نے مرکزِ فوج میں ان کی طرف رُخ کرکے فرمایا:

> لاعطین الرایۃ غدًا رجلا، یحب اللّٰہ ورسولہ ویحبہ اللّٰہ ورسولہ، کرارًا غیر فرار، لا یرجع حتی یفتح اللّٰہ علی یدہ۔
>
> بخدا کل عَلَم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور رسول سے محبت رکھتا ہے اور خدا اور رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں، وہ بڑھ بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کرنے والا ہے اور کبھی پشت نہیں دکھاتا اور وہ اس میدان سے اس وقت تک پلٹ کر نہیں آئے گا جب تک خدا اس کے ہاتھ سے مسلمانوں کو فتح نصیب نہیں

---

[1] یاد رہے کہ ناکثین جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں کو، قاسطین معاویہ کی فوج کو اور مارقین خوارج کو کہا جاتا ہے۔



کر دیتا ہے[1]۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ سے لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے سلمان کے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

اس سے یہ، اس کے یار و انصار اور ہم وطن لوگ مراد ہیں۔

اس طرح آپؐ نے اہلِ ایران کے اسلام لانے اور اسلام کی پیش رفت کے لیے ان کی ثمر بخش کاوشوں اور جستجو کی پیش گوئی فرمائی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا:

"لو کان الدین معلقاً بالثریا لتناولہ رجال من ابناء الفارس"

اگر دین ثریا پر جا ٹھہرتا اور آسمانوں میں جا پہنچتا تو بھی فارس کے لوگ اسے دستیاب کر لیتے[2]

ایک اور روایت میں "دین" کی جگہ "علم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

بعض اور روایات میں ہے کہ آیت حضرت مہدی علیہ السلام کے یار و انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی پوری طاقت سے ان لوگوں کے مقابلے میں قیام کریں گے جو دینِ حق و عدالت سے مرتد ہو جائیں گے اور وہ دنیا کو ایمان و عدل سے معمور کر دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ روایات جو اس آیت کی تفسیر کے بارے میں مروی ہیں باہم کوئی تضاد نہیں رکھتیں کیونکہ یہ آیت قرآن کی سیرت کے مطابق ایک کلی اور جامع مفہوم بیان کرتی ہے اور اس کے اہم مصادیق میں حضرت علی علیہ السلام، سلمان فارسی اور وہ لوگ شامل ہیں جو اس پروگرام کے مطابق چلیں گے چاہے روایات میں ان کا ذکر نہ بھی ہو۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس آیت کے بارے میں بھی قومی تعصبات کے باعث جو لوگ اہمیت نہیں رکھتے تھے اور آیت میں مذکورہ صفات میں سے کوئی بھی ان میں نہ تھی انھیں بھی آیت کا مصداق ٹھہرایا گیا اور انھیں بھی شانِ نزول کا عنوان بنا لیا گیا یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری کو بھی آیت کے مصادیق میں شمار کر لیا گیا جس نے اپنی بے مثال تاریخی حماقت سے اسلام کو ہلاکت کے گڑھے تک پہنچا دیا اور علمدارِ اسلام حضرت علی علیہ السلام کو[3]

---

[1] تفسیر برہان اور نور الثقلین میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس بارے میں کئی ایک روایات نقل کی گئی ہیں۔ اہل سنت کے علماء میں سے ثعلبی نے ان روایات کو نقل کیا ہے (کتاب احقاق الحق ج ۳، ص ۲۰۰ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

[2] مجمع البیان جلد ۳ ص ۲۰۸، نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۲۔ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ المتقین جلد ۶ ص ۶۴ میں حدیث کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"لو کان العلم منوطاً بالثریا لتناولہ رجال من ابناء الفارس"

لیکن ابن عبد البر نے استیعاب جلد ۲ ص ۵۷۰ میں یہ عبارت نقل کی ہے:

"لو کان الدین عند الثریا لنالہ سلمان ......"

[3] تفسیر طبری جلد ششم صفحہ ۱۸۴۔ لیکن بعض روایات میں صرف ابو موسیٰ کی قوم کا نام آیا ہے جو کہ اہل یمن کی طرف اشارہ ہے۔ جنھوں نے نہایت حساس موقع پر اسلام کی مدد کی اور ابو موسیٰ اس میں شامل نہیں ہے جبکہ حضرت سلمان کے بارے میں جو روایات ہیں ان کے مطابق وہ خود اور ان کی قوم اس آیت کی مصداق ہیں۔



ایک سخت تنگ موڑ پر پہنچا دیا۔

اس جلد کے آخری حصے کی اصلاح کا کام میں نے مکّہ مکرمہ میں جوار خانہ خدا میں انجام دیا جب کہ وہاں عمرہ کے پر شکوہ مراسم بھی انجام پا رہے تھے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں درد تھا اور قلم تک پکڑنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں میں نے محسوس کیا کہ وہی تعصبات جو علمی کتب میں دکھائی دیتے ہیں آج بھی شدید پیمانے پر یہاں عوام میں بلکہ ان علماء میں دکھائی دیتے ہیں اور ایسے لگتا ہے جیسے کوئی ہاتھ درمیان میں کام کر رہا ہے تاکہ مسلمان کبھی متحد نہ ہوں۔ یہاں تک کہ یہ تعصب تاریخِ اسلام سے پہلے کے ایام تک بھی جا پہنچا ہے۔ خانہ کعبہ کے نزدیک جس شاہراہ کا نام اس وقت شارع ابوسفیان ہے وہ شارع ابراہیم الخلیل جو بانی مکّہ کے نام پر ہے سے زیادہ شکوہ مند ہے۔

آج یہاں مسلمانوں کی طرف "شرک" کی نسبت دینا ایک متعصب گروہ کے لیے پانی کا گلاس پینے کے برابر ہے، اِدھر آپ نے اپنے جسم کو حرکت دی اُدھر "مشرک" "مشرک" کی صدا بلند ہونے لگی۔ گویا اسلام ان کے گھر کی باندی ہے اور وہی قرآن کے متولی ہیں اور بس۔ اور دوسروں کا اسلام و کفران کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے کہ ایک لفظ کے ساتھ جسے چاہیں مشرک اور جسے چاہیں مسلمان کہہ دیں۔

حالانکہ مندرجہ بالا آیات کے ذیل میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب اسلام کی غربت کا دور ہوگا۔ خدا تعالیٰ سلمان جیسے بزرگ عظمتِ دین کے لیے بھیجے گا اور یہ پیغمبرؐ کی دی ہوئی بشارت ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ مسئلہ توحید جسے وحدت مسلمین کی بنیاد ہونا چاہیے۔ آج مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور انھیں مشرک و کافر قرار دینے کے لیے دستاویز بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ ایک آگاہ شخص نے ان کے بعض متعصبین سے کہا تھا:

> ذرا دیکھو! ہمارا اور تمھارا معاملہ کہاں تک جا پہنچا ہے کہ اگر اسرائیل ہم پر مسلط ہو جائے تو تم میں سے کچھ لوگ خوش ہوں گے اور اگر تمھاری سرکوبی کرے تو ہم میں سے بعض لوگ خوشی منائیں گے۔ کیا یہی وہ (اسرائیل اور اس کے سرپرست) نہیں چاہتے؟

انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان کے بعض علماء سے جو میں نے متعدد بار ملاقات کی ہے اس سے یہ واضح ہوا ہے کہ اکثر بافہم اور سمجھدار حضرات اس کیفیت پر پریشان ہیں۔ ایک مرتبہ ایک مِنی عالم حدودِ شرک کے بارے میں بحث کے سلسلے میں بہت سے بزرگ مدرسین حرم کے سامنے کہنے لگے:

> اہلِ قبلہ کو شرک کی نسبت دینا بہت بڑا گناہ ہے جسے گذشتہ لوگ زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ نافہم لوگ ہر وقت لوگوں پر شرک کی تہمت لگاتے رہتے ہیں کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اس طرح اپنے اوپر کتنی بڑی ذمّہ داری لے رہے ہیں۔

۵۵۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ



یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ○

ترجمہ

۵۵۔ تمھارا سرپرست اور رہبر صرف خدا، اس کا پیغمبر اور وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں، انھوں نے نماز قائم کی ہے اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے۔

شانِ نزول

آیۂ ولایت

تفسیر مجمع البیان اور دوسری کتب میں عبداللہ ابن عباس سے منقول ہے:

ایک روز میں چاہِ زمزم کے پاس بیٹھا تھا اور لوگوں کو ارشاداتِ رسولؐ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص قریب آیا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ جب میں پیغمبر اسلامؐ سے کوئی حدیث نقل کرتا تو وہ بھی "قال رسول اللہ" کہہ کر دوسری حدیثِ رسول بیان کر دیتا۔

ابن عباس نے اس شخص کو قسم دی کہ وہ اپنا تعارف کروائے تو اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی اور پکار کر کہا اے لوگو!

جو شخص مجھے نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاری ہوں۔ ان کانوں سے میں نے خود رسول اللہؐ سے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں، رسول اللہؐ نے فرمایا:

"علی قائد البررۃ و قاتل الکفرۃ منصور من نصرہ مخذول من خذلہ"

یعنی ——— علی نیک اور پاک لوگوں کے قائد ہیں اور کفار کے قاتل ہیں جو ان کی نصرت و مدد کرے خدا اس کی مدد کرے گا اور جو شخص ان کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لے خدا بھی اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا۔

اس کے بعد ابوذر نے مزید کہا:

اے لوگو! ایک دن میں رسولؐ خدا کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک سائل مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا تو اس نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہا: خدایا! گواہ رہنا کہ میں نے تیرے رسول کی مسجد میں مدد طلب کی ہے



لیکن کسی نے مجھے جواب تک نہیں دیا۔ ایسی حالت میں جبکہ حضرت علی رکوع میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے اشارہ کیا۔ سائل قریب آیا اور انگوٹھی آپ کے ہاتھ سے اتار لی پیغمبر خدا نے جو حالتِ نماز میں تھے اس واقعہ کو دیکھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سر آسمان کی طرف بلند کیا اور اس طرح کہا:

خدایا! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی روح کو وسعت دے اور ان کے کام ان پر آسان کردے اور ان کی زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ ان کی گفتار کو سمجھ سکیں۔ نیز موسیٰ نے سوال کیا کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور یاور و مددگار قرار دے اور ان کے ذریعے ان کی قوت میں اضافہ فرما اور انھیں ان کے کاموں میں شریک کردے خداوندا! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں میرے سینہ کو کھول دے، میرے کام مجھ پر آسان کردے اور میرے خاندان میں سے علی کو میرا وزیر بنادے تاکہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط اور قوی ہوجائے۔

ابوذر کہتے ہیں:

ابھی پیغمبرؐ خدا کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور رسول اللہ سے کہا:

پڑھیے!

حضورؐ نے فرمایا:

کیا پڑھوں؟

تو جبرئیل نے کہا:

پڑھیے! انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین اٰمنوا ......

یہ شانِ نزول (جیسا کہ بیان کیا جائے گا) تفصیلات کے کچھ اختلاف کے ساتھ مختلف طرق سے نقل ہوئی ہے البتہ اصل اور بنیاد سب روایات کی ایک ہی ہے۔

تفسیر

یہ آیت لفظ "انما" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ لفظ لغتِ عرب میں حصر و انحصار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تمھارے ولی، سرپرست اور تمھارے امور میں حق تصرف رکھنے والی تین ہستیاں ہیں، خدا، اس کا رسول اور وہ جو ایمان لائے، نماز قائم کی اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں (انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ و ھم راکعون)۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ "رکوع" اس آیت میں نماز کے رکوع کے معنی میں ہے نہ کہ خضوع و خشوع کے معنی میں



کیونکہ عرفِ شریعت اور اصطلاحِ قرآن میں جب رکوع کہا جائے تو اسی مشہور معنی میں یعنی نماز کے رکوع کے معنی میں ہوگا۔ نیز آیت کی شانِ نزول اور متعدد روایات جو حضرت علیؑ کے حالتِ رکوع میں انگوٹھی عطا فرمانے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ جنھیں ہم تفصیل سے ذکر کریں گے کے علاوہ "یقیمون الصّلوٰۃ" بھی اس بات پر شاہد ہے۔ قرآن میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ جس میں یہ ہو کہ زکوٰۃ خضوع سے ادا کرو بلکہ زکوٰۃ کو خلوصِ نیّت سے اور احسان جتلائے بغیر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح اس میں بھی شک نہیں کہ لفظ "ولی" اس آیت میں دوست یا مددگار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ دوستی اور مدد کرنے کے معنی میں ولایت نماز پڑھنے والوں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرنے والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک عمومی حکم ہے جو تمام مسلمانوں پر محیط ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے دوستی رکھیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہاں تک کہ وہ بھی جن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر زکوٰۃ ادا کریں چہ جائیکہ وہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کریں انھیں بھی چاہیے کہ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہوں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "ولی" سے مراد ولایت بمعنی سرپرستی، تصرّف اور مادّی و روحانی رہبری اور قیادت ہے خصوصاً جبکہ یہ ولایت ولایتِ الٰہی اور ولایتِ پیغمبرؐ کے ہم پلّہ قرار پائی ہے اور تینوں کو ایک ہی لفظ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح سے یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حضرت علیؑ کی امامت و ولایت پر نصِ قرآنی کی حیثیت سے دلالت کرتی ہیں۔

اس موقع سے متعلق کچھ اہم بحثیں ہیں جن پر ہم علیحدہ علیحدہ تحقیق کرتے ہیں۔

احادیث، مفسّرین اور مؤرخین کی شہادت

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بہت سی اسلامی کتب اور اہلِ سنت کے منابع میں اس ضمن میں متعدد روایات موجود ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے ان میں سے بعض روایات میں حالتِ رکوع میں انگوٹھی دینے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جب کہ بعض میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ فقط اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے کا ہی مذکور ہے۔

اس روایت کو ابن عباس، عمار ابن یاسر، عبداللہ بن سلام، سلمہ بن کہیل، انس بن مالک، عتبہ بن حکیم، عبداللہ ابی، عبداللہ بن غالب، جابر بن عبداللہ انصاری اور ابوذر غفاری نے بیان کیا ہے[1]

ان مذکورہ دس افراد کے علاوہ اہلِ سنت کی کتب میں یہ روایت خود حضرت علیؑ سے بھی نقل ہوئی ہے[2]

---

[1] احقاق الحق ج ۲ ص ۳۹۹ تا ۴۱۰ سے رجوع کریں۔

[2] المراجعات ص ۱۵۵



یہ امر قابل توجہ ہے کہ کتاب غایۃ المرام میں اس بارے میں ۲۴ احادیث کتب اہل سنت سے اور ۱۹ احادیث طرق شیعہ سے نقل کی گئی ہیں۔[1]

مشہور کتب کہ جن میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے تیس سے متجاوز ہیں جو کہ سب اہل سنت کے منابع و مصادر میں سے ہیں، ان میں سے یہ بھی ہیں:

۱۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۸ از محب الدین طبری
۲۔ تفسیر فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰ از علامہ قاضی شوکانی
۳۔ جامع الاصول ج ۹ ص ۴۷۸
۴۔ اسباب النزول ص ۱۴۸ از واحدی
۵۔ لباب النقول ص ۹۰ از سیوطی
۶۔ تذکرۃ ص ۱۸ از سبط ابن جوزی
۷۔ نور الابصار ص ۱۰۵ از شبلنجی
۸۔ تفسیر طبری ص ۱۶۵
۹۔ الکافی الشاف ص ۵۶ از ابن حجر عسقلانی
۱۰۔ مفاتیح الغیب ج ۳ ص ۴۳۱ از رازی
۱۱۔ در المنثور ج ۲ ص ۳۹۳ از سیوطی
۱۲۔ کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۱
۱۳۔ مسند ابن مردویہ
۱۴۔ مسند ابن الشیخ
۱۵۔ صحیح نسائی
۱۶۔ الجمع بین الصحاح الستۃ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب میں اس ضمن میں احادیث موجود ہیں۔[2]

ان حالات میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ان تمام احادیث کی پرواہ نہ کی جائے جبکہ دیگر آیات کی شانِ نزول کے لیے ایک یا دو روایات پر قناعت کرلی جاتی ہے لیکن شاید تعصب اجازت نہیں دیتا کہ اس آیت کی شان نزول کے لیے ان سب روایات اور ان سب علماء کی گواہیوں کی طرف توجہ دی جائے۔

---

[1] منہاج البراعۃ ج ۲ ص ۳۵۰
[2] مزید تفصیل کے لیے احقاق الحق ج ۲، الغدیر ج ۲ اور المراجعات کی طرف رجوع کریں۔



اگر بنا یہ ہو کہ کسی آیت کے سلسلے میں اس قدر روایات کی بھی پرواہ نہ کی جائے تو پھر ہمیں قرآنی آیات کی تفسیر میں کسی بھی روایت کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بہت کم آیات ایسی ہیں جن کی شانِ نزول میں اسقدر روایات وارد ہوئی ہوں۔

یہ مسئلہ اس قدر واضح و آشکار تھا کہ زمانۂ پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسان بن ثابت نے حضرت علیؑ کی شان میں روایت کے مضمون کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

فانت الذی اعطیت اذ کنت راکعًا
زکاتًا فدتک النفس یاخیر راکع
فانزل فیك الله خیر و لا یة
وبینها فی محکمات الشرایع

یعنی ــــ آپ وہ ہیں کہ جنھوں نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی۔ آپ پر جان فدا ہو۔ اے بہترین رکوع کرنے والے۔
اور اس کے بعد خدا نے بہترین ولایت آپ کے بارے میں نازل کی اور قرآنِ مجید میں اسے ثبت کر دیا[1]

اعتراضات کا جواب

بعض متعصب اہلِ سنت نے اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے سے انکار کیا ہے اور اسی طرح "ولایت" کی تفسیر سرپرستی، تصرف اور امامت کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ان میں سے اہم اعتراضات پر ہم یہاں تحقیق کرتے ہیں۔

۱۔ "الّذین" جمع کا صیغہ ہے: ایک اعتراض یہ ہے کہ آیت میں "الّذین" جمع کا صیغہ ہے لہٰذا اس آیت کو ایک شخص پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کہتی ہے کہ تمھارے "ولی" وہ اشخاص ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی ادبیات میں ایسا بارہا دکھائی دیتا ہے کہ مفرد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

• آیۂ مباہلہ میں لفظ "نسائنا" جمع کی صورت میں ہے جبکہ اس سے مراد جناب فاطمہ زہراؑ ہیں جیسا کہ اس ضمن میں مروی

---

[1] حسان بن ثابت کے اشعار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت سی کتب میں نقل ہوئے ہیں۔ ان میں تفسیر روح المعانی از شہاب الدین محمود آلوسی اور کفایۃ الطالب از گنجی شافعی وغیرہ شامل ہیں۔



متعدد شانِ نزول گواہی دیتی ہیں۔

• آیۂ مباہلہ ہی میں لفظ "انفسنا" جمع کی صورت میں ہے جبکہ مباہلہ کے لیے جانے والوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علاوہ صرف حضرت علیؑ تھے۔

• جنگ اُحد کے ایک واقعہ کے سلسلے میں سورہ آلِ عمران آیہ ۱۷۲ میں ہے:

"الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا"

تیسری جلد میں اس آیہ کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مفسّرین نے اس کی شانِ نزول نقل کی ہے جس میں "الذین" سے ایک ہی شخص نعیم بن مسعود مراد لیا گیا ہے۔

• سورہ مائدہ کی آیہ ۵۲ میں ہے۔

"یقولون نخشی ان تصیبنا دائرۃ"

اس میں بھی جمع کے صیغے ہیں۔ حالانکہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ جس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

• علاوہ ازیں: ممتحنہ۔ آیہ

منافقون آیہ ۸

بقرہ آیہ ۲۱۵، ۲۷۴، وغیرہ

میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جمع کی شکل میں ہیں، لیکن ان کی شانِ نزول کے مطابق ان سے ایک ہی شخص مراد تھا۔

ایسی تعبیرات یا تو اس شخص کی حیثیت اور مقام کی اہمیت اور اس کے کام کے نقشِ مؤثر واضح کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا اس لیے کہ حکم کو کلّی صورت میں پیش کیا جائے اگرچہ اس کا مصداق ایک ہی فرد ہو۔

خدا کہ جو اکیلا ہے اس کے لیے قرآن مجید میں بہت سی آیات میں جمع کی ضمیر تعظیم کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر قرینہ کے خلاف ظاہر مفرد کے لیے جمع کا استعمال جائز نہیں ہے لیکن آیت کی شانِ نزول میں وارد ہونے والی تمام روایات ہمارے پاس واضح قرینہ کے طور پر موجود ہیں جبکہ دوسرے مواقع پر اس سے کم قرینہ پر بھی قناعت کر لی جاتی ہے۔

۲۔ حالت رکوع میں زکوٰۃ؟: فخرالدین رازی اور بعض دوسرے متعصّبین نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت علیؑ تو نماز میں مخصوص توجہ رکھتے تھے اور پروردگار سے مناجات میں مستغرق رہتے تھے یہاں تک کہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حالتِ نماز میں تیر کا پھل آپ کے پاؤں سے نکالا گیا اور آپ متوجہ نہیں ہوئے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ آپ نے سائل کی آواز سن لی اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے اس نکتہ سے غافل ہیں کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا اپنی طرف



متوجہ ہونا نہیں ہے بلکہ عین خدا کی طرف توجہ ہے۔ حضرت علیؑ حالت نماز میں اپنے آپ سے غافل تھے نہ کہ خدا سے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مخلوق خدا سے غفلت اور بیگانگی دراصل خدا سے غفلت اور بے گانگی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالتِ نماز میں زکوٰۃ دینا عبادت کے اندر عبادت ہے نہ کہ عبادت کے دوران ایک عمل مباح کی انجام دہی۔ ایک اور عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بات جو روح عبادت سے مناسبت نہیں رکھتی یہ ہے کہ کوئی شخص عبادت کے دوران مادی اور شخصی زندگی سے مربوط ہوجائے۔ لیکن ان امور کی طرف متوجہ ہونا جو رضائے الٰہی کا ذریعہ ہیں روحِ عبادت کیلیے سازگار ہیں بلکہ عبادت کے لیے بلند مرتبے کا باعث ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ خدا کی طرف توجہ اور استغراق کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بے اختیار ہوکر اپنا احساس کھو بیٹھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد و ارادہ سے اپنی توجہ الٰہی ہر چیز سے پھیر لیتا ہے جو راہ خدا میں اور خدا کے لیے نہیں ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فخرالدین رازی کا تعصب یہاں تک آپہنچا ہے کہ اس نے سائل کو حضرت علیؑ کے اشارہ کرنے کو کہ وہ خود آکر انگشتری اتار لے "فعل کثیر" قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں نماز میں درست نہیں۔ حالانکہ وہ نماز میں ایسے کام انجام دینا جائز سمجھتے ہیں جو اس اشارہ سے کئی درجہ زیادہ ہیں اور اس کے باوجود وہ نماز کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ حشرات الارض مثلاً سانپ یا بچھو کو مارنا، بچے کو اٹھانا اور بٹھانا یہاں تک کہ شیرخوار بچے کو دودھ پلانے کو تو وہ نماز میں فعل کثیر نہیں سمجھتے پھر صرف ایک اشارہ فعل کثیر کس طرح ہوگیا لیکن جب کسی کی دانش مندی طوفانِ تعصب میں پھنس جاتی ہے تو پھر ایسے تعصبات اس کے لیے باعث تعجب نہیں رہتے۔

۳۔ **لفظ "ولی" کا مفہوم:** آیت پر ایک اور اعتراض لفظ "ولی" کے معنی کے بارے کیا گیا ہے اور اس سے مراد "دوست اور مدد کرنے والا" لیا گیا ہے نہ کہ "متصرف، سرپرست اور صاحب اختیار"۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر کے بارے میں اوپر ذکر کرچکے ہیں کہ لفظ "ولی" سے یہاں دوست اور مدد کرنے والا مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ صفت تو تمام مومنین کے لیے ثابت ہے نہ کہ ان مخصوص مومنین کے لیے جو آیت کے مطابق نماز قائم کریں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیں۔ دوسرے لفظوں میں دوستی اور مدد ایک عام حکم ہے، جبکہ آیت ایک خصوصی حکم بیان کررہی ہے اسی لیے تو ایمان کا ذکر کرنے کے بعد خاص صفات بیان کی جارہی ہیں کہ جو ایک شخص کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۴۔ **حضرت علیؑ پر واجب زکوٰۃ:** کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ پر کون سی زکوٰۃ واجب تھی جبکہ وہ مالِ دنیا میں سے اپنے لیے کچھ فراہم ہی نہ کرتے تھے اور اگر اس سے مراد مستحب صدقہ ہے تو اسے زکوٰۃ نہیں کہا جاسکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اوّل تو تواریخ گواہی دیتی ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے بہت سا مال کمایا تھا اور اسے راہ خدا میں صرف کردیا تھا۔ یہاں تک کہ مرقوم ہے کہ آپ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے آزاد کرایا۔ علاوہ ازیں آپ کو مختلف جنگوں کے



مال غنیمت میں سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ لہٰذا کچھ ایسا مال یا کوئی چھوٹا سا کھجوروں کا باغ جس کی زکوٰۃ ادا کرنا آپ پر واجب ہو اس وقت ہونا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فوراً ادا کرنے کے وجوب کی فوریت "عرفی فوریت" ہے جو نماز پڑھتے ہوئے ادا کرنے کے منافی نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مستحب زکوٰۃ کو قرآن مجید میں بہت مرتبہ زکوٰۃ کہا گیا ہے بہت سی مکی سورتوں میں یہ لفظ زکوٰۃ آیا ہے جس سے مراد مستحب زکوٰۃ ہی ہے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ واجب زکوٰۃ کا حکم پیغمبر اسلام کی ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوا (نمل۔ ۳، روم۔ ۳۹، لقمان۔ ۴، فصلت۔ ۷ وغیرہ)۔

۵۔ آیت میں "ولایت بالفعل" کا ذکر ہے: اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر ہم حضرت علیؑ کی خلافتِ بلا فصل پر ایمان بھی لے آئیں تب بھی یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ اس کا تعلق زمانہ پیغمبرؐ کے بعد سے ہے لہٰذا حضرت علیؑ نزول آیت کے وقت ولی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت ان کے لیے "ولایت بالقوۃ" تھی "ولایت بالفعل" نہ تھی جبکہ آیت ظاہراً "ولایت بالفعل" کا ذکر کر رہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ روزمرہ کی گفتگو میں ایسی ادبی تعبیرات بہت دکھائی دیتی ہیں۔ لوگوں کے لیے ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جو وہ "بالقوۃ" ہیں مثلاً انسان اپنی زندگی میں وصیت کرتا ہے اور کسی شخص کو اپنے بچوں کے لیے وصی اور قیم معین کرتا ہے اور اسی وقت سے "وصی" اور "قیم" کے الفاظ اس شخص کے لیے بولے جانے لگتے ہیں جبکہ وصیت کرنے والا ابھی زندہ ہوتا ہے۔ شیعہ سنی طرق سے پیغمبر اکرمؐ سے جو روایات حضرت علیؑ کے بارے میں مروی ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے انہیں "میرے وصی" اور "میرے خلیفہ" کہہ کر خطاب کیا جبکہ ایسا زمانہ پیغمبرؐ میں نہ تھا۔

قرآن مجید میں بھی ایسی تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے خدا سے یہ درخواست کی:

"هب لی من لدنك و لیا یرثنی و یرث من اٰل یعقوب" (مریم۔ ۶)

حالانکہ مسلّم ہے کہ "ولی" سے یہاں مراد "سرپرست" ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوگا۔

بہت سے لوگ اپنے جانشین اپنی زندگی میں معین کرتے ہیں اور اسی وقت سے اسے جانشین کہنے لگتے ہیں حالانکہ وہ "بالقوۃ" ہی ہوتے ہیں "بالفعل" نہیں۔

۶۔ حضرت علیؑ نے اس آیت سے خود استدلال کیوں نہیں کیا؟: کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اس واضح دلیل سے خود استدلال کیوں نہیں کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ آیت کی شانِ نزول کے بارے میں وارد شدہ روایات کی بحث کے ضمن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہ حدیث متعدد کتب میں خود حضرت علیؑ سے بھی نقل ہوئی ہے جیسا کہ مسند ابن مردویہ، مسند ابی الشیخ اور کنز العمال میں ہے یہ بات درحقیقت اس آیت سے آپ کا استدلال ہی ہے۔

کتاب نفیس "الغدیر" میں کتاب سلیم بن قیس ہلالی سے ایک مفصل حدیث نقل کی گئی ہے جس کے مطابق حضرت علیؑ نے

میدانِ صفین میں کچھ لوگوں کی موجودگی میں اپنی حقانیت پر دلائل پیش کیے ان میں سے ایک استدلال اسی آیت سے تھا[1]

غایۃ المرام میں ابوذر سے منقول ہے:

حضرت علیؑ نے شوریٰ کے دن بھی اس آیت سے استدلال کیا تھا[2]

۷۔ **قبل اور بعد کی آیات سے آیۂ ولایت کا ربط:** یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبل اور بعد کی آیات سے ولایت و امامت والی تفسیر مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ان میں ولایت دوستی کے معنی میں آئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآنی آیات چونکہ تدریجاً اور مختلف واقعات میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کا تعلق ان حوادث اور واقعات سے ہے جن کے سلسلے میں وہ نازل ہوئی ہیں نہ یہ کہ ایک سورت کی آیات یا یکے بعد دیگرے آنے والی آیات ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں یا مفہوم و معنی کے اعتبار سے ہمیشہ نزدیکی تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آیات ایک دوسرے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا تعلق دو مختلف واقعات سے ہے۔ مختلف واقعات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دونوں معانی و مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں۔

جیسا کہ شانِ نزول شاہد ہے آیت "انما ولیکم اللہ" حضرت علی علیہ السلام کے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس سے قبل اور بعد کی آیات جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں اور پڑھیں گے دوسرے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کے ایک دوسرے سے تعلق کی بات کا زیادہ سہارا نہیں لیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں اتفاق کی بات ہے کہ زیرِ بحث آیت گذشتہ اور پیوستہ آیات سے مناسبت بھی رکھتی ہے کیونکہ دوسری آیات میں ولایت بمعنی دوستی اور مدد کی گفتگو ہے جبکہ زیرِ بحث آیت میں ولایت رہبری اور سرپرستی کے مفہوم میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ولی، سرپرست اور متصرف اپنے پیروکاروں کا دوست اور یار و مددگار بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دوست اور مددگار ہونا ولایت مطلقہ کے کوائف اور اوصاف میں سے ہے۔

۸۔ **ایسی قیمتی انگشتری کہاں سے آئی تھی؟:** کہا جاتا ہے کہ ایسی گراں قیمت انگوٹھی جو تاریخ نے بیان کی ہے حضرت علیؑ کہاں سے لائے تھے؟ علاوہ ازیں ایسی غیر معمولی قیمت کی انگوٹھی پہننا اسراف بھی ہے تو کیا یہ بات اس کی دلیل نہیں کہ مذکورہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت کے بارے میں جو مبالغے کیے گئے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور اس کے بہت قیمتی ہونے کی ہمارے پاس کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں ہے۔ یہ جو ایک ضعیف روایت[3] میں اس کی قیمت خراجِ شام کے

---

۱ الغدیر جلد ۱ ص ۱۹۶

۲ منقول از منہاج البراعۃ جلد ۲ ص ۳۶۳

۳ یہ ضعیف روایت بطور مرسل تفسیر برہان ج ۱ ص ۴۸۵ پر مذکور ہے۔



برابر بیان کی گئی ہے۔ حقیقت سے زیادہ ایک افسانے سے مشابہت رکھتی ہے اور شاید اس اہم واقعے کی اہمیت ختم کرنے کے لیے اسے گھڑا گیا ہے۔ صحیح اور معتبر روایات جو آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں ایسے کسی افسانے کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا ایسی باتوں سے ایک تاریخی واقعے اور حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

۵۶۔ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ ع

ترجمہ

۵۶۔ اور جو لوگ اللہ، اس کے پیغمبر اور صاحبانِ ایمان کی ولایت قبول کرلیں (وہ کامیاب ہیں کیونکہ) خدا کی حزب اور پارٹی ہی کامیاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت گذشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کے ہدف کی تاکید وتعقیب کرتی ہے اور مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ جنہوں نے خدا، اس کے رسولؐ اور ان صاحبانِ ایمان کی ولایت، سرپرستی اور رہبری کو قبول کرلیا ہے کہ جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا جا چکا ہے وہ کامیاب ہوں گے کیونکہ وہ حزبِ خدا میں داخل ہو جائیں گے اور حزبِ خدا کامیاب وکامران ہے (ومن یتول اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون)۔

اس آیت میں " ولایت " کے اس معنی پر ایک اور قرینہ موجود ہے جس کا ذکر گذشتہ آیت کے ذیل میں کیا گیا ہے یعنی "ولایت" بمعنی "سرپرستی، تصرف اور رہبری" کیونکہ "حزب اللہ" اور اس کا غلبہ حکومت اسلامی سے مربوط ہے نہ کہ ایک عام اور معمول کی دوستی سے اور یہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ آیت میں " ولایت " سرپرستی، حکومت نیز اسلام اور مسلمانوں کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے معنی میں ہے کیونکہ " حزب " کے مفہوم میں ایک طرح کی تشکیل، وابستگی اور مشترک اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک اجتماع کا تصور پوشیدہ ہے۔

توجہ رہے کہ " الذین اٰمنوا " سے اس آیت میں تمام صاحبِ ایمان مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہی شخص ہے جس کی طرف معیّن اوصاف کے ساتھ گذشتہ آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آیت میں حزب اللہ کی کامیابی سے مراد صرف معنوی کامیابی ہے یا اس میں ہر طرح کی معنوی ومادی کامیابی شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا اطلاق حزب اللہ کی عام محاذوں پر مطلق کامیابی کی دلیل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی جمعیت حزب اللہ میں شامل ہو یعنی ایمان محکم، تقویٰ، عمل صالح، اتحاد، کامل باہمی اعتماد، آگاہی اور علم رکھتا ہو



اور کافی تیاری کیے ہوئے ہو تو بلا تردید وہ تمام معاملات میں کامیاب ہوگا۔ آج اگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی کامیابی میسر نہیں ہے تو اس کا سبب واضح ہے کیونکہ حزب اللہ کی مذکورہ شرائط میں سے زیادہ تر آج مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو توانائیاں اور صلاحیتیں دشمن کو شکست دینے کے لیے استعمال ہونا چاہییں، زیادہ تر ایک دوسرے کو کمزور کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔

سورہ مجادلہ آیہ ۲۲ میں بھی حزب اللہ کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں جس کی تعبیر انشاءاللہ متعلقہ مقام پر آئے گی۔

۵۷۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

۵۸۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۷۔ اے ایمان والو! اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے ان لوگوں کو اپنا دوست اور سہارا نہ سمجھو جو تمھارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں اور اگر ایمان دار ہو تو خدا سے ڈرو۔

۵۸۔ جب (تم اذان کہتے ہو اور لوگوں کو) نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل تماشہ سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا گروہ ہیں جو عقل و ادراک نہیں رکھتے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر فخرالدین رازی میں منقول ہے:

رفاعہ اور سوید مشرکین میں سے تھے۔ انھوں نے اظہارِ اسلام کیا اور پھر وہ منافقین کے ہم کارول میں داخل ہو گئے۔ بعض مسلمان ان دونوں سے میل جول رکھتے تھے اور اظہارِ دوستی کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں اس راہ و رسم کے خطرے سے آگاہ کیا گیا تاکہ وہ اس عمل سے پرہیز کریں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں ولایت بمعنی دوستی ہے نہ کہ ولایت بمعنی سرپرستی و تصرف جو کہ گزشتہ آیات



میں تھی، کیونکہ اس آیت کی شانِ نزول ان آیات سے مختلف ہے۔ لہٰذا انھیں ایک دوسرے کے لیے قرینہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

دوسری آیت جو پہلی کا ضمیمہ ہے، اس کی شانِ نزول یہ منقول ہے:

یہودیوں کا ایک گروہ اور کچھ عیسائی جب مؤذن کی اذان کی آواز سنتے اور نماز کے لیے مسلمانوں کا قیام دیکھتے تو تمسخر اور استہزاء شروع کر دیتے۔ لہٰذا قرآن مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے پرہیز کا حکم دیتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خداوند عالم دوبارہ مومنین کو حکم دے رہا ہے کہ منافقوں اور دشمنوں کی دوستی سے بچو، البتہ انکے جذبات و میلانات کو متحرک کرنے کے لیے یوں فرماتا ہے: اے ایمان والو! جو لوگ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین و منافقین میں سے ان میں سے کسی کو بھی دوست نہ بناؤ (یآیھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوًا و لعبًا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و الکفار اولیاء)۔

آیت کے آخر میں "واتقوا اللّٰہ ان کنتم مؤمنین" فرما کر تاکید کی گئی ہے کہ تقویٰ اور ایمان سے ایسے لوگوں کی دوستی مناسبت نہیں رکھتی۔

توجہ رہے کہ "ھزو" (بروزن "قفل") کا معنی ہے "تمسخر آمیز باتیں یا حرکات جو کسی چیز کو بے وقعت ظاہر کرنے کے لیے کی جائیں" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے استہزاء ایسے مذاق کو کہتے ہیں جو کسی کی عدم موجودگی میں اور پس پشت کیا جائے اگرچہ کبھی کبھار کسی کے سامنے اس کا تمسخر اڑانے پر بھی یہ لفظ شاذونادر بولا جاتا ہے۔

"لعب" عام طور پر ایسے کاموں کو کہا جاتا ہے جن کے انجام دینے میں کوئی صحیح غرض کارفرما نہ ہو یا جو بالکل بغیر ہدف اور مقصد کے انجام پائیں۔ بچوں کے کھیل کود کو بھی "لعب" اسی بنا پر کہتے ہیں۔

گذشتہ آیت میں منافقین اور اہل کتاب کی ایک جماعت سے دوستی کرنے سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ احکام اسلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اگلی آیت میں شاہد کے طور پر ان کے ایک عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ: جب تم مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں (و اذا نادیتم الی الصلوٰۃ اتخذوھا ھزوًا و لعبًا)[1]

---

[1] مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ "اتخذوھا" کی ضمیر نماز کی طرف لوٹتی ہے یا اذان کی طرف۔ جو شانِ نزول اس سلسلے میں ذکر کی گئی ہیں ان میں بھی یہ دونوں احتمالات موجود ہیں، کیونکہ منافقین اور کفار اذان کی روح پرور ندا کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور نماز کا بھی۔ لیکن آیت کا ظہور زیادہ تر اس احتمال کی تائید کرتا ہے کہ یہ ضمیر "صلوٰۃ" کی طرف لوٹتی ہے۔



اس کے بعد ان کے عمل کی علت بیان کی گئی ہے: ایسا اس لیے ہے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے اور حقائق کا ادراک کرنے کی منزل سے دور ہے (ذٰلک بانھم قوم لا یعقلون)۔

اذان اسلام کا عظیم شعار ہے

ہر دور میں ہر ملت کا کوئی ایسا شعار ہوتا ہے جو وہ اپنے لوگوں کے احساسات و جذبات کو ابھار کر انھیں ذمہ داریوں کی طرف دعوت دینے کے لیے استعمال کرتی ہے اور یہ بات دورِ حاضر میں زیادہ وسعت سے دکھائی دیتی ہے۔

گذشتہ اور موجودہ زمانے میں عیسائی ناقوس کی ناموزوں آواز کے ذریعے اپنے پیروکاروں کو کلیسا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اسلام میں اس دعوت کے لیے اذان کو اپنایا گیا ہے جو صدائے ناقوس سے کئی درجے مؤثر اور دلآویز ہے۔ اس اسلامی شعار کی جاذبیت اور کشش اتنی زیادہ ہے کہ صاحب "المنار" کے بقول جب متعصب عیسائی بھی اسے سنتے ہیں تو سننے والوں پر اس کی گہری تاثیر کا اعتراف کرتے ہیں اس کے بعد موصوف نے نقل کیا ہے کہ مصر کے ایک شہر میں کچھ عیسائیوں کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کی اذان کے وقت اس سرودِ آسمانی کو سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔

اس سے بہتر شعار کون سا ہو گا۔ جس کی ابتداء خدائے بزرگ و برتر کے نام سے ہوتی ہے، جو خالقِ عالم کی وحدانیت اور اس کے پیغمبر کی رسالت کے اعلان کے ساتھ بلند ہوتا ہے اور کامیابی، فلاح، نیک عمل اور یادِ خدا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ شعار اللہ کے نام سے شروع ہوتا اور اللہ ہی کے نام پر تمام ہوتا ہے۔ اس میں موزوں جملے، مختصر عبارات، واضح محتویات اور اصلاح کنندہ اور آگہی عطا کرنے والا مضمون ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں اذان کہنے کے لیے بہت تاکید کی گئی ہے اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک مشہور حدیث منقول ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا:

روزِ قیامت اذان کہنے والے دوسروں سے سر اور گردن کی مقدار کے برابر بلند تر ہوں گے۔

یہ بلندی درحقیقت وہی مقامِ رہبری ہے اور دوسروں کو خدا کی طرف اور نماز جیسی عبادت کی طرف دعوت دینے کے سبب سے ہے۔

اسلامی شہروں میں وقتِ نماز جب اذان کے نغمے گلدستہ اذان سے گونجتے ہیں تو ان کی آواز سچے مسلمانوں کیلیے پیامِ آزادی اور استقلال و عظمت کی حیات بخش نسیم کی مانند ہوتی ہے۔ یہ آواز بدخواہوں کے تن بدن میں رعشہ اور اضطراب ڈال دیتی ہے۔ یہ صدا بقائے اسلام کی ایک رمز ہے انگلستان کے ایک مشہور شخص کا ایک اعتراف اس پر گواہ ہے۔ وہ عیسائیوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام گلدستہ ہائے اذان سے بلند ہو رہا ہے، خانہ کعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور قرآن مسلمانوں کا رہنما اور پیشوا ہے۔ اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ اسلامی سرزمینوں پر ہماری سیاست کی



بنیادیں استوار ہو سکیں[1]

لیکن بعض بے چارے اور بے نوا مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس عظیم اسلامی شعار کو ترک کرکے اس کی جگہ فضول سے پروگرام رکھ دیئے ہیں جبکہ یہ اسلامی شعار ان کے دین اور ثقافت کے قیام کی صدیوں پر حاوی تاریخ کی سند ہے۔ خدا ایسے افراد کی ہدایت کرے اور انھیں مسلمانوں کی صفوں میں پلٹا دے۔

واضح ہے کہ جیسے اذان کا باطن اور اس کے مفاہیم خوبصورت ہیں اسی طرح اسے ادا بھی اچھی آواز میں کرنا چاہیے اور اس کے باطنی حسن کو نامرغوب طریقے سے ظاہر کرکے پامال نہیں کر دینا چاہیے۔

اذان وحی کے ذریعے پہنچی

اہل سنت کے طرق سے منقول کئی ایک روایات میں اذان کی تشریع کے بارے میں عجیب و غریب باتیں منقول ہیں جو منطق اسلام سے بالکل مطابقت نہیں رکھتیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

> پیغمبر خدا (ص) سے اصحاب نے درخواست کی کہ وقتِ نماز بتانے کے لیے کوئی نشانی ہونا چاہیے۔ اس پر آپ (ص) نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ ہر ایک نے کوئی نہ کوئی تجویز پیش کی۔ کسی نے کہا مخصوص علَم لہرانا چاہیے، کسی نے کہا آگ روشن کرنا چاہیے اور کسی نے کہا ناقوس بجانا چاہیے۔ لیکن رسول اللہؐ نے ان میں سے کوئی بات قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن زید اور عمر بن خطاب نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انھیں حکم دے رہا ہے کہ نماز کا وقت بتانے کے لیے اذان کہیں اور اس نے ان دونوں کو اذان سکھائی اور رسول اللہؐ نے اسے قبول کر لیا۔[2]

یہ جعلی روایت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین معلوم ہوتی ہے کہ جس کے مطابق آپ وحی پر انحصار کرنے کی بجائے کچھ افراد کے خوابوں کا سہارا لیتے تھے اور کچھ لوگوں کے خوابوں کی بنیاد پر اپنے دین کے احکام پیش کرتے تھے۔

درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ روایاتِ اہلِ بیتؑ میں ہے کہ اذان پیغمبر اسلام کو وحی کے ذریعے تعلیم دی گئی تھی امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب جبرئیل اذان لے کر آئے تو پیغمبر خداؐ کا سر حضرت علیؑ کی گود میں تھا اور جبرئیل نے آپ کو اذان و اقامت بتائیں۔ جب رسول اللہؐ نے اپنا سر اٹھایا تو حضرت علیؑ سے پوچھا:

کیا تم نے جبرئیل کی اذان کی آواز سنی ہے۔

حضرت علیؑ نے کہا:

---

[1] یہ الفاظ گلاڈسٹون کے ہیں جو اپنے زمانے میں انگریزوں کا پہلے درجے کا سیاستدان تھا۔

[2] تفسیر قرطبی



جی ہاں

رسول اللہؐ نے پھر پوچھا:

کیا اسے یاد کر لیا ہے؟

حضرت علیؑ نے کہا:

جی ہاں

پیغمبر خداؐ نے فرمایا:

بلال (جن کی آواز اچھی تھی) کو بلاؤ اور اسے اذان و اقامت سکھا دو۔

حضرت علیؑ نے بلال کو بلا کر اسے اذان سکھا دی[1]

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "النص والاجتہاد" ص ۱۲۸ کی طرف رجوع کریں۔

۵۹۔ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ○

۶۰۔ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ○

ترجمہ

۵۹۔ کہہ دو: اے اہل کتاب! کیا تم ہم پر اعتراض کرتے ہو (مگر ہم نے کیا کیا ہے) سوائے اس کے کہ ہم خدائے یکتا پر، جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر اور جو کچھ اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس پر ایمان لائے ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ تم میں سے اکثر راہ حق سے منحرف ہو گئے ہیں (لہٰذا حق تمھیں اچھا نہیں لگتا)۔

۶۰۔ کہہ دو: کیا میں تمھیں ایسے لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا ٹھکانا اور جزا اس سے بدتر ہے وہ لوگ کہ جنھیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان پر اپنا غضب نازل کیا ہے (اور انھیں مسخ کر دیا ہے) اور ان میں سے بندر اور خنزیر بنائے اور جنھوں نے بت پرستی کی ہے ان کا ٹھکانا برا ہے اور وہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

---

[1] وسائل، ج ۴ ص ۶۱۲

شانِ نزول

عبداللہ بن عباس سے منقول ہے :

کچھ یہودی رسول اللہ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ اپنے عقائد انھیں بتائیں ۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: میں خدائے بزرگ و یگانہ پر ایمان رکھتا ہوں اور جو کچھ ابراہیم ، اسماعیل اسحاق ، یعقوب، موسیٰ ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبران خدا پر نازل ہوا ہے اسے حق سمجھتا ہوں اور ان میں تفریق نہیں کرتا۔

وہ کہنے لگے : ہم عیسیٰ کو نہیں مانتے اور اس کی نبوت کو قبول نہیں کرتے۔

انھوں نے مزید کہا: ہم کسی دین کو تمھارے دین سے بدتر نہیں سمجھتے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا۔

تفسیر

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے پوچھیے اور کہیے کہ ہم سے کون سا کام سرزد ہوا ہے کہ تم ہم میں عیب نکالتے ہو اور ہم پر تنقید کرتے ہو، سوائے اس کے کہ ہم خدائے یگانہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر اور گذشتہ انبیاء پر نازل ہوا ہے اس کے سامنے ہم سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (قل یا اهل الکتاب هل تنقمون منا الا ان اٰمنا باللّٰه وما انزل الینا وما انزل من قبل)[1]

یہ آیت یہودیوں کی بے محل ضد، ہٹ دھرمی اور تعصبات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ لوگ اپنے اور اپنے تحریف شدہ دین کے خلاف کسی کی کچھ و قعت کے قائل نہیں تھے اور اسی شدید تعصب کی بنا پر حق ان کی نظر میں باطل اور باطل ان کی نگاہ میں حق بن چکا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جو درحقیقت پہلے جملے کی علت اور سبب ہے۔ اس میں کہا گیا ہے ، اگر تم توحیدِ خالص اور تمام آسمانی کُتب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر ہم پر اعتراض کرتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فسق اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں اور اگر کچھ لوگ پاکیزگی اور حق کا راستہ اپناتے ہیں تو یہ تمھاری نظر میں عیب ہے (و ان اکثرکم فاسقون)۔

فسق و گناہ سے آلودہ انسانوں کی کثرت سے تشکیل پانے والے آلودہ ماحول میں اصولی طور پر حق و باطل کا معیار اسقدر دگرگوں ہو جاتا ہے کہ اس میں پاکیزہ عقیدہ اور صالح عمل کو برا سمجھا جانے لگتا ہے اور اسے ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور غلط

---

[1] "تنقمون" مادہ "نقمت" سے ہے۔ یہ دراصل کسی چیز کا انکار کرنے کے معنی میں ہے چاہے وہ انکار زبان سے ہو یا عمل سے اور سزا دینے کے ذریعے سے ہو۔



عقائد و اعمال کو اچھا سمجھا جاتا ہے اور انہیں بنظرِ تحسین دیکھا جاتا ہے۔ یہ مسخ شدہ فکر کی خاصیت ہے۔ جب کوئی گناہ میں ڈوب جاتا ہے اور اس کا عادی ہو جاتا ہے تو اُس کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔

توجہ رہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آیت تمام اہل کتاب پر تنقید نہیں کر رہی بلکہ صالح اور نیک اقلیت کا حساب لفظ "اکثر" استعمال کر کے الگ کر دیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں اہل کتاب کے تحریف شدہ عقائد، غلط اعمال اور جو سزائیں انہیں دامن گیر ہوئیں ان کا موازنہ سچے مومنین اور مسلمین کی حالت و کیفیت سے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں گروہوں میں سے کون سا تنقید اور سرزنش کا مستحق ہے۔ یہ دراصل متعصب اور ہٹ دھرم افراد کو متوجہ کرنے کے لیے ایک منطقی جواب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے! اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دو کیا خدائے یکتا اور آسمانی کُتب پر ایمان لانا باعث سرزنش اور وجہِ اعتراض ہے یا پھر خود ان کے بُرے اعمال جن کے سبب وہ خدائی سزاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ انہیں کہہ دو: کیا میں تمھیں ان لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا معاملہ بارگاہِ الٰہی میں اس سے بدتر ہے (قل هل انبئكم بشر من ذٰلك مثوبة عند الله)[1]

اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ اور آسمانی کتاب پر ایمان لانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ یہ جو زیرِ نظر آیت میں اس کا موازنہ اہل کتاب کے اعمال و افکار سے کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "ان میں سے بدتر کون ہے" درحقیقت ایک کنایہ ہے۔ جیسے اگر کوئی ناپاک شخص کسی پاکیزہ انسان پر تنقید کرے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ پاکدامن بدتر ہیں یا گناہ سے آلودہ لوگ۔

اس کے بعد اس مطلب کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو اپنے اعمال کی وجہ سے پروردگار کی آفت اور غضب کا شکار ہوئے ہیں انہیں بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہے اور وہ کہ جنہوں نے طاغوت اور بُت کی پرستش کی ہے یقیناً ایسے لوگوں کی دنیا میں حیثیت و مقام اور آخرت میں ٹھکانا بدتر ہو گا اور وہ راہِ راست اور جادۂ مستقیم سے بہت گمراہ ہیں (من لعنه الله وغضب عليه وجعل منهم القردة والخنازير وعبد الطاغوت اولٰئك شر مكانا واضل عن سواء السبيل)[2]

---

[1] "مثوبۃ" اور "ثواب" دراصل پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے اور پلٹنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ ہر طرح کی جزا اور سرزنش کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن زیادہ تر اچھی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے بعض اوقات سزا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ انجام یا جزا و سزا کے معنی میں ہے۔

[2] "سواء" لغت میں مساوات، اعتدال اور برابری کے معنی میں ہے اور یہ جو آیت بالا میں جادۂ مستقیم کو سواء السبیل کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر طرف سے برابر، مساوی اور ہموار ہے۔ اور ہر معتدل، منظم اور انحراف سے خالی روش اور طریقے کو سیدھا راستہ کہا جاتا ہے۔ ضمناً توجہ رہے کہ "عبد الطاغوت" کا عطف "من لعنه الله" ہے اور "عَبَدَ" فعل ماضی ہے اور عبد کی جمع نہیں ہے جیسا کہ بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے۔ اور اہل کتاب کی طرف طاغوت کی پرستش کی نسبت یہودیوں کی گوسالہ پرستی کی طرف اشارہ ہے یا منحرف اور کجرو پیشواؤں کے سامنے بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کرنے کی طرف اشارہ ہے۔



مسخ اور بعض انسانوں کے چہروں کے متغیر ہونے کے بارے میں اور یہ کہ مسخ سے مراد جسمانی چہرے کا تغیر ہے یا فکری و اخلاقی چہرے کی تبدیلی، اس سلسلے میں انشاء اللہ سورۂ اعراف آیہ ۱۶۳ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۶۱۔ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝

۶۲۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

۶۳۔ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۱۔ اور وہ جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (لیکن) وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور کفر کے ساتھ ہی نکل جاتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپائے ہوئے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے۔

۶۲۔ تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ، تجاوز اور مالِ حرام کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں جو کام وہ انجام دیتے ہیں کس قدر بُرا ہے۔

۶۳۔ عیسائی اور یہودی علماء انھیں گناہ آمیز باتوں اور مالِ حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے، کس قدر بُرا ہے وہ عمل جو وہ انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

پہلی آیت میں اہلِ کتاب منافقین کے بارے میں بحث مکمل کرتے ہوئے اور ان کے چہروں سے نفاق کے پردے ہٹاتے ہوئے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ: جس وقت وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن کفر سے معمور دل کے ساتھ آتے ہیں اور اسی حالت میں تمھارے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور منطقی استدلال اور تمھاری باتیں ان کے دل پر کچھ اثر نہیں کرتیں (و اذا جاءوکم قالوا اٰمنا وقد دخلوا بالکفر وھم قد خرجوا بہ)۔



لہٰذا وہ جو ظاہراً حمایتِ حق میں باتیں کرتے ہیں، اظہارِ ایمان کرتے ہیں اور تمھاری باتوں کی ریاکارانہ پذیرائی کرتے ہیں، اس سے تمھیں دھوکا نہ ہو۔

آیت کے آخر میں انھیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ ان تمام پردہ پوشیوں کے باوجود جو کچھ تم چھپاتے ہو خدا اس سے آگاہ اور باخبر ہے (و اللہ اعلم بما کانوا یکتمون)۔

بعد والی آیت میں ان کے نفاق کی کچھ اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ گناہ، ظلم اور حرام خوری کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں (و تری کثیراً منھم یسارعون فی الاثم والعدوان و اکلھم السحت)۔[1]

یعنی گناہ اور ظلم کے راستے میں یوں قدم بڑھاتے ہیں گویا باعثِ فخر اہداف کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بغیر کسی شرم کے کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

توجہ رہے کہ لفظ "اثم" کفر کے معنی میں بھی آیا ہے اور ہر قسم کے گناہ کے مفہوم میں بھی آیا ہے۔ لیکن یہاں "عدوان" کے مقابلے میں آیا ہے۔ لہٰذا بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے: ایسے گناہ جن کا نقصان صرف کرنے والے ہی کو پہنچے بخلاف "عدوان" کے جس کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے۔

یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ "عدوان" کا ذکر "اثم" کے بعد اصطلاح کے مطابق خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور ان کے بعد حرام کھانے کا تذکرہ "ذکر اخص" کے طور پر ہے۔ اس طرح پہلے تو ان کی ہر قسم کے گناہ کی بنا پر مذمت کی گئی ہے اس کے بعد اہمیت کی وجہ سے دو عظیم گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے یعنی ایک ظلم و ستم اور دوسرا حرام خوری چاہے وہ رشوت کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔

مختصر یہ کہ قرآن اہلِ کتاب کے ان منافق افراد کو آشکار کرتا ہے اور ان کی مذمت کرتا ہے جو بڑی لاپرواہی سے ہر طرح کا گناہ سرانجام دیتے ہیں، خصوصاً ظلم و ستم کرتے ہیں اور بالخصوص ناجائز مال کھاتے ہیں مثلاً رشوت اور سود کھاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان کے اعمال کی برائی تاکیداً ظاہر کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: یہ لوگ کیسا برا اور قبیح عمل انجام دیتے ہیں (لبئس ما کانوا یعملون)۔ "کانوا یعملون" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کو وہ اتفاقیہ نہیں بجالاتے بلکہ وہ ان پر ڈٹے رہتے ہیں اور بار بار ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔

تیسری آیت میں ان کے علماء پر حملہ کیا گیا ہے جو اپنی خاموشی کے ذریعے انھیں گناہ کا شوق دلاتے تھے، ارشاد ہوتا ہے: عیسائی اور یہودی علماء انھیں گناہ آلودہ باتوں اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے (لو لا ینھٰھم الربٰنیون و الاحبار عن قولھم الاثم و اکلھم السحت)۔

---

[1] "سحت" کے معنی کے بارے میں اس سورہ کی آیہ ۴۲ کے ذیل میں "یسارعون" کے بارے میں اسی سورہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں اور "اثم" کے متعلق سورہ بقرہ آیہ ۲۱۹ کے ذیل میں جلد دوم میں بحث کی جا چکی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے "ربانیون" "ربانی" کی جمع ہے اور یہ لفظ "رب" سے لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے علماء جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن زیادہ تر یہ لفظ عیسائی مذہبی علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے "احبار" "حبر" (بروزن "ابر") کی جمع ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے علماء جو معاشرے پر اچھا اثر مرتب کریں، لیکن زیادہ تر یہ لفظ یہودی مذہبی علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ضمناً سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ آیت میں لفظ "عدوان" تھا لیکن اس آیت میں نہیں ہے۔ بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ "اثم" اسی وسیع مفہوم ہے جس میں "عدوان" بھی داخل ہے۔

اس آیت میں گذشتہ آیت کے برخلاف "قولھم الاثم" آیا ہے۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو گناہ آلود باتوں سے بھی روکیں اور اعمال گناہ سے بھی۔ یا پھر قول یہاں اعتقاد کے معنی میں ہے یعنی علماء ایک فاسد معاشرے کی اصلاح کے لیے پہلے ان کے غلط افکار اور عقائد کی اصلاح کریں کیونکہ جب تک افکار و نظریات میں انقلاب نہیں آتا یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ان کے عمل میں کوئی گہری اصلاح ہو سکے۔ اس طرح سے آیت فاسد اور بُرے معاشرے کی اصلاح کے لیے علماء کو نشاندہی کرتی ہے کہ کام فکری انقلاب سے شروع کیا جائے۔

جیسے اصلی گناہ گاروں کی مذمت کی گئی ہے آیت کے آخر میں خاموش رہنے والے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک کر دینے والے علماء کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کتنا بُرا ہے وہ کام جو یہ انجام دیتے ہیں (لبئس ما کانوا یصنعون)
اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے خاص طور پر علماء اور دانشمندان کا انجام بھی اصلی گناہ گاروں کا سا ہوگا۔ درحقیقت یہ لوگ ان کے جرم میں شریک شمار ہوں گے۔

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں:

> اپنی ذمہ داریوں کی پیمان نہ کرنے والے اور خاموش رہنے والے علماء کی مذمت میں یہ سخت ترین آیت ہے۔

واضح ہے کہ یہ حکم خاموش رہنے والے یہودی اور عیسائی علماء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام صاحبانِ فکر و نظر، راہبروں اور علماء کے بارے میں ہے جو لوگوں کو گناہ سے آلودہ ہوتا دیکھیں اور انھیں ظلم و ستم کی راہ پر تیز گام پائیں اور خاموش بیٹھے رہیں، کیونکہ خدا کا حکم تو سب کے لیے برابر ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

> گذشتہ قومیں اس بنا پر ہلاک اور نابود ہو گئیں کہ وہ گناہ کی مرتکب ہوتی تھیں اور ان کے علماء سکوت اختیار کر لیتے تھے اور نہی عن المنکر نہیں کرتے تھے۔ اس حالت میں ان پر خدا کا عذاب، سزائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی تھیں۔ پس اے لوگو! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو تا کہ تمہارا بھی وہی انجام نہ ہو[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۹



یہی مضمون نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ (خطبہ ۱۹۲) میں بھی ہے، آپؑ نے فرمایا:

"فان الله سبحانه لم یلعن القرآن الماضی بین ایدیکم الا لترکهم الامر بالمعروف و النهی عن المنکر فلعن السفهاء لرکوب المعاصی والحکماء لترک التناهی"

گذشتہ زمانے کے لوگوں کو خدا تعالیٰ نے صرف اس لیے اپنی رحمت سے دور کر دیا کہ انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا۔ اس نے عوام کو گناہ کے ارتکاب اور علماء کو نہی عن المنکر ترک کرنے پر اپنی لعنت کا حق دار قرار دیا اور انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گذشتہ آیت میں عام لوگوں کے بارے میں لفظ "یعملون" آیا ہے اور زیرِ نظر آیت میں علماء کے لیے "یصنعون" استعمال ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "یصنعون" "صنع" کے مادہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے، ایسے کام جو بڑی توجہ اور مہارت سے انجام دیئے جائیں جبکہ "یعملون" "عمل" کے مادہ سے ہے اور ہر کام کے لیے بولا جاتا ہے اگر نادان لوگ اور عوام بُرے کام انجام دیتے ہیں تو ان میں سے کچھ نادانی اور بے خبری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں لیکن علماء اور دانشور جو اپنی ذمہ داری پر عمل نہیں کرتے تو واضح ہے کہ وہ جانتے ہوئے اور ماہرانہ طور پر غلط کام انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے عالم کے لیے جاہل سے زیادہ سخت سزا ہے۔

۶۴۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا اُنزِلَ اِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا اَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝

ترجمہ

۶۴۔ اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ انھی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کی وجہ سے رحمتِ الٰہی سے دور ہیں جبکہ اس (کی قدرت) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح سے چاہے (بخشتا اور



خرچ کرتا ہے اور یہ آیات جو تجھ پر تیرے پروردگار کی نازل ہوئی ہیں ان میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو بڑھا دیتی ہیں اور ان کے درمیان ہم نے قیامت تک کے لیے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے اور جب بھی انھوں نے جنگ کی آگ روشن کی خدا نے اسے خاموش کر دیا اور وہ زمین میں فساد کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

اس آیت میں یہودیوں کی ناروا اور گناہ آلود باتوں کی ایک مثال پیش کی گئی ہے جبکہ گذشتہ آیت میں کلی طور پر ان کی ایسی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ یہودی ایک زمانے میں اوجِ قدرت میں تھے۔ اس وقت کی اہم آباد دنیا کے ایک حصے پر ان کی حکومت تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان بن داؤدؑ کے زمانے کو بطورِ نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں بھی زور و شور سے ان کی قدرت و طاقت موجود رہی لیکن ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی خصوصاً حجاز میں ان کی قدرت کا آفتاب ڈوب گیا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور خیبر کے یہودیوں سے پیغمبر اکرمؐ کی جنگوں کے باعث وہ انتہائی کمزور ہو گئے۔ اس موقع پر ان میں سے بعض نے اپنی گذشتہ قدرت و عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے استہزاء اور مذاق کے طور پر کہا کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور وہ ہم پر بخشش و نوازش نہیں کرتا (بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات کہنے والا فنحاس بن عاذورا تھا جو بنی قینقاع کا سردار تھا اور بعض نے نباش بن قیس کا نام لکھا ہے) چونکہ دوسرے بھی اس کی گفتگو سے راضی تھے لہٰذا قرآن نے اس بات کی ان سب کی طرف نسبت دی ہے اور فرمایا ہے یہودیوں نے کہا کہ خدا کا ہاتھ زنجیر سے بندھا ہوا ہے (وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ)۔

توجہ رہے کہ "ید" عربی میں کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی "ہاتھ" ہے۔ دوسرا "نعمت"، تیسرا "قدرت" چوتھا "سلطنت و حکومت" اور پانچواں "تسلّط" ہے۔ البتہ اس کا حقیقی معنی "ہاتھ" ہی ہے اور چونکہ انسان اہم ترین کام ہاتھ سے انجام دیتا ہے لہٰذا یہ لفظ کنایہ کے طور پر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فارسی میں "دست" بھی اسی طرح مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

طریق اہلِ بیتؑ سے مروی بعض روایات میں ہے کہ یہ بات یہودیوں کے مسئلہ قضا و قدر اور سرنوشت و تفویض کے بارے میں عقیدے کی طرف اشارہ ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ابتدائے خلق میں خدا نے تمام امور کا تعین کر دیا ہے اور جسے انجام پانا چاہیے وہ گویا انجام پا چکا ہے اور خدا خود بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا[1] البتہ آیت کے ذیل میں "بل یداہ مبسوطتان" بھی ہے جیسا کہ آگے آئے گا، یہ عبارت پہلے معنی کی تائید کرتی ہے، البتہ دوسرا معنی بھی پہلے معنی کی طرف ہی

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۶۴۹، تفسیر برہان جلد ۱ ص ۴۸۶



ایک راستہ ہے کیونکہ جب ان کی زندگی درہم برہم ہوگئی اور ان کے اقبال کا ستارہ ڈوب گیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی تقدیر میں تھا جسے بدلا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ انجام تو شروع سے معین ہو چکا ہے اور عملی طور پر خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ ان کے جواب میں پہلے تو اس عقیدے کی مذمت کرتا ہے، فرمایا گیا ہے: ان کے ہاتھ زنجیر سے بندھے ہوں اور اس ناروا بات کی وجہ سے وہ رحمت سے دُور ہوں (غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا)

اس کے بعد اس غلط عقیدے کے بطلان کے لیے ارشاد ہوتا ہے: خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اور جس پر چاہتا ہے لُطف و عنایت کرتا ہے (بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء) اس کام میں کوئی مجبوری ہے نہ وہ عواملِ طبعی و فطری کے جبر کا محکوم ہے اور نہ وہ جبرِ تاریخی کا پابند ہے بلکہ اس کا ارادہ ہر چیز سے بالاتر اور ہر چیز میں نافذ ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہودیوں نے لفظ "ید" مفرد استعمال کیا ہے لیکن خدا نے "ید" کو تثنیہ کے طور پر استعمال کیا ہے، فرماتا ہے: اس کے دونوں ہاتھ کُھلے ہوئے ہیں۔ یہ دراصل تاکید مطلب بھی ہے اور خدا تعالیٰ کے انتہائی جود و بخشش کے لیے لطیف کنایہ بھی کیونکہ جو ذات زیادہ سخی ہو دونوں ہاتھ سے بخشش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں دو ہاتھوں کا ذکر قدرتِ کاملہ کے لیے بھی کنایہ ہو سکتا ہے اور شاید یہ مادی و معنوی یا دنیوی و اُخروی نعمتوں کی طرف بھی اشارہ ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: یہاں تک کہ ان کی گفتار اور عقائد سے پردہ کشائی کرنے والی یہ آیات اُن پر مثبت اثر مرتب کرنے کی بجائے اور انہیں غلط راستے سے باز رکھنے کی بجائے ان میں سے بہت سوں کو ہٹ دھرمی کے چکر میں ڈال دیتی ہیں اور ان کا طغیان و کفر مزید بڑھ جاتا ہے (ولیزیدن کثیرًا منھم ما انزل الیک من ربک طغیانًا وکفرًا)۔

لیکن ان کی ان ناروا باتوں، عقائد اور طغیان و کفر میں ہٹ دھرمی کے بدلے خدا نے اس جہان میں ان کے لیے سخت سزا مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے (والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الٰی یوم القیٰمۃ)۔

"عداوت" اور "بغضاء" سے یہاں کیا مُراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن اگر ہم یہودیوں کی موجودہ استثنائی اور ناپائیدار صورتِ حال سے قطع نظر کر لیں اور تاریخ میں ان کی دربدر اور پراگندگی کی زندگی کو ملحوظِ نظر رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس خاص تاریخی کیفیت کا ایک اہم عامل ان میں اتحاد، عزم اور ارادے کی پختگی کا فقدان تھا کیونکہ اگر ان میں اتحاد اور عزم صمیم ہوتا تو اتنی طویل تاریخ میں وہ اس طرح سے دربدر، منتشر اور بدبخت نہ رہتے۔

اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں اہلِ کتاب کے درمیان دائمی عداوت و دشمنی کے مسئلہ پر ہم نے مزید وضاحت کی ہے۔

آیت کے آخر میں آتشِ جنگ بھڑکانے کے لیے یہودیوں کی کوششوں اور خدا کی طرف سے مسلمانوں کو اس نابود کرنے والی آگ سے رہائی اور لطف و کرم کے بارے میں اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب انھوں نے آتشِ جنگ بھڑکائی تو خدا نے اسے خاموش کر دیا اور تمہیں اس سے محفوظ رکھا (کلما اوقدوا نارًا للحرب اطفأھا اللہ) یہ حقیقت ہیں



پیغمبر اسلام کی پُر اعجاز زندگی کا ایک نکتہ ہے۔ کیونکہ یہودی حجاز کے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ طاقتور اور جنگی امور سے زیادہ آشنا تھے۔ ان کے پاس نہایت محکم قلعے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس مالی وسائل بھی بہت تھے جن سے وہ جنگوں میں کام لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش ان کی مدد حاصل کرنے میں کوشش کرتے تھے۔ اوس و خزرج میں سے ہر قبیلہ ان سے پیمان دوستی اور جنگی معاہدے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے باوجود ان کی طاقت کا زعم اس طرح ٹوٹا کہ کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودی خاص حالات کی وجہ سے جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خیبر کے قلعوں میں رہنے والے اور فدک کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہاں تک کہ حجاز کے بیابانوں میں رہنے والے یہودیوں نے بھی عظمتِ اسلام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مشرکین کی مدد نہ کر سکے بلکہ خود بھی مقابلے سے کنارہ کش ہو گئے۔ قرآن مزید کہتا ہے: وہ ہمیشہ روئے زمین میں فتنہ فساد کے بیج بونے کی کوشش کرتے ہیں (و یسعون فی الارض فسادًا) جبکہ خدا فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (و اللہ لا یحب المفسدین)۔

اس بنا پر قرآن ان پر کبھی نسلی اور خاندانی حوالے سے کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ قرآن کی تنقید اور سرزنش کا معیار اور نمونہ وہ اعمال ہیں جو ہر شخص اور گروہ انجام دیتا ہے۔ بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن نے ان کے لیے راہ حق کی طرف لوٹ آنے کی راہ کھلی رکھی ہے۔

۶۵۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○

۶۶۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۶۵۔ اور اگر اہلِ کتاب ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا تو ہم ان کے گناہ بخش دیں گے اور انھیں نعمات سے معمور باغاتِ بہشت میں داخل کر دیں گے۔

۶۶۔ اور اگر وہ تورات، انجیل اور جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے (قرآن کی صورت میں) نازل ہوا ہے اسے قائم رکھیں تو آسمان اور زمین سے رزق کھائیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر بُرے اعمال انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں اہلِ کتاب کے طور طریقوں اور طرزِ عمل پر تنقید کی گئی ہے۔ اب ان دو آیات میں تربیتی اصول کے مطابق خدا تعالیٰ اہلِ کتاب میں سے منحرفین کو راہِ راست پر لانے، انھیں حقیقی راستے کی نشاندہی کرنے اور ان میں سے اقلیت جو ان کے غلط افعال میں ہم قدم نہتی کی تعریف کرنے کے لیے کہتا ہے: اگر اہلِ کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان کے گذشتہ گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے اور ان سے صرفِ نظر کرلیں گے (ولو ان اھل الکتاب اٰمنوا وتقوا لکفرنا عنھم سیئاتھم) نہ صرف ان کے گناہ بخش دیں گے بلکہ انھیں طرح طرح کی نعمتوں سے پُر باغاتِ جنت میں داخل کردیں گے (ولادخلناھم جنات النعیم) یہ تو معنوی اور اخروی نعمتوں کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد ایمان و تقویٰ کے گہرے اثر جو مادی زندگی میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھیں اور زندگی کے دستورِ عمل کے طور پر انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں اور جو کچھ پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اس سب پر عمل کریں چاہے وہ گذشتہ آسمانی کتب ہوں یا قرآن اور ان میں تفریق و تعصب کو راہ نہ دیں تو آسمان و زمین کی نعمتیں انھیں گھیر لیں گی (ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم)۔

اس میں شک نہیں کہ تورات اور انجیل کو قائم اور برپا رکھنے سے مراد ان کا وہ حقیقی حصہ ہے جو اس زمانے میں ان کے پاس موجود تھا نہ کہ ان کے تحریف شدہ حصے جو کم و بیش قرائن سے پہچانے جاتے تھے اور " ما انزل الیھم من ربھم " سے مراد تمام آسمانی کتب اور خدائی احکام ہیں کیونکہ یہ جملہ مطلق ہے اور درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ قومی تعصبات کو دینی اور الٰہی مسائل کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ یہاں عربوں اور یہودیوں کی آسمانی کتب کی بات نہیں ہے۔ اصل بات تو خدائی احکام کی ہے۔ یہ کہہ کر قرآن چاہتا ہے کہ جس قدر ہو سکے ان کے تعصب کو کم کیا جائے اور ان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں بات اثر کر سکے۔ اسی لیے تمام ضمیریں انھیں کی طرف لوٹتی ہیں (الیھم، من ربھم، من فوقھم، من تحت ارجلھم) یہ سب کچھ اس بنا پر ہے تاکہ وہ ہٹ دھرمی کی سواری سے اتر پڑیں اور یہ تصور نہ کریں کہ قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا مطلب ہے کہ یہودیوں نے عربوں کے سامنے سر جھکا دیا بلکہ اس کا مطلب تو خدائے عظیم کے سامنے سر جھکانا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تورات و انجیل کے احکام کو قائم کرنے سے مراد ان کے اصول پر عمل کرنا ہے کیونکہ جیسے ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ تعلیماتِ انبیاء کے اصول تمام جگہ ایک جیسے ہیں اور ان کے درمیان صرف کامل و اکمل کا فرق ہے اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ گذشتہ دین کے بعض احکام بعد والے دین کے بعض احکام کے ذریعے منسوخ ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات کی پیروی صرف بعد از موت کی زندگی کے اسباب مہیا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کی تمام مادی زندگی کے لیے بھی مفید ہے۔ یہ پیروی جماعتوں اور گروہوں کی صفوں کو منظم کرتی ہے۔ توانائیوں کو مجتمع کرتی ہے۔ نعمتوں کو بابرکت کرتی ہے، وسائل کو وسعت دیتی ہے، زندگی کو



خوش حال بناتی ہے اور امن و امان پیدا کرتی ہے۔

ان عظیم مادی وسائل اور فراواں انسانی توانائیوں پر ایک نظر ڈالی جائے کہ جو آج کی دنیائے انسانیت میں تعلیماتِ انبیاء سے انحراف کی وجہ سے بیدا ہوئی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ سب تباہ کن ہتھیاروں، بے سبب کشمکشوں اور ویران کن مساعی پر صرف ہو رہی ہیں۔ آج دنیا کی جتنی دولت اور وسائل دنیا کی تباہی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں وہ اصلاح و فلاح کے لیے استعمال ہونے والے وسائل سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ آج کس قدر دماغی صلاحیتیں جو جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور استعماری و سامراجی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، جو وسائل و ذرائع، صلاحیتیں اور توانائیاں فضول اور بے کار صرف ہو رہی ہیں ان کی نوعِ انسانی کس قدر ضرورت مند اور محتاج ہے۔ یہ سب نہ ہوتا تو دنیا آج خوب صورت، زیبا اور رہنے کے قابل ہوتی۔

ضمنی طور پر توجہ ہے کہ "من فوقهم" اور "من تحت ارجلهم" سے مراد یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تمام نعمتیں انھیں گھیر لیں گی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس بات کے لیے کنایہ ہو کہ یہ نعمات عمومیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ عربی اور غیر عربی ادب میں کہا جاتا ہے کہ "فلاں شخص سرتاپا نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے" یعنی ہر طرف سے نعمتیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔

یہ آیت یہودیوں کی اس گفتگو کا جواب بھی ہے جو گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ خدا کی نعمتیں تم سے منقطع ہو چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ذاتِ مقدس خدا میں بخل آگیا ہے۔ اور اس کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، بلکہ یہ تو تمھارے اعمال ہی ہیں جو تمھاری مادی اور معنوی زندگی میں منعکس ہو گئے ہیں اور تمھارے اعمال ہی نے تمھاری ہر طرح کی زندگی کو تاریک کر دیا ہے اور جب تک تم نہیں پلٹو گے یہ تاریکیاں بھی نہیں پلٹیں گی۔

آیت کے آخر میں ان میں سے ایک نیک اقلیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے، اگرچہ ان میں سے زیادہ تر تو بدکار ہی ہیں لیکن پھر بھی کچھ میانہ رو اور معتدل افراد ان میں موجود ہیں (جن کا معاملہ خدا کے نزدیک اور مخلوق خدا کے نزدیک دوسروں سے مختلف ہے) (منهم امة مقتصدة وكثير منهم ساء ما يعملون)۔

اہلِ کتاب میں سے نیک اور صالح اقلیت کے بارے میں سورۂ اعراف آیہ ۱۵۹ اور ۱۸۱ اور سورہ آلِ عمران آیہ ۷۵، میں بھی ایسی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔

تفسیر نمونہ جلد چہارم اختتام کو پہنچی



اشاریہ

اصول وعقائد

احکام



زکوٰۃ

حج

جہاد

قتل اشتباہ کے احکام

حرام گوشت جانور و دیگر محرمات





شخصیات





علماء و دانشور



کتب آسمانی

کتب تاریخ و تفسیر و سیر

لغاتِ قرآن







متفرق موضوعات

اچھے اور بُرے کام

اذان

افواہیں

اکمال دین

انسانی رشتے

بُری مجلس







مقامات

ختم شد